احمد فراز

شہرِ سخن آراستہ ہے

کلیات

شہرِ سخن آراستہ ہے

(کلیات)

(''اے عشق جنوں پیشہ'' بھی شامل ہے)

احمد فراز

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-452-2

کتاب	:	شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)
شاعر	:	احمد فراز
موسمِ اشاعت	:	2013
سرورق	:	حنیف رامے
مطبع	:	ورڈ میٹ
قیمت	:	1950.00 روپے

دوست پبلی کیشنز
پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، اسلام آباد
فون: 051-4102784-85
E-mail: dostpub@nayatel.pk

تمام محبت کرنے والوں

کے نام

ترتیب

حرفِ محبت

''شہرِ سخن آراستہ ہے'' حاضر ہے اس سے پہلے ''اثاثہ'' اور ''کلیات احمد فراز'' کے ناموں سے کچھ مجموعے یکجا شائع ہو چکے تھے اور اب دونوں کی نایابی کا یہ عالم ہے کہ ان کی کوئی جلد میرے پاس بھی نہیں۔

مجھے اپنے بارے میں یا اپنی شاعری کے بارے میں نہ کوئی زعم نہ دعویٰ ہے۔ ایک بات ضرور ہے میرے پڑھنے والوں نے مجھے ہمیشہ محبت دی اور میرے پبلشروں نے مجھ میں اور شائقینِ شعر کے درمیان ایک مضبوط پُل کو استوار رکھا۔

''شہرِ سخن آراستہ ہے'' میری ان تمام کتابوں کا مجموعہ ہے جو آج تک شائع ہو چکی ہیں۔ اب جب میں موجودہ کلیات کی ضخامت دیکھتا ہوں جو کہ سولہ سو چونسٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے تو مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیسے لکھ لیا۔ اچھی بری کی بحث تو الگ ہے۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ تخلیقات وقت کے موسموں کے اثرات سے کچھ مرجھا گئی ہوں مگر مجموعی طور پر کئی مضامینِ دل و دنیا اب بھی تازہ تر لگتے ہیں۔

''اثاثہ'' پہلا کلیات تھا جس میں میری اس وقت کی آٹھ کتابیں یکجا کر دی گئیں تھیں۔ اس کے بعد ''کلیاتِ احمد فراز'' کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا اس میں نو کتابیں شامل تھیں۔ اس کلیات کو بھی شائع اور پھر نایاب ہوئے پانچ چھ برس ہو گئے۔ اس دوران ''خواب گل پریشاں ہے'' اور ''غزل بہانہ کروں'' شائع ہو گئیں جو موجودہ کلیات میں آ گئی ہیں۔ اس اعتبار سے ''شہرِ سخن آراستہ ہے'' نہ

صرف آج تک کی شائع شدہ تیرہ کتابوں کا ''اکٹھ'' ہے بلکہ پچھلے کلیات میں جو کتابت کی غلطیاں یا فروگذاشتیں تھیں وہ بھی دور کر دی گئی ہیں۔ اس کا کریڈٹ جناب ضامن علی جعفری کو جاتا ہے جنہوں نے کمال محنت، دلچسپی اور شعر آگاہی سے ایک ایک سطر اور مصرعہ کو نہایت توجہ اور محبت سے پڑھا اور کتاب کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

میں یہ تو پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ میری نئی کتاب کب تک شائع ہوگی مگر یہ ضرور ہے کہ اب تک کی آخری کتاب ''غزل بہانہ کروں'' کے بعد جو کچھ میں نے لکھا ہے اتنا نہیں کہ فوری طور پر پریس میں دے دوں۔ اس کے لیے میرے قارئین کو شائد کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے۔

آخر میں مجھے جن چند کرم فرماؤں کی معاونت کا ذکر کرنا ہے ان میں سرِفہرست محترم حنیف رامے صاحب ہیں جنہوں نے باوجود بے حد مصروفیت کے میری درخواست پر ''شہرِ سخن آراستہ ہے'' کا سرورق بنایا اور حسبِ روایت بے حد خوبصورت بنایا۔ اس سے پہلے وہ میری پہلی کتاب ''تنہا تنہا'' کا سرورق بھی بنا چکے ہیں جو مَیں نے ہی نہیں سبھی نے سراہا، چنانچہ میں سراپا سپاس ہوں۔

اسی طرح میرے پبلشر جناب آصف محمود جو دوست پبلی کیشنز کے منتظم ہیں میرے دل میں ان کے لیے بے حد احترام ہے کہ انہوں نے انتہائی محبت اور دیانت سے ہمارے اِن تعلقات کو نبھایا اور مجھے کبھی بھی شکوہ شکایت کا موقع نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ ہماری یگانگت برسوں سے قائم ہے اور وہ میرے کلی اعتماد کے حقدار ہیں۔

آخر میں یہی عرض کروں گا کہ میں صرف شعر کہنے کا گنہگار ہوں باقی تمام جنجال میرے دوستوں نے نبیڑے ہیں۔

احمد فراز

تنہا تنہا

ضیاالدین ضیاؔ

کے نام

ہاں، مگر کوئی تمنا پسِ دامانِ وفا
مجھ سے پوشیدہ مرے پیشِ نظر ہوتی ہے
(ضیاؔ)

جب روح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے
احساس کی لَو اور بھڑک جاتی ہے
میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

ترتیب

شاعر

جس آگ سے جل اُٹھا ہے جی آج اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہوئی تھی
جس کرب کی شدّت سے مری روح ہے بے کل
پہلے بھی مرے ذہن سے دوچار ہُوئی تھی
جس سوچ سے مَیں آج لہو تھوک رہا ہوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہُوئی تھی

وہ غم، غمِ دنیا جسے کہتا ہے زمانہ
وہ غم، مجھے جس غم سے سروکار نہیں تھا
وہ درد کہ ہر دور کے انسان نے جھیلا
وہ درد مرے عشق کا معیار نہیں تھا
وہ زخم کہ ہر سینے کا ناسور بنا تھا
وہ زخم مجھے باعثِ آزار نہیں تھا

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غمِ ذات میں گم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن مرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
مَیں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور
جام و مے و مینا و خرابات میں گم تھا

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی
شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوقِ سخن تھا
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
اور اِس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی

چھیڑے کبھی میں نے لب و رخسار کے قصّے
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نِکھارا
گاہے کسی شہزادے کے افسانے سُنائے
گاہے کیا دنیائے پرستاں کا نظارا
میں کھویا رہا جنّ و ملائک کے جہاں میں
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پُکارا

برسوں یُونہی دلِ جمعیٔ اورنگ کی خاطر
سَو پھول کِھلائے کبھی سَو زخم خریدے
مَیں لکھتا رہا ہجو بغاوت منشوں کی
میں پڑھتا رہا قصر نشینوں کے قصیدے
اُبھرا بھی اگر دل میں کوئی جذبۂ سرکش
اِس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

لیکن یہ طلسمات بھی تادیر نہ رہ پائے
آخر مے و مینا و دف و چنگ بھی ٹوٹے
یوں دست و گریباں ہوئے انسان و خداوند
نخچیر تو تڑپے قفسِ رنگ بھی ٹوٹے
اِس کشمکشِ ذرّہ و انجم کی فضا میں
کشکول تو کیا افسر و اورنگ بھی ٹوٹے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر
قاتل کو پُکارا کبھی مقتل میں صدا دی
گاہے رسن و دار کے آغوش میں جھولے
گاہے حرم و دَیر کی بنیاد ہلا دی
جس آگ سے بھرپور تھا ماحول کا سینہ
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلا دی

اور آج شکستہ ہُوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہُنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

رباعی

لفظوں میں فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
تو زہر ہی دے شراب کہہ کر ساقی
جینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ

○
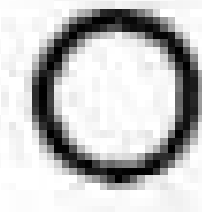
تیری باتیں ہی سُنانے آئے
دوست بھی دل ہی دُکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چُپ سی لگی ہے جیسے
ہم تجھے حال سُنانے آئے

عشق تنہا ہے سرِ منزلِ غم
کون یہ بوجھ اُٹھانے آئے

اجنبی دوست ہمیں دیکھ کہ ہم
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

دل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام
کاش پھر کوئی بُلانے آئے

اب تو رونے سے بھی دل دُکھتا ہے
شاید اب ہوش ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُجڑی
لوگ کیوں جشن منانے آئے

سو رہو موت کے پہلو میں فرازؔ
نیند کس وقت نہ جانے آئے

○
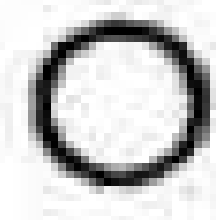
جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم ہُوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشۂ دل میں
ایک دُنیائے بیکراں آباد

چند منظر اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جلا کر نہ رو محبت میں
یہ تو ہوتا ہے خانماں آباد

کتنے تارے فراز ٹوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

کھنڈر

عبث کیوں اُلٹتے پلٹتے ہو جھوٹی روایات کی عظمتوں کے کھنڈر
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں تم نہ پاؤ گے کوئی خزانہ
نہ شداد کی جنتِ گمشدہ کا کوئی لعل وڈر سے جڑا آستانہ
نہ فرعون کا کوئی خفیہ خزینہ
نہ قاروں کا کوئی دفینہ
نہ جمشید کے جام ومینا
نہ نمرود کے باغِ آغوش کی چہچہاتی ہوئی کوئی آہو حسینہ
یہاں کچھ نہ ڈھونڈو
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں خشک وویران خطّوں میں
مدّت سے خانہ برانداز عفریت چاروں طرف خیمہ زن ہیں
یہاں سالہا سال سے قرن ہا قرن سے
وحشت انگیز اوہام سایہ فگن ہیں

یہاں بے شمار اُلوؤں کے بسیرے ہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے ہیں اور
گیدڑوں نے کئی غار کھودے ہوئے ہیں
جو دن کے دھندلکوں میں شب کی سیاہی میں آسیب صورت
کبھی ایک ایک اور کبھی سب کے سب مل کے یوں چیختے ہیں
کہ جیسے بنی نوعِ انساں کی تخریب پر نوحہ گر ہوں
یہاں کوئی تپتی ہوئی دوپہر ہو کہ سرما کی تاریک و مفلوج شب ہو
کبھی کوئی ابرِ خراماں نہ برسا نہ چھایا
یہاں کوئی شعلہ نہ بھڑکا نہ کوئی چراغِ سحر ٹمٹمایا
کہ جیسے ہمیشہ پرافشاں رہا ہو یہاں اجنبیت کا گھمبیر سایہ
کہ اس سرزمیں کی فضا میں خلا میں کبھی بھی کوئی بھی تغیر نہ آیا
مگر یہ کھنڈر
روزِ اوّل سے ہی
پتھروں اور اینٹوں کے انبار ہائے پریشاں نہیں تھے
فقط ادھ کٹے بُت شکستہ ستوں ٹوٹے پھوٹے ظروف
اور جھکے بام و در یونہی سر در گریباں نہیں تھے
یہاں صرف ویرانیوں کے مناظر ہی تاریخِ ماضی کے عنواں نہیں تھے
یہ وہ سرزمیں ہے
کہ جس پر زمرّد کے یاقوت کے تخت جلوہ فگن تھے
یہاں سنگِ سرخ اور مرمر کے بے مثل و نادر محلّات

گلکاریوں سے مرصع تھے معراجِ فن تھے

یہاں بے بہا اور نایاب قالین فرشِ رہِ کاخِ فرمانروائے زمن تھے

یہاں ریشم واطلس و پرنیاں اور دیبا و زربفت وسنجاب وکمخواب

کے بے نظیر اور عریاں ذخیرے شکن در شکن تھے

یہاں لہلہاتے ہوئے گلستاں رشکِ باغِ عدن تھے

یہاں سونے چاندی کے ڈھیروں میں لعل و جواہر میں

تلتی کنیزوں کے گلرنگ چہرے فضا تاب سینے سنہرے بدن تھے

اور ان کی حفاظت کی چوبی صلیبیں تھیں زندانِ آہن تھے دار و رسن تھے

یہاں کاس وقیتار کی گرم تانوں سے جام وسبو کے فسانوں سے

عیش ونشاط ومسرّت کے جشنِ چراغاں منائے گئے ہیں

یہاں خوش گلو اپسراؤں کے ہر تارِ گیسو سے تزئینِ بربط روا تھی

یہاں زندگی صرف زخمِ نوا تھی!!

یہاں باادب باسلیقہ غلاموں نے سجدے کئے اور ثبوتِ وفا کے لئے

گردنیں تک کٹا دیں

مگر رحم دل اور کشادہ دل آقاؤں کی عدل وانصاف سے

جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی

بہ ایں حال بھی مطمئن تھی خدائی

مگر وقت کی پے بہ پے کروٹوں نے کئی گل کھلائے

کبھی تو ہلاکو و چنگیز و تیمور نے بربریت کے پرچم اُٹھائے

کبھی تورماں اور نادر کی جرار فوجوں نے یلغار کی شہر لوٹے جلائے
تباہی کے دف صورِ محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے
بگولوں کے دامن میں امن وسکوں کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے
اور اپنی روایات کے تلخ و تیرہ دھوئیں چھوڑ کر بجھ گئے مٹ گئے ہیں
یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل
غبارِ رواں کی طرح چھا رہی ہیں
دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں
اور ان کی جلو میں نہ لیلا نہ محمل
نہ جذبِ تجسّس کا حاصل
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں ہے
فقط کچھ کھنڈر ابنِ آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

○
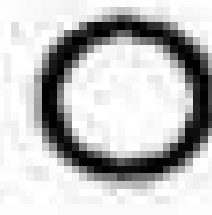
کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اُٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیس کی باتیں پرائے شہروں میں

کچھ اِس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ
تو چند اور چمن مسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہوئے تلخ تجربے پھر بھی
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فرازؔ ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر کر کے جنہیں لوگ لائے شہروں میں

بھول

افق پر دھند لکے، شفق میں الاؤ، گھٹاؤں میں شعلے، چمن میں ببول
بہاروں پہ صرصر کے گھمبیر سائے
نظاروں کے دامن میں نکہت بسائے

دلوں پر اُداسی دماغوں میں الجھن خیالوں میں تلخی نگاہیں ملول
ہر اک سمت ویرانیوں کا نزول

جلاتا رہا میں اندھیروں میں شمعیں کھلاتا رہا خارزاروں میں پھول
شعاعوں سے تاریکیوں کو اُجالے
خرابوں پہ تعمیر کا عکس ڈالے

بڑے زخم کھا کر مگر مسکرا کر کیے زندگی نے حوادث قبول
اڑاتی پھری دشت و صحرا کی دھول

وہی وقت کی سست رفتار گردش وہی موت کی رہگزاروں کا طول
وہی چار سو دہکے الاؤ
وہی گلستاں میں خزاں کا رچاؤ

وہی چاند تاروں پہ کہنہ دھند لکے وہی ظلمتوں کا پرانا اصول
مگر کون سمجھے یہ کس کی تھی بھول؟

رباعی

اک راہ طویل اک کڑی ہے یارو
افتاد عجیب آ پڑی ہے یارو
کس سمت چلیں کدھر نہ جائیں آخر
دوراہے پہ زندگی کھڑی ہے یارو

غنچے کی چٹک سنائی دے گی یارو
ساغر کی کھنک سنائی دے گی یارو
زنداں کا سکوت گونج اُٹھے گا جس سے
ایسی دستک سُنائی دے گی یارو

فرار

کئی ایاغ دل میں آنسوؤں کے بیج بو گئے
شرابِ لالہ گوں کے عکس عکس میں
جہانِ رنگ و بو لیے
فریبِ آرزو دیے
گھنیری آندھیوں کے رقص رقص میں
کئی چراغ ظلمتوں کی وادیوں میں کھو گئے

بچھے رہے سراب گام گام پر
جمالِ ضوفشاں لیے
مآلِ خونچکاں لیے
حیات کے ہر اک نئے مقام پر
ہزاروں داغ مسکرا دیے چراغ ہو گئے

مگر چلے ہوس کی جستجو میں تم
وفا کی روشنی لیے
ہر ایک چاکِ دل سیئے
تصوّرِ حصولِ آرزو میں تم
کئی دماغ موت کی کمیں گھوں میں سو گئے

○
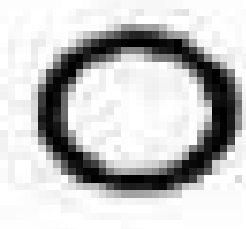
دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمنِ جانِ بہار
زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکانِ بہار

نشۂ احساسِ خوش وقتی نے اندھا کر دیا
برق بھی چمکی تو ہم سمجھے چراغانِ بہار

خون رُلواتے ہیں سب کو اپنے اپنے تجربے
وہ پشیمانِ خزاں ہوں یا پشیمانِ بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذور ہیں
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی فرمانِ بہار

اے خوشا عہدِ خزاں جب نغمہ پیرائی تو تھی
اب تو سُرمہ در گلو ہیں خوشنوایانِ بہار

گر یونہی بادِ صبا اٹھکیلیاں کرتی پھری
شعلۂ گل سے بھڑک اُٹھے گا دامانِ بہار

کب ہوئے دل تنگ ہم زنداں میں رہ کر بھی فرازؔ
ہاں مگر جب آ گئی ہے یادِ یارانِ بہار

احتساب

سوچ مفلوج ہے حالات کے زندانوں میں
عقل پر تلخ حوادث کے گراں تالے ہیں
آ گہی سرد و خموش
منجمد شعلۂ ہوش
ذہن پر بھولے فسانوں کے گھنے جالے ہیں
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے سیہ خانوں میں
قہقہے وقت کے خوشرنگ شبستانوں میں
کتنی دلدوز و غمیں آہوں کے رکھوالے ہیں
آرزو جامِ طرب
آبرو زہر بلب

کتنے ہی ناگ خزانوں نے یہاں پالے ہیں
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں
زندگی رینگتی ہے موت کے ویرانوں میں
انقلابات نے انداز بدل ڈالے ہیں

رات دن شام وسحر
کس کو جرأت ہو مگر

ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں
آگ پھولوں نے بکھیری ہے گلستانوں میں

○

ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے
کہ شہرِ حُسن میں جلووں کی قحط سالی ہے

کہاں ہے دوست کہ آشوبِ دہر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچالی ہے

بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ سناٹا
افق سے پھر کوئی آندھی اُترنے والی ہے

لرز رہے ہیں شگوفے چمن میں کھلتے ہوئے
حنائے دستِ صبا میں لہو کی لالی ہے

پیؤ شراب کہ ناصح نے زہر بھی دے کر
ہماری جراَتِ رندانہ آزما لی ہے

پھر آج دانۂ گندم کے سلسلے میں فرازؔ
کسی خدا نے مری خلد بیچ ڈالی ہے

○

ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے
کیا بادِ مراد چل رہی ہے

ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

یوں دل میں ہے تیری یاد جیسے
ویرانے میں آگ جل رہی ہے

رُخ پھیر لیا ہے جب سے تُو نے
دنیا کی نظر بدل رہی ہے

درپیش ہے آج بھی وہ صورت
جو صورتِ حال کل رہی ہے

اِتنی بھی فرازؔ بددلی کیا
سنبھلو! کہ فضا بدل رہی ہے

آگ

مفلسو! اپنے مقدر سے شکایت نہ کرو
اس سے انسان کے ایمان میں فرق آتا ہے
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہو

کیا کہا؟ ''خانماں برباد ہوئے جاتے ہیں
دمبدم آگ کے بے رحم لپکتے شعلے
اپنے بوسیدہ مکاں راکھ کیے دیتے ہیں
خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی

مرمر و آہن و سیماں کی عماراتِ بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے"

ٹھیک کہتے ہیں مگر خام عقائد والو
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
اور پھر اپنی شکایت سے بھی کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

رباعی

پھولوں کی جبیں جھلس گئی ہے یارو
گلزار میں آگ بس گئی ہے یارو
گزرے ہیں کہاں سے رنگ و بو کے طوفاں
شبنم کو فضا ترس گئی ہے یارو

اُڑتے پنچھی شکار کرنے والو
گلزار میں گیر و دار کرنے والو
کتنی کلیاں مَسل کے رکھ دیں تم نے
تزئینِ گل و بہار کرنے والو

بانو[1] کے نام

ملوکیت کے محل کی گناہگار کنیز
وہ جُرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
ہر ایک جبر کو تُو سہہ گئی بطیبِ دلی

---

[1] وہ کم سن کنیز جسے بیگم جوناگڑھ نے قتل کروایا

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی نے زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اِس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اُونچے محلّات کے بھرم کے لیے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انارکلی
کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
موَرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بفیضِ وقت اگر کوئی راز کُھل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کجکلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

مجسمّہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دورِ المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

تیرے شب رنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو اِنہیں دنیا نے

ریشۂ سنگ سے کھینچی ہوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہیں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ سناٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے سستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
ریگزارانِ حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیش کے لیے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

○

نشۂ گیسوئے شب تاب کہاں
آنکھ کھل جائے تو پھر خواب کہاں

جی جلاتے ہیں سحر کے جھونکے
کھو گیا چشمۂ مہتاب کہاں

شہر سنسان ہے صحرا کی طرح
اب وہ ہنگامۂ احباب کہاں

سطحِ دریا تو ہے ہموار مگر
بستیاں ہو گئیں غرقاب کہاں

تلخیِ سم ہے لبوں کے مس تک
کوئی پی جائے تو زہراب کہاں

عشق اِک کوہِ گراں تھا پہلے
اب محبت کے وہ آداب کہاں

اب کہاں اہلِ وفا ملتے ہیں
پہلے ہم لوگ تھے نایاب کہاں

اب تو دھڑکن سے بھی جی رُکتا ہے
اب یہ دل پارۂ سیماب کہاں

ق

ہم بھی کرتے تھے چراغانِ بہار
لیکن اب آنکھوں میں خوناب کہاں

ہم کو بھی لذّتِ غم تھی پیاری
لیکن اب جی میں تب و تاب کہاں

اب بھی پایاب نہیں موجۂ غم
پھر بھی اندیشۂ سیلاب کہاں

○
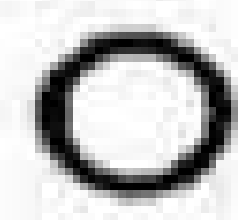
کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہُوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہُوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فرازؔ آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فرازؔ پنکھڑی تھی

مسیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو
تو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دمساز ہیں
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں
تجھ کو میری مسرّت مقدّم سہی
تیرا غم مجھ کو وجہِ طرب تو نہیں

تیرا احسان ہے تُو نے میرے لیے
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُنے
خود کڑی دُھوپ میں رہ کے میرے لیے
تُو نے زلفوں کے شاداب سائے بُنے
میری خاطر زمانے کو پاگل کہا
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تُو مری زندگی ہے مگر جانِ من!
اب وہ عشق و محبت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
ایک غم جس کی شدّت ہمہ گیر ہے
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہہ نِکلا کہساروں سے
دیکھو نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے ہیں جھیلوں پر
تم بھی سُندر سپنوں کی لہروں پر بہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو اور ذرا رہ جاؤ

سُلگا سُلگا موسم ہے شعلوں کی دہکتی حِدّت سے
چڑھتے سورج کے سائے میں ساری دنیا جلتی ہے
دہک دہک اُٹھی ہیں سڑکیں تپتی دھوپ کی شدّت سے
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لُو چلتی ہے
اِس کو بھی اک جبرِ مشیّت سمجھو اور سہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو اور ذرا رہ جاؤ

دیکھو چار طرف ٹھنڈے سائے لہراتے ہیں
تارے نکھرے موتی بکھرے شام کا جادو قائم ہے
خنک خنک پھولوں کے جھونکے خوشبوئیں برساتے ہیں
ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے
کچھ باتیں ہم سے سن لو اور کچھ تم کہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو اور ذرا رہ جاؤ

○
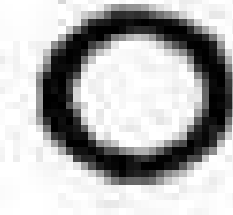
گوارا بھی سہی جو دکھ ترے ہیں
مگر ہم کو کئی غم دوسرے ہیں

عجب اہلِ چمن کے دن پھرے ہیں
بہاروں کے بگولوں میں گھرے ہیں

وطن میں وضعداری نے نہ چھوڑا
پرائے شہر ہم در در پھرے ہیں

سمائے پھر نہ دنیا کی نظر میں
نہ جانے کس بلندی سے گرے ہیں

غنیمت ہے جو ہنس کر بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں

جو دنیا کے ہُوئے وہ سخت روئے
خوشا وہ لوگ جو اب تک ترے ہیں

ابھی سے کیا حدیثِ قعرِ دریا
ابھی تو موجِ ساحل میں گھرے ہیں

فرازؔ آج اتفاقاً مل گئے تھے
یہ صاحب بھی تو دیوانے نرے ہیں

○
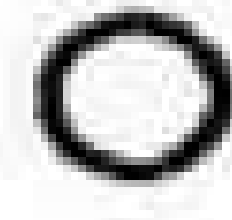
اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دُکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گِلہ کیا، کہ یہ جہاں والے
کبھی کبھی ترا دل بھی دُکھانے لگتے ہیں

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک جھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

فرازؔ ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

○

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اِک دَور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

بے مہریٔ حیات کی شدّت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

اِک خواب ہو گئی ہے رہ و رسمِ دوستی
اِک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہو گی تمہیں فرازؔ
وہ محفلِ طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

رباعی

یہ دَورِ مے و جام چلے یا نہ چلے
نشّے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے
ہم اہلِ خرابات سے یوں بَیر نہ رکھ
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغِ دیر و کعبہ
پھر شمعِ خرابات جلے یا نہ جلے

○

رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے
آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے

اُن کے آ جانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
اُن کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

ہائے پابندیِ آداب تری محفل کی
کہ سرِ راہ گزر رونے کے عادی روئے

ایک تقریبِ تبسّم تھی بہاراں لیکن
پھر بھی آنکھیں ہوئیں تر رونے کے عادی روئے

دردمندوں کو کہیں بھی تو قرار آ نہ سکا
کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے

اے فرازؔ ایسے میں برسات کٹے گی کیوں کر
گر یونہی شام و سحر رونے کے عادی روئے

○

اُن کے وعدوں پہ یقیں، لوگ بھی دیوانے ہیں
اک فقط میں ہی نہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی موردِ الزام مگر
اے مری زہرہ جبیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشِ جام کہاں، گردشِ ایام کہاں
یہ خرابات نشیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمانِ دو عالم ہیں حضور
آپ اور دشمنِ دیں لوگ بھی دیوانے ہیں

اِک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

دردمندانِ محبت تو ہیں بدنام فرازؔ
ورنہ کچھ یہ حسیں لوگ بھی دیوانے ہیں

اَیبٹ آباد

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہرِ سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سرِ رہگزار جُھومتی ہیں
جہاں ستارے اُترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑوں کی قوسیں فلک کو چُومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنار و سرو کی پرچھائیوں میں گھومتی ہیں

ابھی تلک ہیں نظر کے نگار خانے میں
وہ برگِ گل سے تراشے ہوئے بہشت سے جسم
وہ بولتے ہوئے افسانے الف لیلیٰ کے
وہ رنگ و نور کے پیکر وہ زندگی کے طلسم
اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں کہ جن کے لیے
خیال و فکر کی دنیا میں کوئی نام نہ اِسم

ابھی تلک ہیں تصوّر میں وہ در و دیوار
بسیط دامنِ کہسار میں چناروں تلے
جہاں کسی کی جواں زلف بارہا بکھری
جہاں دھڑکتے ہوئے دل محبتوں میں ڈھلے
عجیب تھی وہ جھروکوں کی نیم تاریکی
جہاں نظر سے نظر جب ملی چراغ جلے

میں لوٹ آیا ہوں اُس شہرِ سبزہ و گل سے
مگر حیات اُنہیں ساعتوں پہ مرتی ہے
مجھے یقیں ہے گھنے بادلوں کے سائے میں
وہ زلف اب بھی مری یاد میں بکھرتی ہے
چراغ بُجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
وہ آنکھ اب بھی مرا انتظار کرتی ہے

○
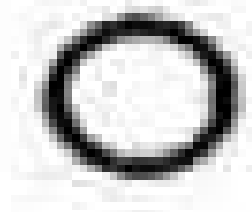
تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سورج بُجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گزریں اِسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقف، فضا بیگانہ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلق شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فرازؔ
دوست دشمن کا نِکل آیا ہے اپنا آشنا

○
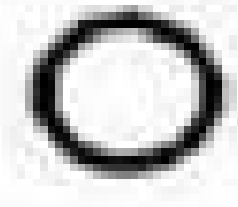
ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے صبا
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موجِ رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ مغاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رَو
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تجھ سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھا پہلے

دولتِ غم تو میسّر تھی فرازؔ
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

طلسمِ ہوشربا

ابھی اک پھول کے دامن سے کوئی بھنورا اُڑا
اور اُڑتے ہی اُجالے میں کہیں ڈوب گیا
ابھی اک شاخ کے سائے سے سرکتا ہوا سانپ
پاس بہتے ہوئے نالے میں کہیں ڈوب گیا

گنگناتے ہوئے نالے کا سنہرا پانی
دیکھتے دیکھتے اک جھیل بنا نہر بنا
یوں اُبھر آئے کناروں پہ دمکتے ایواں
ایک اُجڑے ہوئے خطے میں نیا شہر بنا

یہ فصیلوں میں گھرا راج محل کس کا ہے
یہ پُراسرار در و بام انوکھے فانوس
بربط و چنگ و خم و جام لیے دست بدست
منتظر کس کا ہے یہ زہرہ جبینوں کا جلوس

میں شہنشاہِ زمن ہوں کسے معلوم نہیں
ہر طرف موجبِ تعمیل ہیں فرمان مرے
میرے ادنیٰ سے اشارے پہ ہیں سب رقص کناں
یہ سپاہی، یہ حسینائیں، یہ دربان مرے

کوئی ہے! کون؟ زرینہ نظر افروز کنیز
جیسے مینائے مۓ ناب دھری ہو کوئی
یہ پریشان سی زلفیں یہ برہنہ سینہ
جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی

خادمہ! آج سے اس قصر کی تو ملکہ ہے
آ مجھے اپنی گرہ گیر لٹوں میں گس لے
آ مرے جسم سے اک سانپ کی مانند لپٹ
اور تڑپ کر مرے بیتاب لبوں کو ڈس لے

○

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اُٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزعمِ تمام
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نُور بُجھنے لگا!
فرازؔ اُٹھو اب اُس کی گلی سے جائیں بھی

○
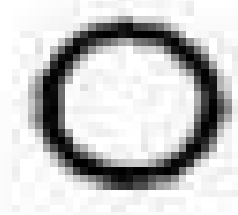
وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
دل جن سے مآلِ کار ٹوٹے

ہو ختم کشاکشِ زمانہ
یا دامِ خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پہ یقین کر رہے ہیں
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے
پر، یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

وہ پچھلا پہر شبِ الم کا
آنسو بھی ستارہ وار ٹوٹے

کیا چھوڑتے یاد دوستوں کی
وہ تیر، جو دل کے پار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فراز دونوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

O
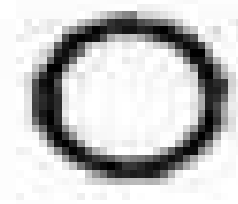
انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چُپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چُپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر
مرغانِ گرفتار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اِس شہر میں ہر جنس بنی یوسفِ کنعاں
بازار کے بازار بڑی دیر سے چُپ ہیں

پھر نعرۂ مستانہ فرازؔ آؤ لگائیں
اہلِ رسن و دار بڑی دیر سے چُپ ہیں

خریدار

دلِ بے تاب کی موہوم سی تسکیں کے لیے
اِک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
آج کی رات بھی تُو اپنے دریچے کی طرف
حسبِ معمول نئی شان سے اِستادہ ہے
"تیر ستے ہیں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا"
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن
اب یہ عالم ہے کہ احساسِ تہی دستی سے
تیرے زینے کی طرف تیرے دریچے کی طرف
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتیں!

رباعی

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے
نشے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

ساغر میں ستارے گھل رہے ہوں جیسے
کرنوں کے دریچے کھل رہے ہوں جیسے
مستی میں وہ اُٹھتی ہوئی نظریں توبہ
پلکوں پہ زمانے تُل رہے ہوں جیسے

خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آ گئی ہے
جب اُن سے کوئی اُن کا آقا جُدا ہو رہا ہے
وہ آقا؟
کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے
کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے
وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں
سے حاتم کے مفروضہ قصے بھلائے
اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کُو بکو
بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا
مگر پھر بھی ہر سمت امن و اماں تھا
اگرچہ جہانگیر کی طرح اُس نے

کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اُٹھاتی
مگر پھر بھی ہر گھر میں عدل و مساوات کا سائباں تھا
اگرچہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے
رعایا کو رُوئے مبارک کے درشن سے مجبورِ سجدہ نہ کرتا
مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا
وہ جانِ جہاں تھا بڑا مہرباں تھا
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ آخر وہ لمحات بھی آ گئے ہیں
جب اُن سے بچھڑنے کو ہے اُن کا دیرینہ آقا
تو وہ آج اُسے کون سا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے
رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو
اپنے وفادار و پاپوش بردار خادم
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جارُوب کش سے بھی کہتر
مگر عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذرّوں کو ہم رُتبۂ مہر و مہتاب کر دیں

وہ چاہیں تو اپنے تخیل کے جادو سے
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں
وہ چاہیں تو اپنے کمالِ بیاں سے
فقیروں کو اورنگ وافسر کا مالک بنا دیں
وہ چاہیں تو اپنے فسونِ زباں سے
محلات کے بام ودیوار ڈھا دیں
وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں
کہ وہ عالمِ کلک وقرطاس کے بادشہ ہیں
یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے
محبوب آقا کی تعریف وتوصیف میں
آسمان وزمیں کو ملائیں!
کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی
کے جاروب کش سے بھی کہتر
انہیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے
کہ اُن کا فریضہ تو ہے صرف
آقائے حاضر کی خدمت گزاری

کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر مصلحت ہے اِسی میں
کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم!

اے بھوکی مخلوق

(۱۴۔ اگست ۱۹۵۴ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پنہ
پھر بھی تیری رُوح بُجھی ہے اور تقدیر سیہ
پھر بھی پاؤں میں زنجیریں ہیں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق
اے بھوکی مخلوق

بیس نہ سَو نہ ہزار نہ لاکھ ہیں پورے آٹھ کروڑ
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور
کھیت تو سونا اُگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج
تیرے دیس میں سب کچھ اور تُو غیروں کی محتاج
گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق
اے بھوکی مخلوق

آج گرفتہ دل تُو کیوں ہے تو بھی جشن منا
آنسو گر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیے جلا
پیٹ پہ پتھر باندھ کے اِمشب ننگا ناچ دکھا
آج تو ہنسی خوشی کا دن ہے آج یہ کیسا سوگ
تیری بہاریں دیکھنے آئیں دُور دُور کے لوگ
تیرے خزانے پل پل لُوٹیں کتنے ہی فاروق
اے بھوکی مخلوق

○

قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ نہ دھڑکن نہ صدا

آخرِ عشق کی رُسوائی ہے
اب ہوا چرچا تو گھر گھر ہو گا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہو گا

وہم تھا قافلۂ ہم سفراں
مُڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

شبِ تیرہ ہی غنیمت تھی فرازؔ
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

رباعی

ہر غم کو دلآویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

دل گرمیٔ احساس سے پھُک جائیں گے
قدموں میں ترے زمانے جھک جائیں گے
اے حسن فقط جنبشِ ابرو کی ہے دیر
دنیا کے کاروبار رُک جائیں گے

○
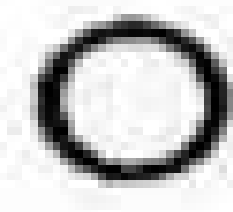
قاتل کے قصّے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے، کج کلہے، زرّیں کمرے
اُس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر مَیں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپ ہے فرازؔ
کِتنی سیانی اس پاگل کی باتیں ہیں

چند نادان چند دیوانے

رات کی جانگداز ظلمت میں
عزم کی مشعلیں جلائے ہوئے
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرار
وحشتوں کے مہیب سائے میں
سربکف، جاں بلب، نگاہ بہ قصر
سرخ و خونیں علم اٹھائے ہوئے
بڑھ رہے ہیں جنوں کے عالم میں
چند نادان چند دیوانے

قصرِ شاہی کے اے نگہبانو!
تلخ لمحوں سے ہوشیار رہو
اپنے پہروں پہ جم کے ڈٹ جاؤ
اپنے آقاؤں کی بقا کے لیے
فرض کے تندو تیز دھارے پر
تم وفادار ہو تو کٹ جاؤ

اس سے پہلے کہ مہرباں آقا
تند شعلوں کی زد میں آجائیں
اس سے پہلے کہ قصر جل اٹھے
خاک پر لوٹتے نظر آئیں
چند نادان، چند دیوانے

○
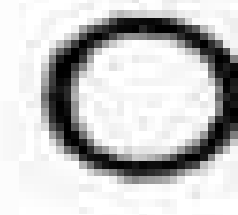
کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

صرف اندیشۂ افعی ہی نہیں
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ درگور ہوئے اہلِ نظر
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

زیست وہ جنسِ گراں ہے کہ فرازؔ
موت کے مول بھی سَستی ہے یہاں

○
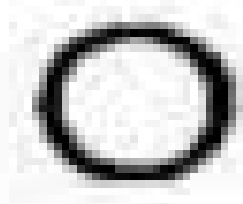
ہر ہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کِس کِس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہوتا ہے کون کون جُدا دیکھتے رہو

ہر فصلِ گُل ہے غیر یقینی سی اِن دنوں
صرصر چلے کہ بادِ صبا دیکھتے رہو

سُنتے رہو کہ وقت نے بدلی ہے راگنی
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرۂ منصور بھی گراں
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یارو پلک جھپکتے ہی لُٹتے ہیں قافلے
یاں خود کُشی ہے لغزشِ پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دار و رسن تک پہنچ گئے
اور تم فرازؔ دستِ صبا دیکھتے رہو

○

کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دُور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نشے میں چُور ہوں میں بھی تمہیں بھی ہوش نہیں
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
ابھی ہے دُور سحر تھوڑی دُور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فرازؔ تم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

لختی[1]

اَدھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لَویں کانپتی ہیں

---

[1] سرحد کے وہ رقاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ بنا کر ناچتے ہیں

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُمنگ
کسی سُوکھی ہوئی ٹہنی کا جھکاوٗ جیسے
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی گراں رفتاری
خشک ہوتی ہوئی ندّی کا بہاوٗ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لئے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگزاروں سے عرق پھُوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہوئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دُور اِک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہوئے سکّوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

ایک منظر

ڈور کچھ ماتمی نعروں سے فضا گونج اُٹھی
چند مجذوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
(کچھ سیہ پوش تماشائی بہ اندازِ جلوس)
چادرِ گُل سے سجائے ہوئے اعلام لیے!
دمبدم نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف
چیختا پیٹتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

یک بیک کھلنے لگے بند دریچوں کے کِواڑ
چلمنیں کانپتی باہوں کے سہارے اُٹھیں
جیسے دم توڑتے بیمار کی بوجھل پلکیں
اور کئی مضطر و بے تاب دمکتے چہرے
ایک دلچسپ و الم ناک تماشے کے لیے
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے
نُور کے چشموں کی مانند اُبل آئے ہیں

رباعی

ظلمات کو موجِ نور کیسے سمجھیں
پھر برق کو برقِ طور کیسے سمجھیں
مانا کہ یہی مصلحت اندیشی ہے
ہم لوگ مگر حضور کیسے سمجھیں

آشوب گہہِ دہر کے سوداگر ہیں
مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں
تم آبِ حیات مانگتے ہو ان سے
جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں

O
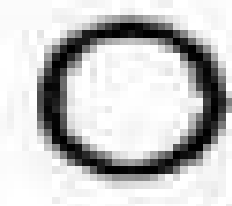
اس ادا سے کبھی آ کر گزرو
دل کے صحرا کو بسا کر گزرو

سنگِ خارا ہے زمانے کی نظر
دل کے آئینے بچا کر گزرو

روشنی رہبرِ رہزن بھی تو ہے
راہیو! شمعیں بجھا کر گزرو

کون جانے کہ یہ پتھر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گزرو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گزرو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اُٹھا کر گزرو

چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گزرو

وقت نے ساتھ دیا ہے کس کا
جی میں جو آئے سدا کر گزرو

پہلے دیوانوں کی رسمیں تھیں یہی
خون کانٹوں کو پلا کر گزرو

ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اُڑا کر گزرو

یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گزرو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آ کر گزرو

توسنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گزرو

فکر و ادراک کے دڑّوں میں فرازؔ
مشعلِ طبع جلا کر گزرو

○

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذّتِ غم بھی عجب نشّہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلۂ خوابِ طرب
سایۂ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

کتنا دلکش ہے جہانِ گزراں
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی
اِن خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشۂ گل میں بھی ہے موجۂ خوں
خار کی نوک چبھو کر دیکھو

اوس کی بُوند بھی ہے شیش نگر
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے سنّاٹوں میں وہ بات کہاں
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگولوں کے خداوند سہی
آتشِ گل تو فرو کر دیکھو

جو دیے لے کے نکلتے ہیں فرازؔ
وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھو کر دیکھو

منسوبہ سے

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلّو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اُٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصوّر پہ تجھے تول دیا

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لیے
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں
یہ مکانات، یہ جندر، یہ دکانیں، یہ زمیں
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقعت
ایک دو گیت پریشان سے گا لیتا ہوں
گاہے گاہے کسی ناکام شرابی کی طرح
ایک دو زہر کے ساغر بھی چڑھا لیتا ہوں

تو کہ اِک وادیٔ گلرنگ کی شہزادی ہے
دیکھ بیکار سے انساں کے لیے وقف نہ ہو
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی رونق ہے
ایک انجان سے طوفاں کے لیے وقف نہ ہو

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ اِن کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اُتر جائے گی

○
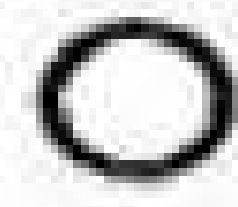
جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوریٔ دل
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سفینے جنہیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
اُن کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فرازؔ
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

معذرت

(ایک دوست کی شادی پر)

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی نظم کہوں
جس کے الفاظ میں پازیب کی جھنکاریں ہوں
جس کے ہر بند میں رقصاں ہوں بہاریں نغمے
جس کے شعروں میں خیابانوں کی مہکاریں ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی گیت کہوں
جس کی تشبیہوں میں ہنستے ہوئے پیمانے ہوں
جس کے انداز پہ طاری ہو شرابوں کا نشہ
جس کے مفہوم میں افسانے ہی افسانے ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی سہرا لکھوں
جس کی ہر لَے سے کئی گیت ہم آہنگ رہیں
جس سے جاگ اُٹھیں مغنّی کی سُریلی تانیں
جس میں افکار کی ترتیب کے سب رنگ رہیں

لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پردے میں
چند سلگی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چیخیں
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جن کی شادی بھی غم و رنج کا مجموعہ ہے
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ
جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز
جن کی باراتوں میں جل اُٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ

ایسے حالات میں کیا چیز تجھے نذر کروں
یہ حقائق مجھے مجبور کیے دیتے ہیں
میرے شاہد[1] مرے اخلاص سے مایوس نہ ہو
چند صدمے مجھے معذور کیے دیتے ہیں

---

[1] دولہا دوست

رباعی

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے ہٹ جاؤ

ہر زخم کو سینے پہ سجا لیتے ہیں
ہر درد کو ہم دل میں بسا لیتے ہیں
تم پھولوں پہ سوتے ہو تو دکھتا ہے بدن
ہم کانٹوں کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

○

اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
فرازؔ انجمنِ دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی، نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

جو صدمے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُلجھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فرازؔ سو جائیں

○
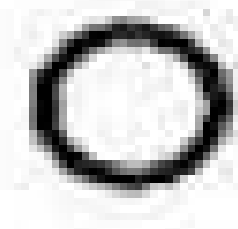
کچھ نہ کِسی سے بولیں گے
تنہائی میں رو لیں گے

ہم بے راہ رووں کا کیا
ساتھ کِسی کے ہو لیں گے

خود تو ہوئے رُسوا لیکن
تیرے بھید نہ کھولیں گے

جیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے

ہجر کی شب سونے والے
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آندھی اُٹھے گی
پنچھی جب پر تولیں گے

نیند تو کیا آئے گی فرازؔ
موت آئی تو سو لیں گے

○
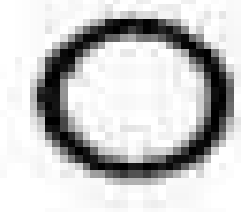
سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
وہ زخمۂ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن
فقط نمودِ سحر تک چراغ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالف تو زلف لہراؤ
کہ بادبان ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاسِ پیرِ مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ لبی
نشہ نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرازؔ
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

صراف

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتّھر پہ رگڑ اِس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اِک طَور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اِس جنسِ گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدّت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تری دوکاں کے یہ زرّیں زیور
یہ گلوبند یہ کنگن یہ طلائی پیسے
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری
کسی شدّاد کا تابُوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لیے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراوَ میں
پہلے تو رہن کیے بعد ازاں بیچ دیے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سُنہرے پلڑے
ایک جلّاد کی تلوار رہے ہیں اب تک
گرسنہ آنکھوں کے کشکول، ہوس کے مقتل
ہر نئے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساٹھ کے تیس نہیں، تیس کے پندرہ دے دے
اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا
آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

منصور

وہ کیا خطا تھی؟

کہ جس کی پاداش میں ابھی تک

میں قرن ہا قرن سے شکارِ عبودیت

طوق در گلو...... پا بہ، گل رہا ہوں

وہ جرم کیا تھا؟

کہ زندگی بھر تو میں

ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزرانتا رہا ہوں

اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسۂ گدائی۔ عذابِ عالم

تو کیا مری بے طلب ریاضت...... مجاہدت کا یہی صلہ ہے

مجھے گلہ ہے

خدائے تنّور و آبِ سادہ مجھے گلہ ہے
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا مِلا ہے؟
کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیّاض
جس کے جُود و سخا کے قصّے
سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے
حاشیے بن کے رہ گئے ہیں
کہاں ہیں وہ تیری جنّتیں جن کی داستانیں
بڑے تکلّف سے عرش سے فرش پر اُتاریں
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تُو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا
کہاں ہیں اُن واہمی کھلونوں کے
اُونچے بازار کس طرف ہیں
میں اِن روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تُو نے
زمیں پہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے دُھوئیں اُڑائے
کہ نسلِ آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وحدہٗ لاشریک دُنیا ہزار خطّوں میں کٹ گئی ہے
اگرچہ روزِ الست سے لے کے اب تلک

بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں
مگر یہ تاریخ کی کہن سال راہبہ، جو
ترے کلیساؤں بتکدوں اور حرم سراؤں کے مجرمانہ
رموز سے آشنا رہی ہے
ہر اک خرابے کی خاک اُڑانے کے بعد آئی
تو کہہ رہی ہے
"سنو نشیبوں کے باسیو!
یہ جہاں تمہارا ہے
یہ زمیں یہ فلک یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمہارے ہیں
دوسرا ماسوا تمہارے کوئی نہیں ہے
خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے
الوہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انساں کا واہمہ تھا
یہ واہمہ اِس قدر بڑھا پھر
کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
اور اس خداوند
اس تصور کے آسرے پر
تمہارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے
تم کو محکوم و پابہ زنجیر کر دیا ہے
یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب پہلا فسون ہے جس نے

مزاجِ انساں کو غاصبانہ شعور بخشا''

اگر یہ سچ ہے!

اگر یہ سچ ہے خدائے تنورو آبِ سادہ

تو یہ من وتو کی پست و بالا فصیل مسمار کیوں نہ کردوں

کہ اِن مراتب کی کشمکش سے ہی

آج میں اور میرے ہم جنس

اِس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں

جس طرح زمستاں کی برفباری کے بعد گرگانِ گرسنہ

بھوک کی شقاوت سے تنگ آ کر

اُس ایک لمحے کے منتظر ہوں

جب ان کا کوئی نحیف ساتھی

غنودگی کا شکار ہو

اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں

کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کے

کوئی نہیں جہنم

نہ اِس جہاں میں

نہ اُس جہاں میں

رباعی

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

تھک جائیں گے راہگیر چلتے چلتے
ڈھل جائیں گے ماحول میں ڈھلتے ڈھلتے
تاریکیٔ شب میں نہ کمی آئے گی
بجھ جائیں گے یہ چراغ جلتے جلتے

مشورہ

زیست کی تلخیوں سے گھبرا کر
اپنا دامانِ عجز پھیلا کر
آسماں کی طرف نگاہ کیے
اپنے ربِّ کریم کے در سے
موت کی بھیک مانگنے والے!
دیکھ اس زرنگار مسجد کو
آبِ زرّیں کی جھلملاہٹ سے
جس کے مینار جگمگاتے ہیں

تیرے ربِّ کریم کا گھر ہے
اور اس خانۂ مقدّس میں
مئے کوثر کے خم لنڈھائے ہوئے
شوخ غلماں لگائے سینے سے
ملک الموت نیم خوابیدہ
یادِ ربِّ کریم میں گم ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا
تابہ کے آسرا خداؤں کا
ہاں فقط ایک نعرۂ وحشت
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا
یا تو یہ خیر و شر کے رکھوالے
موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے
چھین کر اپنی زندگی پا لے
موت کی بھیک مانگنے والے

○

غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا ہوا بُرا ہونا

خود نگوں سار، ہم سفر بیزار
اِک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانکاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشۂ لذّتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دِکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جائے فرازؔ
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

رباعی

روتا ہوں تو احباب بُرا مانتے ہیں
ہنستا ہوں تو مجرم مجھے گردانتے ہیں
ہر حال میں اعتراض کرنے والے
ناداں مرے حالات کہاں جانتے ہیں

زہرابِ حیات چکھ رہا ہوں دیکھو
کانٹوں پہ زبان رکھ رہا ہوں دیکھو
واقف ہوں طبیعتوں سے ان کی پھر بھی
احباب کے دل پرکھ رہا ہوں دیکھو

○
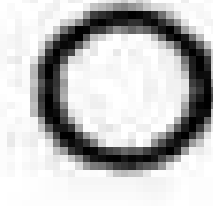
تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بُجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دِکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فرازؔ
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

آگ میں پھول

میں تو شعلوں کا پُجاری ہوں مرے پاس نہ آ
اپنے دامن میں محبت کے حسیں پھول لیے
ان دلآویز بہاروں سے مجھے ربط نہیں

جب کوئی تازہ کلی نکہت و رنگت کی پلی
شبنمی حسن کے سیمین لبادے اوڑھے
مست پلکوں پہ لیے صبحِ جوانی کی پھوار
میرے تپتے ہوئے ماحول میں در آتی ہے
تو مرے سرد ارادوں سے دھواں اٹھتا ہے
میری آنکھوں میں الاؤ سے دہک جاتے ہیں
اور اس آتش و ظلمت کے گھنے لاوے میں
مسکراتی ہوئی شاداب کلی کی سانسیں

چند ہی لمحوں میں رک جاتی ہیں پھک جاتی ہیں
تو کہ تو بھی ہے کسی ذوقِ نمو سے سرشار
مست پلکوں پہ لیے صبحِ جوانی کی پھوار

ایک انجان سی منزل کو بڑھے آتی ہے
دیکھ اس شعلوں کی بستی کو ذرا غور سے دیکھ
ہر قدم پر جہاں انگارے ہی انگارے ہیں
تو یہاں رہ کے کبھی پھول نہیں بن سکتی
لوٹ جا پیشتر اس کے کہ ترے ہونٹوں میں
احمریں رس کی جگہ تند شرر گھل جائیں
ان مہکتے ہوئے رخساروں کے زرخیز کنول
آگ کے حلقۂ بے باک میں جھلسے جائیں

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں......

رباعی

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے ساقی
کچھ دیر غمِ جہاں پہ ہنس لیں آؤ
رونے کو تو زندگی پڑی ہے ساقی

دنیا تو ہے کانٹوں کا بچھونا پیارے
تم ہم سے کبھی جدا نہ ہونا پیارے
آؤ مل کر دکھ کے لمحے کاٹیں
اک جشن ہے ساتھ ساتھ رونا پیارے

بڑھ جاتا ہے دل کا روگ گا ہے گا ہے
کر لیتے ہیں اپنا سوگ گا ہے گا ہے
جو یاد دلا دیتے ہیں بھولے صدمے
مل جاتے ہیں ایسے لوگ گا ہے گا ہے

○

میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنۂ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر
سایۂ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک اُن سے رہ و رسم چلی جاتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فرازؔ
آبدیدہ ہے کوئی خندہ بلب ہے کوئی

○
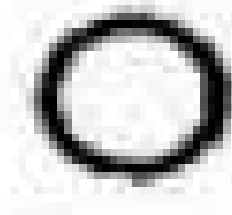
اب جو کانٹے ہیں دل میں تمناؤں کے پھول تھے
آج کے زخم پہلے شناساؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کچھ ایسا ہوا گُل فشاں گل فشاں
جس طرح پھوٹتے آبلے پاؤں کے پھول تھے

تھی ہمیں کو بہت خار زارِ جنوں کی لگن
دوستو! ورنہ اقوال داناؤں کے پھول تھے

غم کی لَو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دُھوپ میں کیسے کِھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

برف زاروں میں کوئی اگر یہ سماں دیکھتا
جابجا نقشِ پا کوہ پیماؤں کے پھول تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں تولا گیا
بِک گئے کوڑیوں مول جو گاؤں کے پھول تھے

زہر آگیں فضا بستیوں کی جنہیں کھا گئی
ہم فرازؔ ایسے سنسان صحراؤں کے پھول تھے ۔

○
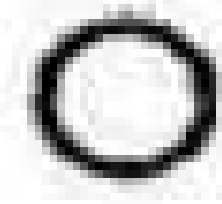
سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آ جاؤ
بڑا اُداس سماں ہے قریب آ جاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آ جاؤ

رہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجومِ ہم سفراں ہے قریب آ جاؤ

جو دشتِ عشق میں بچھڑے وہ عمر بھر نہ ملے
یہاں دُھواں ہی دُھواں ہے قریب آ جاؤ

یہ آندھیاں ہیں تو شہرِ وفا کی خیر نہیں
زمانہ خاک فشاں ہے قریب آ جاؤ

فقیہِ شہر کی مجلس نہیں کہ دُور رہو
یہ بزمِ پیرِ مغاں ہے قریب آ جاؤ

فرازؔ دُور کے سورج غروب سمجھے گئے
یہ دَورِ کم نظراں ہے قریب آ جاؤ

رباعی

ہر بحرِ ستم کو پاٹ لینے والا
ہر زہرِ الم کو چاٹ لینے والا
ذرّے سے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے
انساں پہاڑ کاٹ لینے والا

آشوب گہہِ حیات لے ڈوبیں گے
دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
ہم لوگ عبارت ہیں زمانے جن سے
ڈوبیں گے تو کائنات لے ڈوبیں گے

جانشیں

(۱۹۵۲ء میں کراچی میں طلباء پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا

جاہلو!

تم اندھیروں کی دُنیا کے باسی

جہالت کے تاریک غاروں کے مُردے

کہاں جا رہے ہو، کہاں؟

تم تہی دست ہو

تم تہی جیب ہو

تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم تمہارے لیے

کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو

منڈیوں میں سجائے ہوئے ہیں

تم نہیں دیکھتے

تم کہ شب کور ہو

ہم نے دن کے اُجالے میں بھی بس تمہارے لیے

اِس تمدّن کے فانوس روشن کیے

جن کی شفّاف کرِنوں سے سارا جہاں بقعۂ نُور ہے

عالمِ طُور ہے

پاگلو!

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم ارسطو ہیں شاہوں کے اُستاد ہیں

ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گُر یاد ہیں

ہم ہی سقراط ہیں

ہم ہی بقراط ہیں

ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے خردمند فرزند ہیں

ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں

سر پھرو!

تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمہیں

خاک و خوں کے سمندر میں نہلا دیا

صرف اپنے تسلّط کی خاطر تمہیں

ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا

چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے

اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا

تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں

یہ تسلّط یہ جاہ و حشم یہ زمیں

بس تمہارے لیے ہے تمہارے لیے

دَورِ فردا کے فرمانروا ہو تمہیں

تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشیں

پاگلو!......ہم سے عالی نظر دیدہ ور

تم سے جو بھی کہیں مان لو

اپنے اپنے مراتب کو پہچان لو

تم نہیں جانتے تم کہ مردہ رہے سالہا سال سے

بھیڑیوں اور درندوں کی ارواحِ بدتم میں در آئی ہیں

اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو

بغاوت پہ اُکساتی ہیں

اپنے اجداد سے، اپنے فرمانرواؤں سے، آقاؤں سے

جاہلو!

پاگلو!!

○
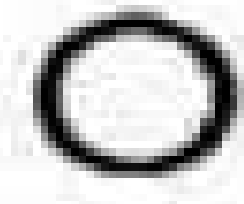
راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

اے یادِ حبیب ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آ پڑے ہیں

رُکنا ہو اگر تو سَو بہانے
جانا ہو تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں وجہِ گریہ
جب آپ بھی ساتھ رو پڑے ہیں

اب جانے کہاں نصیب لے جائے
گھر سے تو فرازؔ چل پڑے ہیں

سیلاب

پھر تم ہاتھوں کو پھیلاؤ   آیا ہے سیلاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ   آیا ہے سیلاب

قدرت کے سب کھیل نیارے
اس میں کسی کو دخل نہیں ہے
جس کو ڈبوئے جس کو ابھارے

چھوڑو ناؤ خوف نہ کھاؤ   دور نہیں گرداب
ناچو گاؤ جشن مناؤ   آیا ہے سیلاب

کشتیاں کو بہہ جانے دو
مال مویشی سب کچھ چھوڑو
نام خدا کا رہ جانے دو

ہاتھ اُٹھاؤ ڈوبے جاؤ   چھوڑو مال اسباب
ناچو گاؤ جشن مناؤ   آیا ہے سیلاب

پھٹے پرانے کپڑے پہنو

اپنا مقدّر ۔ اپنا نصیبہ

دیکھتی جاؤ ۔ ننگی بہنو

ننگی ماؤ۔ بُنتی جاؤ اطلس اور کمخواب

ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

تم ہو جیون بھر کے روگی

یہ جگ چھوڑو اُس دنیا میں

تم پہ خدا کی رحمت ہو گی

پھول اُگاؤ پتھر کھاؤ گندم ہے نایاب

ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

ہنس ہنس کر اے غربت زادو

اَن داتاؤں کے چرنوں میں

اپنی جانیں بھینٹ چڑھا دو

بڑھتے آؤ روگ مٹاؤ ہو جاؤ غرقاب

ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

○
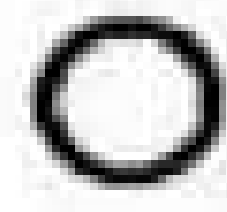
لے اُڑا پھر کوئی خیال ہمیں
ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں

رو رہے ہیں کہ ایک عادت ہے
ورنہ اِتنا نہیں ملال ہمیں

خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم
آئینے کی طرح سنبھال ہمیں

مرگِ انبوہ جشنِ شادی ہے
مِل گئے دوست حسبِ حال ہمیں

اختلافِ جہاں کا رنج نہ تھا
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

کیا توقّع کریں زمانے سے
ہو بھی گر جرأتِ سوال ہمیں

ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن
اپنی محفل سے مت نکال ہمیں

ہم ترے دوست ہیں فرازؔ مگر
اب نہ اور الجھنوں میں ڈال ہمیں

○
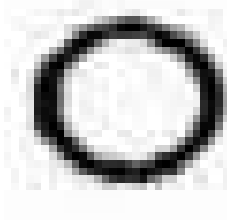
ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سنتا تھا حدیثِ غمِ دل یُوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

پی گئے رند کہ نایاب ہے صہبا ورنہ
زہر تھی محتسبِ شہر کی تنقید اب کے

تشنگی وجہِ جنوں ہے تو چلو یوں ہی سہی
کوئی سنگ آئے سرِ ساغرِ جمشید اب کے

اِک زمانے سے نہ روئے ہیں نہ جاں تڑپی ہے
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید اب کے

قصۂ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہنچے
منزلِ دار و رسن ٹھہری ہے تمہید اب کے

لہو روئے ہیں تو گلنار شفق پھوٹے گی
آنسو بوئے ہیں تو ہم کاٹیں گے خورشید اب کے

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فراز
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

۲۳ مارچ

(جشنِ جمہوریہ پاکستان کے موقع پر لکھی گئی)

''خوشا یہ ساعتِ رنگیں خوشا یہ روزِ طرب
ستم کشو! نئی منزل کا احترام کرو
اداس چہروں سے گردِ ملال دھو ڈالو
ملول روحوں کو ہنس ہنس کے شاد کام کرو
درونِ خانہ گھنی ظلمتیں سہی لیکن
بڑے خلوص سے تزئینِ سقف و بام کرو
چراغ ہوں کہ لہو ہو کہ آنسوؤں کی لکیر
پھر آج جشنِ بہاراں کا اہتمام کرو
شبِ الم کی حکایات کا یہ وقت نہیں
اٹھو اور اُٹھ کے نئی صبح کو سلام کرو''

امیرِ شہر کے فرمان سب بجا لیکن
فقیرِ شہر بھی کچھ عرضِ حال کرتے ہیں
خطا معاف بصد احترام عہدِ وفا
سسکتے ہونٹ، دکھے دل سوال کرتے ہیں
کہ ہم تو وہ ہیں جو باوصفِ ضعفِ تشنہ لبی
مزاجِ پیرِ مغاں کا ملال کرتے ہیں
ہر ایک تیر کو خوش آمدید کہتے ہیں
دو چند اہلِ حشم کا جلال کرتے ہیں
ہمیں تو جاں سے زیادہ عزیز دردِ وطن
مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں

چمن میں جشنِ ورودِ بہار جب بھی ہوا
وطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دیے
رہی ہے بوالہوسوں کے سبو میں بادۂ ناب
بلاکشانِ وفا نے لہو کے گھونٹ پیے
مہ و نجوم رہے بزمِ شہر یاراں میں
نگاہِ خلق ترستی رہی کرن کے لیے

ادھر عبا و قبا کا خیال دامن گیر
ادھر یہ فکر کہ کوئی جگر کے چاک سیئے
تو کیا یہی غمِ جمہور کے تقاضے ہیں
نظر اُٹھا کے نہ دیکھیں کوئی مرے کہ جئے

زہے نصیب جو اب بھی غمِ مآل رہے
یہ دورِ نو ہے مبارک اگر سنبھل کے چلیں
یہ چند سانسوں کی فرصت بڑی غنیمت ہے
کسے خبر ہے کہ پھر حادثے ٹلیں نہ ٹلیں
خدا وہ وقت نہ لائے کہ گردشوں کے طفیل
حضور اپنی جفا کیشیوں پہ ہاتھ ملیں
جو ہو سکے تو مٹا دیں یہ فاصلے ورنہ
کہیں یہ ذرّے ستاروں سے انتقام نہ لیں
بجھے ہوں دل تو اندھیرے کبھی نہیں مٹتے
یہ قمقمے تو کجا لاکھ آفتاب جلیں

○

دل کو اب یوں تری ہر ایک ادا لگتی ہے
جس طرح نشے کی حالت میں ہَوا لگتی ہے

رَت جگے خوابِ پریشاں سے کہیں بہتر ہیں
لرز اُٹھتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

اے رگِ جاں کے مکیں تُو بھی کبھی غور سے سُن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

گو دُکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی
جس جگہ زخم ہوں واں چوٹ سدا لگتی ہے

شاخِ اُمید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

تیرا کہنا کہ ہمیں رونقِ محفل ہیں فرازؔ
گو تعلّی ہے مگر بات خدا لگتی ہے

○
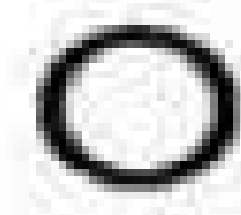
ہم اپنے آپ میں گم تھے ہمیں خبر کیا تھی
کہ ماورائے غمِ جاں بھی ایک دنیا تھی

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام
کہ تجھ سے مل کے بچھڑنا مری تمنا تھی

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تُو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

خوشا وہ دل جو سلامت رہے بزعمِ وفا
نگاہِ اہلِ جہاں ورنہ سنگِ خارا تھی

دیارِ اہلِ سخن پر سکوت ہے کہ جو تھا
فرازؔ میری غزل بھی صدا بصحرا تھی

تفاوت

تو کیوں ہے اُداس مسکرا دے
کیوں تجھ کو غمِ وفا نے گھیرا
زنگارِ الم سے دُور ہی رہ
آئینہ صفت جمال تیرا
کتنی ہی سیاہ شب ہو لیکن
کب چاند پہ چھا سکا اندھیرا
کب موجۂ روشنی تھمی ہے
دریاؤں پہ دُھول کب جمی ہے

میں کیسے ہنسوں کو دردِ ہستی
ہے میرے شعور کا تقاضا
حالات کی دھوپ میری قسمت
آلام کی ریگ میری دنیا
میں سایۂ نخل کو بھی ترسوں
صحرا کی طرح وجود میرا
صحراؤں میں پھول کب کھلے ہیں
ہم دونوں میں کتنے فاصلے ہیں

○

اب تک ترے فتنے ہیں سلامت اُسے کہنا
یارو! سرِ محشر بھی قیامت اُسے کہنا

اے ہم نفسو محوِ غمِ جاں ہیں ابھی ہم
آئیں گے سرِ کوئے ملامت اُسے کہنا

معیارِ نظرداد کی رفعت بھی تھی لیکن
بھولا نہیں تیرا قدو قامت اُسے کہنا

اک وہ ہی نہیں ترکِ تعلق پہ پشیماں
ہے اہلِ وفا کو بھی ندامت اُسے کہنا

اَے دل زدگاں! موت ہے اظہارِ تمنّا
وہ بُت ہو خدا بھی تو خدا مت اُسے کہنا

ہر چند فرازؔ اِن دنوں معتوب ہے پھر بھی
حالات کا مارا ہے بُرا مت اُسے کہنا

تسلسل

کب سے سنسان خرابوں میں پڑا تھا یہ جہاں
کب سے خوابیدہ تھے اِس وادیٔ خارا کے صنم
کس کو معلوم یہ صدیوں کے پُراسرار بھرم
کون جانے کہ یہ پتھر بھی کبھی تھے انساں
صرف لب دوختہ پربت ہیں جہاں نوحہ کناں

نہ در و بام نہ دیوار و دریچہ کوئی
کوئی دہلیزِ شکستہ نہ حریمِ ویراں
شہر کے شہر ہیں پاتال کے دامن میں نہاں
کون پہچانتا ظلمت میں سیاہی کے نشاں
جو نظر ڈھونڈنے اُٹھی وہ نظر بھی کھوئی
چشمِ مہتاب بھی شبنم کی جگہ خوں روئی

یہ خرابے تھے ان ادوار کے مدفن جن میں
ارضِ مشرق کے جہاں تاب اجالوں کی نمود
جگمگاتی رہی تاریخ کا تاریک وجود
رات ہوتی رہی تبدیل چمکتے دن میں
ان گنت صدیوں کی تہذیب دبی تھی ان میں

علم نے آج کریدے ہیں وہ ظلمات کے ڈھیر
وقت نے جس پہ بٹھائے تھے فنا کے پہرے
جاگ اُٹھے صورِ سرافیل سے گونگے بہرے
تا ابد جن کے مقدّر میں تھی دنیا اندھیر
یہ مگر عظمتِ انساں ہے کہ تقدیر کے پھیر؟

یہ عمارات، یہ مینار، یہ گلزار، یہ کھیت
تودۂ خاک سے ہستی نے لیا تازہ جنم
جی اُٹھے وادیٔ خاموش کے بے جان صنم
پھر کوئی چیرے گا ذرّے کا جگر قطرۂ یم
دفن کر دے گا جو خالق کو بھی مخلوق سمیت
اور یہ آبادیاں بن جائیں گی پھر ریت ہی ریت

○
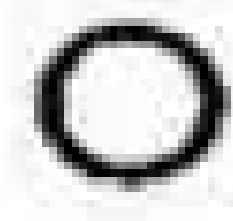
چاندنی رات کو سحر کہنا
دوستو! یوں نہیں مگر کہنا

اب کہاں وہ بہار پھولوں کی
گلِ نرگس کو چشمِ تر کہنا

بجھ چکے ہیں محبتوں کے چراغ
ان دیاروں کو اب کھنڈر کہنا

راہ میں لٹ کے بیٹھنے والو
اب کسی کو نہ ہم سفر کہنا

خود اُجاگر کرو ہنر اپنا
دوسروں کو نہ کم نظر کہنا

ق

ہم کو آوارگی کے پردے میں
دل کی باتیں ادھر اُدھر کہنا

ذکر تیرا گلی گلی کرنا
حال اپنا نگر نگر کہنا

لبِ گویا عذابِ جاں ہے فرازؔ
جو بھی کہنا ہو سوچ کر کہنا

ہلالِ عید

ہلالِ عید! نویدِ طرب ہے دید تری
تری نمود خوشی کا پیام لاتی ہے
بجھی نگاہوں میں کرنوں کی جوت بھرتی ہے
ملول روحوں کی افسردگی مٹاتی ہے
روائتیں ہیں کہ اس دن ہر ایک دل کی کلی
وفورِ نشۂ راحت سے جھوم جاتی ہے
بلند و پست کے ہر تفرقے مٹاتے ہوئے
ہر اک محل میں ہر اک گھر میں عید آتی ہے

ہلالِ عید! مگر میں نے ہر برس دیکھا
کہ تیری ضو بھی نشیبوں میں مسکراتی نہیں
روائتوں پہ مجھے بھی یقیں تو ہے لیکن
یہ خوش عقیدگی کیا کیجے راس آتی نہیں
خدا کے گھر میں برابر سہی غریب و غنی
یہ رسم ملکِ خدا میں رواج پاتی نہیں
طلوع ہوتا رہا تو ہر ایک سال مگر
مرے وطن کی جبیں پھر بھی جگمگاتی نہیں

ہلالِ عید! تفاوت کی آتشیں آندھی
جھلس رہی ہے مرے دیس میں خوشی کے چمن
کہیں تو جسم پہ ریشم کے ڈھیر بارِ نظر
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن
کہیں تو کجکلہی وجہِ نخوت و تمکیں
کہیں فلاکت و افلاس زندگی کے کفن
کہاں وہ دن کہ غریب الدیار روتے تھے
یہ حال ہو تو وطن میں ستم ہے عیدِ وطن

ہلالِ عید! تجھے غمزدوں سے کیا نسبت
کہ خواجگانِ جہاں ہی ترے چہیتے ہیں
جو تیرے نام کے ساغر فضا میں لہرا کر
تری کمان کی قوسوں کو موڑ دیتے ہیں
فغاں، کہ تجھ کو بھی ان بے کسوں سے ربط نہیں
جو اپنے دل کے سفینے لہو میں کھیتے ہیں
تری ضیا بھی ہے گویا کٹی پتنگ جسے
بلند بام خلا ہی میں لُوٹ لیتے ہیں

ہلالِ عید! طرب زا سہی یہ شام مگر
چراغِ شوق جلاتے ہوئے لرزتے ہیں
دلوں پہ کل جو قیامت گزرنے والی ہے
اب اس کا دھیان بھی لاتے ہوئے لرزتے ہیں
ہم اہلِ غم تجھے خوش آمدید کیسے کہیں
جو اپنے دکھ بھی سناتے ہوئے لرزتے ہیں
اگرچہ تجھ پہ نگاہیں جمی ہوئی ہیں مگر
دعا کو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے لرزتے ہیں

O

جانے کس غم سے من سلگتا ہے
بات کرتے دہن سلگتا ہے

غم لگاتا ہے آگ خلوت میں
دل سرِ انجمن سلگتا ہے

احمریں جسم آنچ دیتا ہوا
جس طرح پیرہن سلگتا ہے

یہ طلب ہے کہ دردِ محرومی
ابر چھائے تو بن سلگتا ہے

دیکھنا لُو چلی کہ بادِ مُراد
دوستو پھر چمن سلگتا ہے

جاگ اُٹھی خواہشِ گناہ فرازؔ
چاندنی میں بدن سلگتا ہے

واہمہ

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و معصوم ہنسی
آنکھ کی بھول سماعت کا فسوں
تیری عادت ترا انداز نہ ہو
بے تکلّف ترے ہونٹوں کی چٹک
میری خوش فہمی کا اعجاز نہ ہو
میں سرابوں کو بھی دریا سمجھوں
تو فقط شوق کی پرواز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و بیباک ہنسی
میں جسے خواب سے تعبیر کروں
وہ حقیقت میں کوئی راز نہ ہو
تیرے بے ساختہ ہنسنے کی ادا
تیری تنہائی کی آواز نہ ہو
میں جسے حسنِ طبیعت جانوں
تیرے جذبات کی غماز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و پرکار ہنسی
میری دنیا مری ہستی کا سکوں
کسی طوفان کا آغاز نہ ہو

میں محبت کی طلب کا مارا
تو فقط حسنِ نظر باز نہ ہو
یہ نہ ہو میں تو سوئمبر جیتوں
اور ترے قصر کا در باز نہ ہو

ایک شعر

جسم بلّور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

○
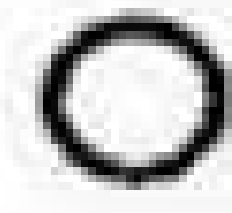
یہ میں یہ کوئے دار یہ تنہائی دوستو
کیا تم بھی بن گئے ہو تماشائی دوستو

پیغامِ مرگ ہے کہ پیامِ حبیب ہے
صرصر چلی کہ بادِ مراد آئی دوستو

یہ کیا کہ ایک تیرِ ملامت نہ سہہ سکے
ہونی ہے کوبکو ابھی رسوائی دوستو

آغازِ شامِ ہجر ہے بیٹھے رہو ابھی
ٹھہرو ذرا کہ موت ہے تنہائی دوستو

زنجیر کٹ گئی کہ کوئی دوست کٹ گیا
کچھ تو کہو یہ کیسی صدا آئی دوستو

اک بار اس کو میری نگاہوں سے دیکھ لو
پھر خود کہو کہ کون ہے سودائی دوستو

وہ حسنِ دلفروز کہ جانِ فرازؔ ہے
خلقِ خدا ہے اس کی تمنائی دوستو

کنیز

حضور آپ اور نصف شب مرے مکان پر
حضور کی تمام تر بلائیں میری جان پر
حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خموش ہیں
حضور بولیے کہ وسوسے وبالِ ہوش ہیں
حضور، ہونٹ اِس طرح سے کپکپا رہے ہیں کیوں
حضور آپ ہر قدم پہ لڑکھڑا رہے ہیں کیوں
حضور آپ کی نظر میں نیند کا خمار ہے
حضور شاید آج دشمنوں کو کچھ بخار ہے
حضور مسکرا رہے ہیں میری بات بات پر
حضور کو نہ جانے کیا گماں ہے میری ذات پر

حضور منہ سے بہہ رہی ہے پیک صاف کیجیے
حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجیے
حضور کیا کہا، مَیں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ مَیں بھی کوئی چیز ہوں

حضور چھوڑیے ہمیں ہزار اور روگ ہیں
حضور جایئے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

آتشِ عجم

شبِ سیہ کے اُمڈتے ہوئے اندھیروں میں
دل و نظر نے اُمیدوں کے کتنے خواب بُنے
خرد کے ہاتھ میں جب آخری چراغ بجھا
جنوں نے عزم کے ذرّوں سے آفتاب چُنے

ہوس کی تیرہ نگاہوں کے رینگتے سائے
بڑھے تو بجھتے شراروں نے آگ برسائی
فضا نے جب بھی ارادہ کیا کچلنے کا
تو ڈوبتی ہوئی نبضوں میں برق لہرائی

خیال تھا کہ اگر تند آندھیاں بھی اُٹھیں
تو ذرّے سُرخ بگولوں کا روپ لے لیں گے

ہزار بادِ مخالف کا زور ہو لیکن
سفینے شدتِ طوفاں کو مات دے دیں گے

حیات دست و گریباں ہوئی قضا سے مگر
ہزار سانپ نکل آئے آستینوں سے
بہت قریب تھی ساحل کی روشنی لیکن
سفینے جھوم کے ٹکرا گئے سفینوں سے

اس اختلافِ بہم کی کڑی کشاکش میں
وہ ولولے وہ شرر سرد ہو گئے آخر
وہ ذرّے جن کو فضاؤں میں رقص کرنا تھا
بگولے بن نہ سکے گرد ہو گئے آخر

بہ ایں ہمہ نہ رُکے گی اس انقلاب کی رو
اس انقلاب کی ضوتیرگی مٹائے گی
جو آگ تیل کے چشموں کو چھو کے گزری ہے
سمندروں کی تہوں کو بھی چیر جائے گی

دردآشوب

۱۹۶۶ء کا آدم جی ادبی انعام یافتہ

محبوب اختر کے نام

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے، تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

ترتیب

فنکاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خُوں اُگلتے رہے

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سُناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھُولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اِس کے عوض ہاتھ کٹوا دیے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم نے ہر اِک کے دُکھ اپنے دل سے لگائے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مُدّعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں مِلیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھُولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

○

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

○

قربتوں میں بھی جُدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلّق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لُٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرآز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

معبُود

بہت حسین ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب
حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا
ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں
تجھے عزیز مرا فن مجھے جمال ترا

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اُگلتی ہُوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیت ہے زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اُس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پُجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبُود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

O
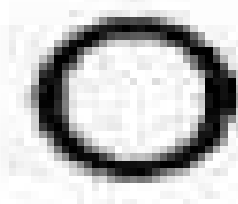
جُز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسّس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سُناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

.......ق.......

کاش تو بھی مری آواز کہیں سنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تُو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فرازؔ
جُز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

○

نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب، کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گُل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ ساخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے بام و در، یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بُجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو فرازؔ تُو کہ نصیبِ دار کوئی تو ہو

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پر
لرز رہا ہوں
مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مُجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اَب عمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں اک دوسرے کو کوئی
وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شب خوں سے
بُوئے گل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑیوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہُوئے رفیقوں کی

زخم خوردہ برہنہ لاشیں
گڑی ہُوئی ہوں
میں جانتا تھا
کہ جب یہ بوجھل بلند اشجار
جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں
ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو
میں ایک برگِ خزاں بھی
شاخِ نہالِ غم پر نہ رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صُبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی
مگر مرا دل دَھڑک رہا ہے
مجھے، جسے آندھیوں کی یورش
خزاں کے طوفاں نہ چھو سکے تھے
کہیں نسیمِ بہار...... شاخِ نہالِ غم سے
جدا نہ کر دے

خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار وہ گیسو
بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادو
حیران و پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو

پابندِ تصور نہیں وہ جلوۂ بیتاب
ہو دُور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگھرو

باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر
وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کوکو
جیسے کوئی قمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دل تری باتوں پہ کہاں تک کوئی جائے

جذبات کی دنیا میں کہاں سوچ کے پہلو

کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہُو

مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خُو

شاید کہ وہ عارض ہوں گلِ تر سے بھی خوشرو

دلکش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

یہ کس کو خبر کس کا مقدّر ہے یہ سب کچھ

خوابوں کی گھٹا دُور برس جائے گی اور تُو

لَوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

○

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اُٹھا لے جائے

اور سے اور ہُوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہُوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیٔ دل ہے تو منزل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فرازؔ
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

○
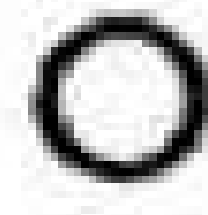
نہ انتظار کی لذّت نہ آرزو کی تھکن
بجُھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سُلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رتجگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رسن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سَمن

بہارِ قُرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جدائیوں کی ہوائیں محبتوں کے چمن

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اَب تک
وصالِ یار کی لذّت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ کہ تُو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

امیرِ شہر غریبوں کو لُوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دِل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فرازؔ سلامت ہے یار کا دامن

○
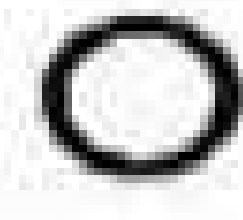
ہم تو یُوں خوش تھے کہ اِک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیِ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہُوں یہ دیکھا تُو نے
کِس قدر حوصلہ ہارے ہُوئے انسان میں ہے

فاصلے قُرب کے شعلوں کو ہَوا دیتے ہیں!
میں ترِے شہر سے دُور اور تُو مرے دھیان میں ہے

سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے؟

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جیسے اَب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فرازؔ
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

○

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہرومہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو، درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فرازؔ اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اظہار

پتّھر کی طرح اگر میں چپ ہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اوّلیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لیے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو
ہم سمجھے تھے پائندہ
وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو
برسوں رکھا تابندہ
دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں
دونوں کیے پر شرمندہ
پیار سے پیارا جیون پیارے
کیا ماضی کیا آئندہ
ہم دونوں اپنے قاتل ہیں
ہم دونوں اب تک زندہ

○

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کسے

جل بجھیں دردِ ہجر کی شمعیں گھُل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا طاقت و تابِ انتظار کسے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اِس قدر پاسِ طبعِ یار کسے

کاہشِ ذوقِ جستجو معلوم، داغ ہے دل، چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو کیجیے فرصتِ نغمۂ قرار کسے

کون دارائے ملکِ عشق ہُوا کس کو جاگیرِ چشم و زلف ملی
''خونِ فرہاد برسرِ فرہاد'' قصرِ شیریں پہ اختیار کسے

حاصلِ مشربِ مسیحائی، سنگِ تحقیر و مرگِ رسوائی
ذ ت یار ہو کہ رفعتِ داران صلیبوں کا اعتبار کسے

○
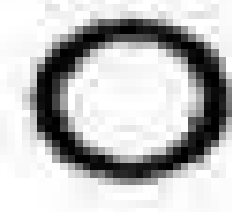
دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اب تو ہم لوگ گئے دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اُس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھول ہوئی ہے دلِ بیتاب سے بھی

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اُس حُسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

O
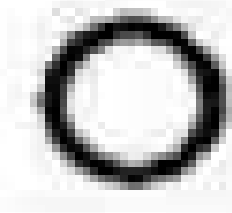
وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات بھی کی تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمہارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اُٹھایا، کسی نے مینا لیا

فرازؔ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری، چراغ بھی نہ لیا

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اُس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سُنی اور چاہا
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا مرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِلب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دیا جلایا
کب عہدِ وفا کی بات کی تھی
کب ہم نے کوئی فریب کھایا
وہ شام وہ چاندنی وہ خوشبو
منزل کا کسے خیال آیا

تو محوِ سخن تھی مجھ سے لیکن
میں سوچ کے جال بُن رہا تھا
میرے لیے زندگی تڑپ تھی
تیرے لیے غم بھی قہقہا تھا
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا

○

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جُدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھُولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دُور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

○

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھایئے
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو بھلا کے دل ہے وہ شرمندۂ نظر
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فرازؔ
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

O

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اُداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاج اِس دلِ درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

فرازؔ تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ہمدرد

اے دل اُن آنکھوں پر نہ جا
جن میں وفورِ رنج سے
کچھ دیر کو تیرے لیے
آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک
جو تجھ کو پاگل کر گئی!
اِن جگنوؤں کے نور سے
چمکی ہے کب وہ زندگی
جس کے مقدّر میں رہی
صبحِ طلب سے تیرگی

کس سوچ میں گم صم ہے تُو
اے بے خبر! ناداں نہ بن
تیری فسردہ رُوح کو
چاہت کے کانٹوں کی طلب
اور اُس کے دامن میں فقط
ہمدردیوں کے پھُول ہیں

خواب

وہ چاند میرا ہم سفر تھا
دُوری کے اُجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اک عمر سے میں ملول و تنہا
ظلمات کی رہگزار میں ہوں
میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں
کیا سوچ کے انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کونْ ہوں کس دیار میں ہوں

○
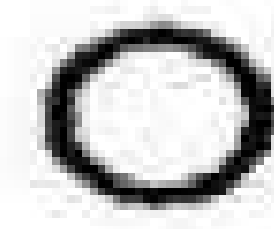
سو دُوریوں پہ بھی مرے دل سے جدا نہ تھی
تُو میری زندگی تھی مگر بے وفا نہ تھی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یوں دل لرز اُٹھا ہے کسی کو پکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا
اِس جاں سپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھی

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اُٹھی
اِس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فرازؔ ہم
بدنام یوں ہُوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

○
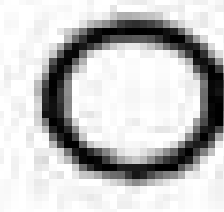
جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا
آج کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہدِ وفا یاد آیا

جس طرح دھند میں لپٹے ہوئے پھول
ایک اِک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

اے رفیقو سرِ منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فرازؔ
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

سوال

(فراقؔ کی تصویر دیکھ کر)

اِک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور نڈھال زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے
لمحات کی اَن گِنت خراشیں
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
رُوٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسّم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جواب چاہتا ہے

غریبِ شہر کے نام!

غریبِ شہر تری دکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب تری چاہت تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام
دریدہ دل! ترے آہنگ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد، فصلِ دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریباں، بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام، مگر شمعِ رہگزار کی خیر
تمام عمر تو گزرے اِس انتظار کی خیر

رخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
بہ سینہ رہ سپرم دست و پا بریدہ سہی

○

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دَور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہلِ تمنّا کو فرازؔ
وہ جو محرومِ تمنّا ہیں بُرا کہتے ہیں

○

گل ہو چراغِ مے تو سزاوارِ سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مطرب کی بے دلی ہے کہ محفل کی بے حسی
کس تیغ سے ہلاک نواہائے چنگ ہیں

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گم
آنکھیں نگار خانۂ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب و تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ
شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حسنِ سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کشتۂ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں تلوّنِ خاطر کو کیا کریں
ہم خود فرازؔ اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

○

وہی جنوں ہے، وہی کوچۂ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدّعا وہ گلِ تر وہ سروِ قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر کے اُسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فرازؔ ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

پیغام بر......

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دُکھ کی تاریکی لیے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھوں پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مُو اَفسردہ رُو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلّم پر سَراپا التماس
اِس تمنا پر کہ تُم کو مِل سکے
غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن...... جینے کی آس
میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس
صُورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دِل ہیں قہقہوں سے چُور

لیکن آنکھ سے آنسو رواں

سب کے سینوں میں اُمیدوں کے چراغاں

اور چہروں پر شکستوں کا دُھواں

زندگی سب سے گریزاں

سُوئے مقتل سَب رواں

سَب نحیف و ناتواں

سَب کے سَب اک دُوسرے کے ہم سفر

اک دوسرے سے بدگماں

سَب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس

میری باتوں سے مری آواز سے

تم نے یہ جانا کہ میں بھی

لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وہ معجزے

جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے

اَن گنت صدیوں کے لاتعداد زخم

دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہُوئے بے جان جسم

منتظر ہیں قُم بِاِذنی کی صَدائے سحر کے

ایشیا پیغمبروں کی سَر زمیں

اور تم اس کے زبُوں قسمت مکیں...... تیرہ جبیں

من وسلویٰ کے لیے دامن کُشا

قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صِرف تقدیر و توکل پر یقیں
تم کو شیرینِ طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سِل کو
چیرنے کا حوصلہ یارا نہیں
تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ ہو کوہ گرفتہ ...... زندگی سے دُور
مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجّادہ نشیں
خاکداں کی اس گلِ تاریک کا
میں بھی اِک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
ریت کے تپتے ہُوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزوِ دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف
اور تمہارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی؟
سب کی رُوحیں گرسنہ ...... سب کی متاعِ درد میں
دوسروں کا خون پینے کی ہوس

ایک کا دُکھ دوسرے سے کم نہیں
ایک کا دُکھ تشنگی، بیچارگی
دوسروں کا دُکھ مگر افراطِ مے...... دیوانگی
پیاس اور نشّے کا دُکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشّے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمہاری زندگی شاید نہ ہو
شاکیٔ عرشِ بریں و رحمت اللعالمیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

○
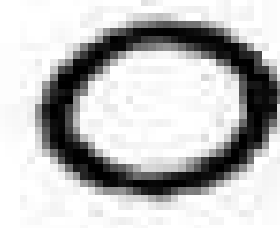
روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتّھروں کے سینوں پر تھک کے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی
ریتلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفاں میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ ہنستا ہے
جب نہ بن پڑا کچھ بھی داغ دھو گئے دریا

زخمِ نامرادی سے ہم فرازؔ زندہ ہیں
دیکھنا سمندر میں غرق ہو گئے دریا

○

تو کہ انجان ہے اِس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے تو اُسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آ جائے میسّر تو مقدّر تیرا
ورنہ آسودگیٔ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اِک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ امید سے تکتا ہے فرازؔ
وہ جو اِک کشتیٔ دل تھی اُسے غرقاب سمجھ

خدائے برتر

خدائے برتر
مری محبت
تری محبت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے
تری محبت کا درخورِ اعتنا
فقط بیکراں سمندر
کہ جس کی خاطر
سدا تری رحمتوں کے بادل
کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی
کبھی کسی آبجو کے آنسو
کبھی کسی جھیل کے ستارے
کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اُڑا کے لائے
کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں
تری محبت تو اس شہنشاہ کی طرح ہے
جو دوسروں کے ہُنر سے، خونِ جگر سے

اپنی وفا کو دوام بخشے
مگر مری بے بساط چاہت
فقط مرے آنسوؤں سے
میرے لہو سے...... میری ہی آبرو سے
رہی ہے زندہ
اگرچہ اس بے بضاعتی نے
مجھے ہمیشہ شکست دی ہے
مگر یہ ناکامیٔ تمنا بھی
اس محبت سے کامراں تر عظیم تر ہے
جو اپنی سطوت کے بل پر
اوروں کی آہ وزاری سے
اپنے جذبِ وفا کی تشہیر چاہتی ہے
مری محبت نے
جو بھی نامِ حبیب سے کر دیا معنون
وہ حرف میرا ہے، میرا اپنا ہے
اے خدائے بزرگ و برتر

○

قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو، دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سُجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سُنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فرازؔ
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

○
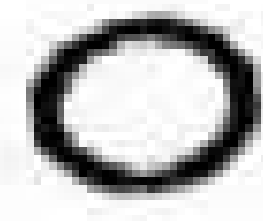
دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اُسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اُس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہُوئے آ جاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

○
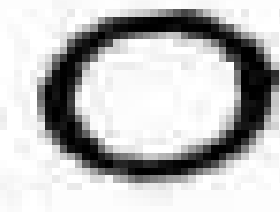
یہ عالمِ شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے جو سُنا، پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے

فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جُدا دیکھا نہ جائے

خود غرض

اے دل! اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بیتاب رہا
دن کے ہنگاموں میں ڈوبا راتوں کو بے خواب رہا
لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لیے نایاب رہا

پھر اک انجانی صورت نے تیرے دُکھ کے گیت سُنے
اپنی سُندرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بُنے
خود کانٹوں کی باڑھ سے گزری تیری راہ میں پھُول چُنے

اے دل جس نے تیری محرومی کے داغ کو دھویا تھا
آج اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور تُو سوچ میں کھویا تھا
دیکھ پرائے دُکھ کی خاطر تو بھی کبھی یوں رویا تھا؟

وابستگی

آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لیے
ہر ستارہ ہلاکِ صبحِ طلب
منزلِ خواہشِ حبیب لیے

اس سے پہلے بھی شامِ وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے
ہر کوئی سُوئے قتل گاہ چلا

کتنی باہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں ہے کوئے مراد
پھر بھی شب زندہ دار ہیں زندہ
پھر بھی روشن ہے بزمِ رسمِ وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اُسی کی مراجعت کے لیے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

○
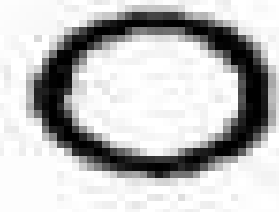
دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جایئے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سرخ لہر ہے موجِ سپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حُسنِ سادہ لوح نہ دل میں اُتر سکا!
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

دنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجھے
بات اس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فرازؔ
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

○
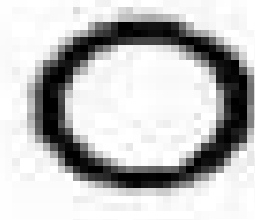
جب تری یاد کے جگنو چمکے
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دنیا
ایسے عالم میں اگر تُو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا
کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدّتِ احساسِ جمال
رنگ تو رنگ ہے خوشبُو چمکے

آنکھ مجبورِ تماشا ہے فراز
ایک صورت ہے کہ ہر سُو چمکے

ممدوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل ولب کی تعریف
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے
جانے دو دن کی محبت میں یہ بہکے ہُوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

میں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
گر مجھے ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وہ شمع کہ پتّھر کی بھی پروا نہ کرے
میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگیٔ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دُکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا
میرے پیکر میں تری ذات گھلی ہے اِتنی
کہ مرا جسم مری روح نہیں تیرے سوا
میرا موضوعِ سخن تُو ہو کہ ساری دُنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

○

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اُڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

کھنچی ہُوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

○

بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جُدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکاں ہے بہت کم پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دوسروں کے لیے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو تم دور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

اَے نگارِ گُل

نگارِ گل تجھے وہ دن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اب دل پہ تازیانہ لگے
تری طلب میں وہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اب فسانہ لگے
بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہو کے چراغ
کہ تو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے

اسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا
کہ تجھ کو گردشِ ایّام کی ہوا نہ لگے
مگر جو گزری ہے ہم پر ترے حصول کے بعد
وہ حالِ غم بھی کہیں، گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گل وہ ہمیں تھے ترے تمنّائی
کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہُوئے
ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہُوئی
ہمیں ہیں وہ جو تری رہگزر میں خاک ہُوئے
خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی مگر
بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہُوئے
ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے
ترے حریم میں آ کر ہمیں ہلاک ہُوئے

نگارِ گل یہ تقاضا مگر وفا کا ہے
کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں
گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر
پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں
الم گزیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں
یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا
ہر ایک حال میں توصیفِ حسنِ یار کریں
جبیں سے دھو کے ہر اک نقش نامرادی کا
نگارِ گل ترے جلووں کا انتظار کریں

گُلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو

عمرِ گزری ہے سجاتے ہُوئے بام و در کو
اس تمنّا پہ کہ وہ جانِ بہار آئے گی
فرشِ رہ دیدہ ودل تھے کہ وہ آسودہ خرام
درد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی
اس توقع پہ خرابے رہے آغوش کشا
کھُل کے برسے گی اگر اب کے گھٹا چھائے گی
ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے
آخرِ کار وہ محبوبِ نظر بھی آئی
منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں لیکن
کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی
جسم کیوں شل ہیں دھڑکتے ہُوئے دل کیوں چپ ہیں
جرسِ گل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار
سرپھرو! وادیٔ پُرخار میں یہ تو ہو گا
کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دُھواں
آرزوئے لب و رخسار میں یہ تو ہو گا
ایک سے ایک کڑی منزلِ جاں آئے گی
رہگزارِ طلبِ یار میں یہ تو ہو گا

ہونٹ سل جائیں مگر جرأتِ اظہار رہے
دل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو!

ڈھل چکی رات تو اب کہر بھی چھٹ جائے گی
اب بھی اُمید کی لو کم نہ کرو دیوانو!
آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد
گلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

○
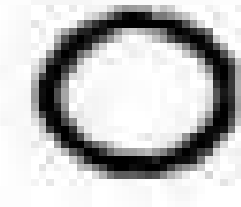
دل میں اب طاقت کہاں خونابہ افشانی کرے
ورنہ غم وہ زہر ہے پتھر کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریٔ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک دامانو! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسمِ گل ہے مگر بے رنگ ہے شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہمیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فراز
وہ تو سب کی بات سُن لے اور من مانی کرے

○
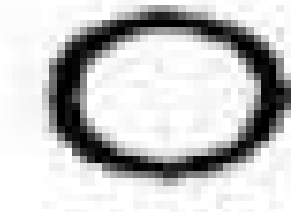
بے سر و ساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اِس سے پہلے شہر کے لٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنّا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آ مرے پہلو میں آ اے رونقِ بزمِ خیال
لذّتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کونسا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اُس حسن کے لیکن فرازؔ
اتنا کہتے ہیں رہینِ سرمہ و غازہ نہ تھا

○
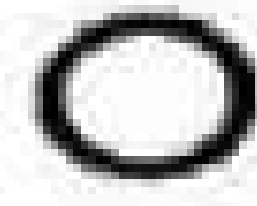
تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اُٹھی آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب کوئی ماہیٔ بے آب ہُوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اُٹھانے والے
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اٹھا، یا برسا

ابرو باراں کے خدا، جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فراز
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

○
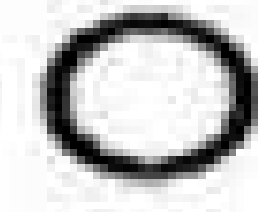
افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غمِ یار بہت ہو چکی بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہُوئی رُت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہُوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات معطّل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلا نوش و تہی جام ترس بھی

صیّاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومی جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

اے مرے بیدرد شہر

دل سلگ اُٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اس قدر ویران لمحے اس قدر سنسان رُت
سوچ میں گم ہیں افق سے تا افق پہنائیاں
کس لیے روشن کروں دیوار و در کوئی تو ہو
گنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

دور ہر شب جاگ اُٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں
راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل موجِ رنگ
جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخمِ نظّارہ لیے آنکھوں میں چپ تکتا رہا
گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اُڑی شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اُٹھی تھیں میری روح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لیے لَو دے اُٹھا تھا اِک چراغ
اور دمک اُٹھی تھیں کچھ لمحے مرے تنہائیاں
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے اِس قدر رسوائیاں؟

○
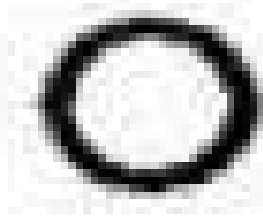
گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آ کر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اِس بستی کے سائے بھی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیا نادانی کی
اُس لمحے سے لیکر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فراؔز
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہو زور

○

پھر اسی راہگزر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم منتظر رہے اُن کو
مل گئے اور ہم سفر شاید

جان پہچان سے بھی کیا ہو گا
پھر بھی اے دوست غور کر! شاید

اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
چمک اُٹھے تری نظر شاید

زندگی بھر لہو رلائے گی
یادِ یارانِ بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فرازؔ
پھر بھی تُو انتظار کر شاید

○

اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مدّتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جُدا ہُوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دوریِ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فراز
دوست ملتے نہیں ضیا[1] جیسے

---

[1] ضیاالدین ضیا

تریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں
پل بھر کو چمک اُٹھے تھے آنسو
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر
جب میرے لیے ملول تھی تُو

کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا
ماضی کی طویل تلخیوں کا
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا
تُو! میرے لیے اُداس اتنی
کیا تھا یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اُداسیاں نہ آنسو
اِک طنز ہے تیری ہر ادا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو
یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تُو

O
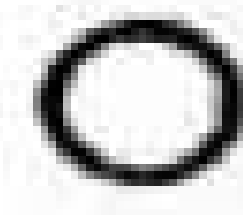
مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
لاکھ سمجھایا کہ اُس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی کیا کیجیے دل کا علاج
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اِس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کر گزرو کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اِس سے بڑھ کر طنز کیا ہو گا فرازؔ
اُس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانہ نہیں

○

تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

وہ دُور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دُکھوں کو لگا لیا دل سے
اِس آسرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اِس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فرازؔ راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

○
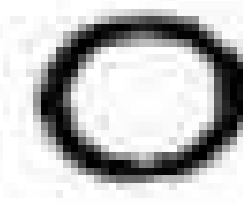
جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اُس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہُوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

○
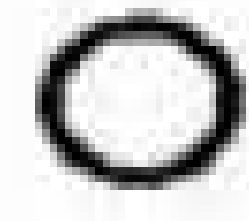
کسی کے تذکرے بستی میں کوبکو جو ہُوئے
ہمیں خموش تھے موضوعِ گفتگو جو ہُوئے

نہ دل کا درد ہی کم ہے نہ آنکھ ہی نم ہے
نہ جانے کون سے ارماں تھے وہ لہو جو ہُوئے

نظر اُٹھائی تو گم گشتۂ تحیّر تھے!
ہم آئینے کی طرح تیرے رُوبرو جو ہُوئے

ہمیں ہیں وعدۂ فردا پہ ٹالنے والے
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ جُو جو ہُوئے

فراؔز ہو کہ وہ فرہاد ہو کہ ہو منصور
انہیں کا نام ہے ناکامِ آرزو جو ہُوئے

مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا اس نے
شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو
ایک بے نام سی اُمید پہ اب بھی شاید
اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو

میں نے مانا کہ وہ بیگانۂ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں
شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دُکھ نہ رُلائے تجھے تنہائی میں

میں نے مانا کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے امید کی شمعیں ہوں کہ یادوں کے چراغ
مستقل بُعد بُجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مدّتیں درد کی لو کم تو نہیں کر سکتیں
زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتے ہیں
دُوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیماں ہو کر
تیرے پاس آئے زمانے سے کنارا کر لے
تو کہ معصوم بھی ہے، زود فراموش بھی ہے
اُس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے

اور میں، جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوٹے ہیں
اِسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

○

کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں، اب کہاں سے لاؤں اسے

مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ رُوٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو، گنواؤں اُسے

جو ہم سفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فرازؔ
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے
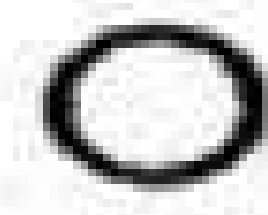
○

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فراؔز
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بھی رُلائیں ہم

○
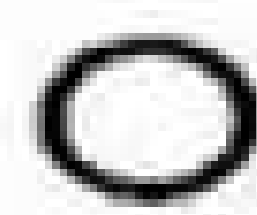
اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فرازؔ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بھی رُلائیں ہم

○
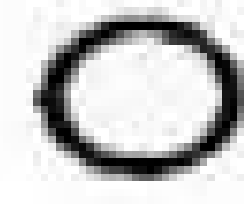
اُتری تھی شہرِ گُل میں کوئی آتشیں کرن
وہ روشنی ہُوئی کہ سلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اُتار دیے اپنے پیرہن

اِس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے
کچھ دُور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں
یہ اتفاق ہے کہ وہ یاد آ گئے معاً

جس کے طفیل مُہر بلب ہم رہے فرازؔ
اُس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ انجمن

کوئی بھٹکتا بادل

دُور اک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہُوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا

جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دل کی دُنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہُوا یاد آئے گا
اور اُس شہر کا بے فیض بھٹکتا بادل
درد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا

○
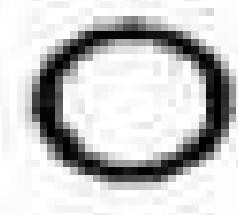
کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے
دل پر جس کا ہاتھ بھی رکھیو آخر وہ شمشیر بنے

غم کے رشتے بھی نازک تھے تم آئے اور ٹوٹ گئے
دل سا وحشی اب کیا سنبھلے اب کیا شے زنجیر بنے

اپنا لہو، تیری رعنائی تاریکی اِس دنیا کی
میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

اپنا یہ عالم ہے خود سے بھی اپنے زخم چھپاتے ہیں
لوگوں کو یہ فکر کہ کوئی موضوعِ تشہیر بنے

تم نے فرازؔ اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے
وہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالبؔ اور میرؔ بنے

○

اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو بات تمہیں پھیلاؤ گے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

ہجر کے ماروں کی خوش فہمی! جاگ رہے ہیں پہروں سے
جیسے یوں شب کٹ جائے گی جیسے تم آ جاؤ گے

زخمِ تمنّا کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے
اُس کا بھلانا سہل نہیں ہے خود کو بھی یاد آؤ گے

چھوڑو عہدِ وفا کی باتیں کیوں جھوٹے اقرار کریں
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا کل تم بھی پچھتاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فرازؔ سے واقف ہیں
جس نے خود سو زخم سہے ہوں اُس کو کیا سمجھاؤ گے

زندگی! اے زندگی

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی، اے زندگی
جب تلک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقچے
نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی
جسم کی گرتی ہُوئی دیوار کو تھامے ہُوئے
موم کے بُت آتشیں چہرے سُلگتی مُورتیں
میری بینائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی
میری تحریریں، دھوئیں کی رینگتی پرچھائیاں
جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی بے لہو!
محو ہو جانے تو دے یادوں سے خوابوں کی طرح
رُک تو جائیں آخری سانسوں کی وحشی آندھیاں
پھر ہٹا لینا مرے ماتھے سے تو بھی اپنا ہاتھ
میں بھی چُپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی

○
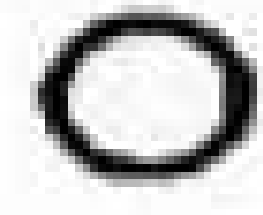
چند لمحوں کے لیے تُو نے مسیحائی کی
پھر وہی میں ہوں وہی عمر ہے تنہائی کی

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر، قیامت کی طرح
فرق اتنا ہے کہ ہم نے سخن آرائی کی

اپنی بانہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

غیرتِ عشق بجا، طعنۂ یاراں تسلیم
بات کرتے ہیں مگر سب اُسی ہرجائی کی

اُن کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فراز
اپنی دانست میں دل نے بڑی دانائی کی

○

زعم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھکرانا پڑے
یہ طبیعت ہے تو شاید جاں سے بھی جانا پڑے

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں
اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ پہچانا پڑے

رسم چل نکلی عجب اب میکدے کی خیر ہو
ہے وہی جمشید جس کے ہاتھ پیمانہ پڑے

سوچ لو اُس بزم سے اُٹھنے سے پہلے سوچ لو
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کر آنا پڑے

لے چلے ہیں حضرتِ ناصح مجھے جس راہ سے
لطف جب آئے اُدھر بھی کوئے جاناں نہ پڑے

غم ہی ایسا تھا کہ دل شق ہو گیا ورنہ فرازؔ
کیسے کیسے حادثے ہنس ہنس کے سہہ جانا پڑے

○

اب نہ فرصت ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے
ورنہ ہم روز ہی ملتے تھے صنم سے اپنے

دل نہ مانا کہ کسی اور کے رستے پہ چلیں
لاکھ گمراہ ہُوئے نقشِ قدم سے اپنے

جی چکے ہم جو یہی شوق کی رسوائی ہے
تم سے بیگانے ہُوئے جاتے ہیں ہم سے اپنے

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل اُن کی
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو دم سے اپنے

میرے دامن کے مقدّر میں ہے خالی رہنا
آپ شرمندہ نہ ہوں دستِ کرم سے اپنے

رہ چکے مرگِ تمنّا پہ بھی اک عمر فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو شعروں کے بھرم سے اپنے

یہ تو جب ممکن ہے......

پھر چلے آئے ہیں ہمدم لے کے ہمدردی کے نام
آہوئے رَم خوردہ کی وحشت بڑھانے کے لئے
میرے دل سے تیری چاہت کو مٹانے کے لیے

چھیڑ کر افسانۂ ناکامیٔ اہلِ وفا
تیری مجبوری کے قصّے میری بربادی کی بات
اپنی اپنی سرگزشتیں دوسروں کے تجربات

اُن کو کیا معلوم لیکن تیری چاہت کے کرم
میری تنہائی کے دوزخ میری جنت کے بھرم
تیری آنکھوں کا وفا آمیز افسردہ خیال

کاش اتنا سوچ سکتے غم گساروں کے دماغ
یہ تو جب ممکن ہے بُجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ
خود کو اِن میں دفن کر دوں بھول جاؤں اپنا نام

○

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا یقیں کہ بُرے ہم ہیں دوستو

کس کو ہمارے حال سے نسبت ہے کیا کہیں
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پُرنم ہیں دوستو

اپنے سوا ہمارے نہ ہونے کا غم کسے
اپنی تلاش میں تو ہمیں ہم ہیں دوستو

کچھ آج شام ہی سے ہے دل بھی بُجھا بُجھا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدھم ہیں دوستو

اِس شہرِ آرزو سے بھی باہر نکل چلو
اب دل کی رونقیں بھی کوئی دم ہیں دوستو

سب کچھ سہی فرازؔ پر اتنا ضرور ہے
دُنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں دوستو

○
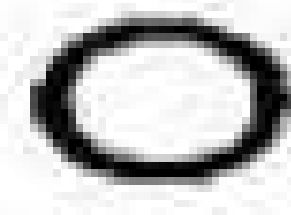
تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے
آج یاد آیا کہ آنسو بے سبب آنکھوں میں تھے

رات بھر تاروں کی صورت جاگتے رہنا ہمیں
صبحدم کہنا کہ کیا کیا خواب شب آنکھوں میں تھے

تیری یادوں کی مہک ہر درد کو بسرا گئی
ورنہ تیرے دکھ بھی اے شہرِ طرب آنکھوں میں تھے

اب تلک جن کی جُدائی کا قلق جی کو نہ تھا
آج تُو بچھڑا تو وہ بھی سب کے سب آنکھوں میں تھے

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ فرازؔ
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

○
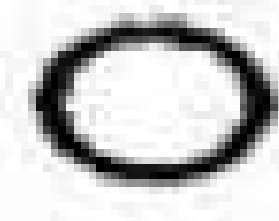
لمحے وفورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے
یوں چُپ ہیں تیرے پاس ہی جیسے نہ آئے تھے

ساقی شکستِ جام سے چہروں پہ دیکھنا
وہ رنگ بھی کہ شعلۂ مے سے نہ آئے تھے

دل پر لگی خراش تو چہرے شفق ہُوئے
اب تک تو زخم راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

پہلے بھی روئے ہیں مگر اب کے وہ کرب ہے
آنسو کبھی بھی آنکھوں میں جیسے نہ آئے تھے

جب صبح ہو چکی ہے تو کیا سوچنا فرازؔ
وہ رات کیوں نہ آئے تھے کیسے نہ آئے تھے

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
کے نام

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اِک بُوند نے طوفان اُٹھایا آخر
تم نے اِک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایّام
حریت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدّس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ امّید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہُوئی شعلۂ خورشید بنی

پیمبرِ مشرق

وہ شب کہ جس میں ترا شعلۂ نوا لپکا
ڈھلی تو ماتمِ یک شہرِ آرزو بھی ہُوا
وہ رُت کہ جس میں ترا نغمۂ جنوں گونجا
کٹی تو سازِ تمنّا لہُو لہُو بھی ہُوا

یہی بہت تھا کوئی منزلِ طلب تو ملی
کہیں تو مژدۂ قربِ حریمِ یار ملا
ہزار شکر کہ طعنِ برہنگی تو گیا
اگرچہ پیرہنِ شوق تار تار مِلا

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کے داغ دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہُوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس سے، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

مدبّروں نے وفا کے چراغ گُل کر کے
درازدستیِ جاہ و حشم کو عام کیا
مفکّروں نے فقیہوں کی دل دہی کے لیے
خودی کی مے میں تصوف کا زہر گھول دیا

وہ کم نظر تھے کہ نادان تھے کہ شعبدہ گر
جو تجھ کو جنّ و ملائک کا ترجماں سمجھے
تری نظر میں ہمیشہ زمیں کے زخم رہے
مگر یہ تجھ کو مسیحائے آسماں سمجھے

عروجِ عظمتِ آدم تھا مدّعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا اُبھارتے ہیں
کس آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

○
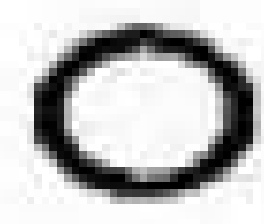
اِسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں
کہ تجھ کو صبحِ قیامت سے پیشتر دیکھوں

اِس اک چراغ کی لَو چبھ رہی ہے آنکھوں میں
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھو

مجھے خود اپنی طبیعت پہ اعتماد نہیں
خدا کرے کہ تجھے اب نہ عمر بھر دیکھوں

صدائے غولِ بیاباں نہ ہو یہ آوازہ
مرا وجود ہے پتّھر جو لوٹ کر دیکھوں

نظر عذاب ہے پاؤں میں ہو اگر زنجیر
فضا کے رنگ کو دیکھوں کہ بال و پر دیکھوں

جُدا سہی مری منزل بچھڑ نہیں سکتا!
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہم سفر دیکھوں

وہ لب فرازؔ اگر کر سکیں مسیحائی
بقولِ دردؔ میں سو سو طرح سے مر دیکھوں

○

(بطرزِ بیدلؔ)

جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دل کشائے زخم ہے
جو نظر اُٹھتی ہے گویا آشنائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتل، دلفگارانِ وفا
التفاتِ تیغِ قاتل خوں بہائے زخم ہے

بسکہ جوشِ فصلِ گل سے کھل گئے سینوں کے چاک
خندۂ گل بھی ہم آہنگِ صدائے زخم ہے

ہم نفس! ہر آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیا
ہم کو پاسِ خاطرِ یاراں بجائے زخم ہے

آ تماشا کر کبھی اے بے نیازِ شامِ غم
دیدۂ بے خواب بھی چاکِ قبائے زخم ہے

کس سے جز دیوارِ مژگاں، سیلِ دردِ دل رُکے
ساحلِ دریائے خوں لب آشنائے زخم ہے

ضبطِ گریہ، چشم خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا
رہ گیا تھا دل میں جو آنسو بنائے زخم ہے

شعلۂ افسردگی ہے شمعِ فانوسِ خیال
داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اب تو دامن تک پہنچ آیا سرِ چاک جنوں
ہم تو سمجھے تھے کہ بس دل انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رُستگاری ہے کسے!
دل ہلاکِ ناوک و ناوک فدائے زخم ہے

چارہ گر نے بہرِ تسکیں رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ
مہرباں ہے وہ مگر ناآشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہوئی رسوائے عریانی فرازؔ
کل بدن پر پیرہن تھا اب ردائے زخم ہے

المیہ

کس تمنّا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے
ساتھ اپنے لیے اس شہر کو جاؤں گا جسے
مجھ کو چھوڑے ہُوئے بھولے ہُوئے اک عمر ہوئی

ہائے وہ شہر کہ جو میرا وطن ہے پھر بھی
اُس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ
میرا دل میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنزِ جگر سوز تو دیکھ
تو مرے شہر کے اک حجلۂ زرّیں میں مکیں
اور میں پردیس میں جاں دادۂ یک نانِ جویں

ملکیت

سسکیاں لینے سے کیا فائدہ اے زینتِ شب
دیکھ اس ہنستی ہوئی رات کو افسردہ نہ کر
تیرا رونا تجھے تسکین تو دے سکتا ہے
لیکن اس انجمنِ عیش کو آزردہ نہ کر

مجھ پہ روشن ہے ترے سوئے ہوئے درد کی آگ
جبر کی بادہ گساری سے بھڑک اُٹھی ہے
تیری کچلی ہوئی غیرت تری روندی ہوئی رُوح
اک حقارت بھری ٹھوکر سے پھڑک اُٹھی ہے

اور یہ توہین ترے جسم کی توہین نہ تھی
ورنہ یہ زہر تو ہنس ہنس کے پیا ہے تُو نے
وقفِ گردش رہی ساغر کی طرح دست بدست
بزم کی بزم کو سرشار کیا ہے تُو نے

تُو نے ہر جلتی ہُوئی روح کو گلزار کیا
تُو ہر اک ہاتھ میں غنچے کی طرح چٹکی ہے
تُو نے ہر دوش پہ بکھرائی ہیں اپنی زُلفیں
تُو ہر آغوش میں خوشبو کی طرح بھٹکی ہے

مگر امشب ترے احساس پہ وہ چوٹ پڑی
تلخ فاقوں کی اذیت بھی بھلا دی جس نے
تیرے کردار کے صحرا سے وہ آندھی اُٹھی
فکرِ فردا کی بھی دیوار گرا دی جس نے

تجھ کو معلوم نہیں ہے مگر اے دشمنِ جاں
اس تجارت سے عبارت تری شخصیت ہے
جسم سے لے کے تری روح تلک آج کی رات
یا مری یا مرے احباب کی ملکیت ہے

○
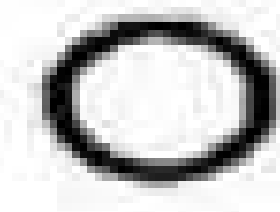
منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے، پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جُوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جُوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اُسے شدّت سے چاہا ہے فرازؔ
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

O

اہلِ غم جاتے ہیں نا اُمید تیرے شہر سے
جب نہیں تجھ سے تو کیا امید تیرے شہر سے

دیدنی تھی سادگی ان کی جو رکھتے تھے کبھی
اے وفا نا آشنا اُمید تیرے شہر سے

تیرے دیوانوں کے حق میں زہرِ قاتل ہو گئی
نا اُمیدی سے سوا اُمید تیرے شہر سے

پا بجولاں دل گرفتہ پھر رہے ہیں کُو بکُو
ہم جو رکھتے تھے سوا اُمید تیرے شہر سے

تُو تو بے پرواہی تھا اب لوگ بھی پتّھر ہُوئے
یا ہمیں تجھ سے تھی یا اُمید تیرے شہر سے

راستے کیا کیا چمک جاتے ہیں اے جانِ فرازؔ
جب بھی ہوتی ہے ذرا امید تیرے شہر سے

تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد
قربتِ یک نفس نصیب ہوئی
پھر بھی تو چُپ، اداس، کم آمیز

اے سُلگتے ہُوئے چراغ بھڑک
درد کی روشنی کو چاند بنا
کہ ابھی آندھیوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صلہ
اجنبیت کے زہر میں مت گھول
مجھ کو مت دیکھ لیکن آنکھ تو کھول

○

آنکھوں میں چبھ رہے ہیں در و بام کے چراغ
جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کس کام کے چراغ

کیا شام تھی کہ جب ترے آنے کی آس تھی
اب تک جلا رہے ہیں ترے نام کے چراغ

شاید کبھی یہ عرصۂ یک شب نہ کٹ سکے
تو صبح کی ہوا ہے تو ہم شام کے چراغ

اِس تیرگی میں لغزشِ پا بھی ہے خودکشی
اے رہ نوردِ شوق ذرا تھام کے چراغ

ہم کیا بجھے کہ جاتی رہی یادِ رفتگاں
شاید ہمیں تھے گردشِ ایّام کے چراغ

ہم درخورِ ہَوائے ستم بھی نہیں فرازؔ
جیسے مزار پر کسی گمنام کے چراغ

○
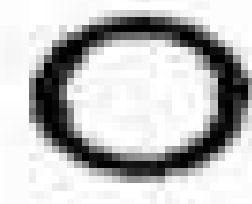
نظر کی دھوپ میں سائے گھُلے ہیں شب کی طرح
میں کب اداس نہیں تھا مگر نہ اب کی طرح

پھر آج شہرِ تمنا کی رہگزاروں سے!
گزر رہے ہیں کئی لوگ روز و شب کی طرح

تجھے تو میں نے بڑی آرزو سے چاہا تھا
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تو بھی اور سب کی طرح

فسردگی ہے مگر وجہِ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنجِ بے سبب کی طرح

کِھلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن
نہ میرے زخم کی صورت، نہ تیرے لب کی طرح

○

ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چمنی تھی
وہ گل کی چٹک تھی کہ تری کم سخنی تھی

آنسو کی وہ اک بوند جو آنکھوں سے نہ ٹپکی
آئینۂ دل کے لیے ہیرے کی کنی تھی

پیمانے کو ہم منہ سے لگاتے نہ لگاتے
ساقی کی ملاقات ہی توبہ شکنی تھی

اب صورتِ دیوار ہیں چپ چاپ کہ تجھ سے
کچھ اور تعلّق نہ سہی ہم سخنی تھی

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں
اوروں کے لیے سایۂ دیوار بنی تھی

دنیا سے بچھڑتے کہ فرازؔ اُن کو بھلاتے
ہر حال میں اپنے لیے پیماں شکنی تھی

نیند

سرد پلکوں کی صلیبوں سے اتارے ہُوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح
جن کے ٹکڑوں کی چبھن، جن کی خراشوں کی جلن
عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے
شدّتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

آج اِس قرب کے ہنگام وہ احساس کہاں
دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں چراغوں کا دھواں
اور صلیبوں سے اتارے ہُوئے خوابوں کی مثال
جسم گرتی ہُوئی دیوار کی مانند نڈھال
تو مرے پاس سہی اے مرے آزردہ جمال

خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات شرمندہ نہ کر
دُوریاں، مجبوریاں، رُسوائیاں، تنہائیاں
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سسکیاں، شہنائیاں
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم ہے موضوعِ نظر

وقت کی رَو میں ابھی ساحل ابھی موجِ فنا
ایک جھونکا، ایک آندھی، اک کرن، اک جوئے خوں
پھر وہی صحرا کا سنّاٹا وہی مرگِ جنوں
ہاتھ ہاتھوں کا اثاثہ، ہاتھ ہاتھوں سے جُدا

جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جُدائی کا سماں
ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر
بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم یہ خوشبو کا سفر

اب کے برس بھی

لب تشنہ و نومید ہیں ہم اب کے برس بھی
اے ٹھہرے ہُوئے ابرِ کرم اب کے برس بھی
کچھ بھی ہو گلستاں میں مگر کنجِ چمن سے
ہیں دور بہاروں کے قدم اب کے برس بھی
اے شیخِ کرم! دیکھ کہ باوصفِ چراغاں
تیرہ ہیں در و بامِ حرم اب کے برس بھی
اے دل زدگاں! خیر مناؤ کہ ہیں نازاں
پندارِ خدائی پہ صنم، اب کے برس بھی

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایّام
ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی

لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسّم
ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی

ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی

پہلے کی طرح ہوں گے تہی جامِ سفالیں
چھلکے گا ہر اک ساغرِ جم اب کے برس بھی

مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم، اب کے برس بھی

○

تجھ سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم
بے مروّت نہیں تو کیا ہیں ہم

ہم غمِ کارواں میں بیٹھے تھے
لوگ سمجھے شکستہ پا ہیں ہم

اس طرح سے ہمیں رقیب ملے
جیسے مُدّت کے آشنا ہیں ہم

راکھ ہیں ہم اگر یہ آگ بجھی
جز غمِ دوست اور کیا ہیں ہم

خود کو سُنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

کیوں زمانے کو دیں فرازؔ الزام
وہ نہیں ہیں تو بے وفا ہیں ہم

○
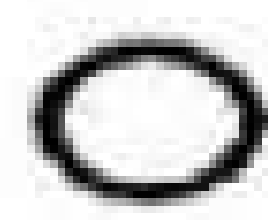
تجھے اداس کیا خود بھی سوگوار ہُوئے
ہم آپ اپنی محبت سے شرمسار ہُوئے

بلا کی رَو تھی، ندیمانِ آبلہ پا کو!
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہُوئے

گلہ اُسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا
وگرنہ یوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہُوئے

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غمگسار ہُوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فرازؔ پشیماں ہر ایک بار ہُوئے

....اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہو گا ترازو ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم
جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنگِ خلقت، بے غمِ تیغِ ستم
اپنے اپنے شوقِ بے پروا کی باراتیں لیے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم
اُن میں ہر اک باوفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

اُن کی آنکھیں ریزہ ریزہ اُن کی جانیں زخم زخم
اُن کے آنسو کانچ کے تابوت ریشم کے کفن
اُن میں خوابیدہ کسی لیلا کسی شیریں کا خواب
اُن میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
اُن کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
اُن کے ہاتھوں کی لکیروں میں جوانمرگوں کا فن
اُن میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنّا کا اسیر

اُن پہ جو گزری وہ گزرے گی ہر اہلِ درد پر
اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تیری پیشانی کی سج دھج، میری چاہت کا غرور
گویہ وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں
پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخشش ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں ان دیکھے دیاروں کے سفیر

○

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہُوئے پھُول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہُوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشّہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

○

اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
اُس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید اُبھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اُترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا
اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلّق تھا مگر جاں پہ بنی تھی!
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

اس شہرِ تمنّا سے فرازؔ آئے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

○
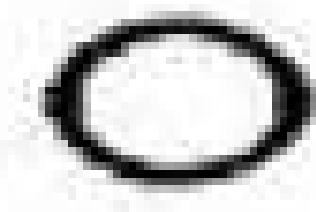
ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جُدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وہ کپکپاتے ہُوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو

چیخ اُٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم، تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

یہ اور بات کہ اکثر دمک اُٹھا چہرہ
کبھی کبھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو

یہ قربتیں ہی تو وجہِ فراق ٹھہری ہیں
بہت عزیز ہیں یارانِ بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اُسے فرازؔ اگر دُکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

○
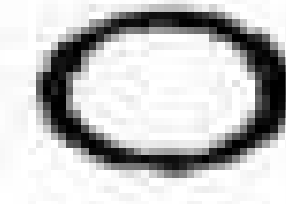
کسی طرح تو بیاں حرفِ آرزو کرتے
جو لب سِلے تھے تو آنکھوں سے گفتگو کرتے

بس ایک نعرۂ مستاں دریدہ پیرہنو
کہاں کے طوق و سلاسل بس ایک ہُو کرتے

کبھی تو ہم سے بھی اے ساکنانِ شہرِ خیال
تھکے تھکے ہُوئے لہجے میں گفتگو کرتے

گلوں سے جسم تھے شاخِ صلیب پر لرزاں
تو کس نظر سے تماشائے رنگ و بُو کرتے

بہت دنوں سے ہے بے آب چشمِ خوں بستہ
وگرنہ ہم بھی چراغاں کنارِ جُو کرتے

یہ قربِ مرگِ وفا ہے اگر خبر ہوتی
تو ہم بھی تجھ سے بچھڑنے کی آرزو کرتے

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیمِ بہار
مثالِ برگِ خزاں تیری جستجو کرتے

ہزار کوس پہ تُو اور یہ شامِ غربت کی
عجیب حال تھا پر کس سے گفتگو کرتے

فرازؔ مصرعۂ آتش پہ کیا غزل کہتے
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

میں اور تُو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہوا بڑھتا ہُوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا اِستادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی
کون دیوار ہمیشہ مگر اِستادہ رہی
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ وگل وخشت کے ملبے کے تلے
اُسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

○
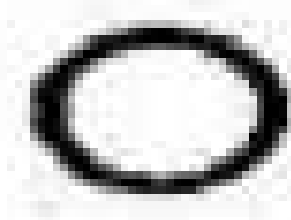
کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اُس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

اِس چکا چوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اُس کے ہوتے ہُوئے پلکوں کو جُھکائے رکھنا

افریشیائی ادیبوں کے نام

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل
ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں
دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں
ہزار لفظ و بیان و زباں کا فرق سہی
مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وہ ماؤ ہو کہ لوممبا' سکارنو ہو کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک بسمل
سبھی ہیں دور نظر سے سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سراندیپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سورج تراشنے والے
مگر ہماری زمیں نور کو ترستی ہے
یہ کیا کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اُٹھے
وہ دُور پار سمندر پہ جا برستی ہے

فلک سے اب نہیں اُترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدم و حوّا سنوارنے کے لیے
یہاں محمدؐ و گوتم، مسیح و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرق شبِ دراز لیے

ہمیں کو توڑنے ہوں گے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہوگا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطۂ تیرہ اُجالنا ہو گا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہو گا

O
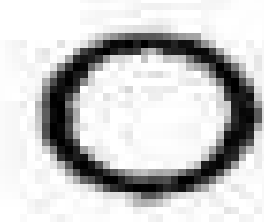
میں کہ پُرشور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سُوکھے ہُوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمنّاؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کِسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

نایافت

انتساب

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

”گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست“

ترتیب

دیباچہ

یہ قصہ پُرانا ہے
جب بعض ہونٹوں نے چاہا
کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں
تو خود اُن کو زہراب پینا پڑا تھا
کہ اہلِ حکم کو یہ ڈر تھا
یہ الفاظ
آواز کی زندگی سے
کوئی داستاں بن نہ جائیں
......اور وہ ہونٹ چپ ہو گئے تھے
سسکتے تڑپتے ہُوئے لفظ
قاتل کی شمشیر سے نیم جاں
مدّتوں تک فراقِ صدا میں
دھڑکتے رہے ہیں

کسے کیا خبر تھی

کہ ان بسملوں کا لہو..... قطرہ قطرہ

• لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا

اور اب یہ

لہو کی لکیریں

بجائے خود اک داستاں بن گئی ہیں

○

ہُوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

مری مثال کہ اک نخلِ خشک صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تُو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تُو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تُو

فضا اُداس ہے رُت مضمحل ہے میں چپ ہُوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تُو

فرؔاز تُو نے اُسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تُو

وفا پرست صلیبیں

وہ دن بھی یاد ہیں مجھ کو کہ جب مری دنیا
کہاں کے جسم، کہ سایوں کو بھی ترستی تھی
پھرا ہوں کوچہ بہ کوچہ متاعِ درد لئے
اگرچہ خلق مری سادگی پہ ہنستی تھی

سدا جلاتی رہی ہے مجھے یہ محرومی
وہی تھا میں وہی صحرائے آرزو کے سراب
کوئی نہ تھا کہ میں جس کے حضور نذر کروں
یہ آنسوؤں کے چراغاں یہ شاعری کے گلاب

یہ زخم وہ تھے جو فن کے لئے چراغ بنے
مرا شریکِ سفر بس مرا شعور رہا
کسی سے کر نہ سکا دردِ نارسا کا گلہ
وہ روز و شب تھے کہ تنہائیوں سے چور رہا

رہِ طلب میں پھر اک یہ مقام بھی آیا
کہ دل گرفتہ ہے تُو میری زندگی کے لئے
میں دیکھتا ہوں کہ تیری اداس آنکھوں میں
وفا کی آنچ لئے ہیں عقیدتوں کے دیے

کسے عزیز نہ ہو گی تری طلب کی لگن
ہزار دل پہ پڑی ہو غمِ زمانہ کی دھول
کسے غرور نہ ہو گا اگر تری چاہت
کھلائے دشتِ تمنا میں التفات کے پھول

○
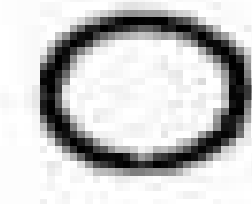
عجیب رُت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
بہت ملول تھا میں بھی اُداس تھا وہ بھی

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اُس کو بھول چکے
مگر گمان تھا یہ بھی قیاس تھا وہ بھی

کہاں کا اب غمِ دنیا کہاں کا اب غمِ جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ بھی راس تھا وہ بھی

فرازؔ تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اُسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اُس کو سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصّے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنہیں میری آرزو تھی مری طلب تھی
کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلّق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اُن میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا

مگر اُنہیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدن سے سُنا رہا تھا
مگر وہ پتّھر بنی
مجھے اِس طرح سے سُنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کسی مقدّس تریں صحیفے کی آیتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں
کہ تیری اُداس ادھوری
محبتوں کی کہانیاں
جو بڑی کشادہ دلی سے
ہنس ہنس کے سُن رہا تھا
وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
باوفا و ثابت قدم
کہ جس کی جبیں پہ
ظالم رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کربناک شدّت سے
دل ہی دل میں
خموش، چُپ چاپ
مر گیا ہے

○
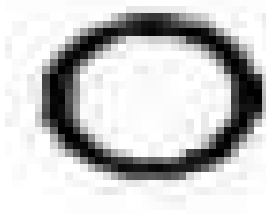
ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اُسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی انداز مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اُسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہُوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے رُلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

فرازؔ خواب سی دُنیا دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہُوئے فسانہ وہ

کونسا نام تجھے دُوں؟

یوں بھی گزری ہے کہ جب درد میں ڈوبی ہوئی شام
گھول دیتی ہے مری سوچ میں زہرِ ایاّم
زرد پڑ جاتا ہے جب شہرِ نظر کا مہتاب
خون ہو جاتا ہے ہر ساعتِ بیدار کا خواب
ایسے لمحوں میں عجب لطفِ دل آرام کے ساتھ
مہرباں ہاتھ ترے ریشم و بلّور سے ہاتھ

اپنے شانوں پہ مرے سر کو جھکا دیتے ہیں
جس طرح ساحلِ اُمید سے بے بس چہرے
دیر تک ڈوبنے والے کو صدا دیتے ہیں

یوں بھی گزری ہے کہ جب قرب کی سرشاری میں
چمک اُٹھتا ہے نگاہوں میں ترے حُسن کا شہر
نہ غمِ دہر کی تلچھٹ نہ شبِ ہجر کا زہر
مجھ کو ایسے میں اچانک ترا بے وجہ سکوت

کوئی بے فیض نظر یا کوئی تلوار سی بات
ان گنت درد کے رشتوں میں پرو دیتی ہے
اس طرح سے کہ ہر آسودگی رو دیتی ہے

کونسا نام تجھے دوں مرے ظالم محبوب
تُو ہی قاتل ہے مرا تُو ہی مسیحا میرا

○
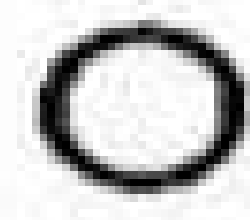
تیرے قریب آ کے بڑی اُلجھنوں میں ہُوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہُوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہُوں

تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درد میں ابھی انہیں گہرائیوں میں ہُوں

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اُداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہُوں

تو لُوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
میں لُٹ کے بھی وفا کے انہی قافلوں میں ہُوں

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود ہی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
اور خود فرازؔ اپنے تماشائیوں میں ہوں

تخلیق

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں
زخمِ دل جاگ سکے نشترِ غم رقص کرے
جو بھی سانسوں میں گھُلا ہے اُسے عریاں نہ کرو
چپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزام دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہُوئے بُت
جذبۂ کاوشِ خالق کو نگونسار کریں
مُوقلم حلقۂ ابرو کو بنا دے خنجر
لفظ نوحوں میں رقمِ مدحِ رخِ یار کریں
رقصِ مینا سے اُٹھے نغمۂ رقصِ بسمل
ساز خود اپنے مغنّی کو گنہگار کریں

مرہمِ اشک نہیں زخمِ طلب کا چارہ
خوں بھی رووٴ گے تو کس خاک کی سج دھج ہو گی
کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر
جو بھی دیوار اُٹھاوٴ گے وہی کج ہو گی
کوئی پتّھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
جو بھی تصویر بناوٴ گے اپاہج ہو گی

یہ کیسی رُت ہے

یہ کیسی رُت ہے
کہ ہر شجر
صحنِ گلستاں میں
ملول و تنہا سلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیرِ پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں تو پھر لوٹ کر نہ آئیں
یہ کیسی رُت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پر
سپیدۂ صبح کا گماں ہو
نہ فصلِ گُل ہے

کہ ہر طرف شورِ جانفروشاں سے

کوئے محبوب کا سماں ہو

نہ دور پت جھڑ کا ہے

کہ بے جان کونپلوں کو

اُمیدِ فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رُت ہے

کوئی تو بولے

کوئی تو دھڑکے

کوئی تو بھڑکے

○
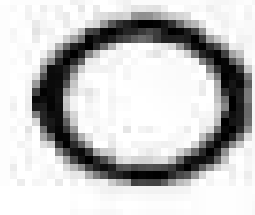
آنکھ سے دُور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اُچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فرازؔ
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا
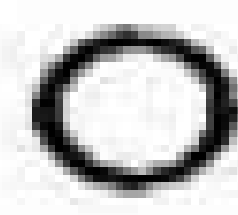
○

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے بھی دل نذر کیا جاں واری ہے

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حَشَم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چُوم کے چھوڑ گئے دیکھا کہ یہ پتّھر بھاری ہے

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلّاد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہلِ ہوس یہ بھول گئے
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

(جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء)

○
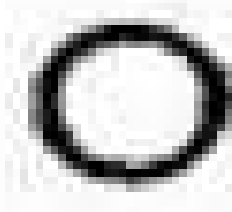
اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا چاہیے
بول اے ہوائے شہر! کدھر جانا چاہیے

کب تک اُسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی اُدھر جانا چاہیے

وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اُتر جانا چاہیے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمنّا کہیں ملے
ہے دل تہی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیے

یا اپنی خواہشوں کو مقدّس نہ جانتے
یا خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے

گئی رُت

پھر آ گئی ہے، گئی رُت تمہیں خبر بھی نہیں
خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ جگر
نشستہ ہے سرِ دہلیز کوئی بام نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمہارے جاتے ہی
فلک کا چاند، زمیں کے گلاب راکھ ہُوئے
وہ راکھ خواب ہُوئی پھر وہ خواب راکھ ہُوئے
تم آ سکو تو میں سمجھوں تمہارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر اک ستارۂ مژگاں سے ماہتاب بنے
برس فراق کا جیسے وصال کا پل تھا

کردار

ہم ابھی ایستادہ تھے
اب سے کچھ پہلے
وفا کے فرش پائندہ پہ
خوش وقتی کے رنگیں شامیانوں کے تلے
اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں لیے
آندھیوں میں زلزلوں میں
تا قیامت ساتھ دینے کے لئے
آمادہ تھے
اک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل
یار بھی اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت، برہمی

چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
جم گئے سائے اُدھر
اور کانپ اُٹھی اس طرف دیوار بھی
دشمنوں کو بھی یقیں
اور بدگماں کچھ ہمنشیں ...... غمخوار بھی
دیکھنے والوں نے دیکھا

کس طرح صدیاں اچانک
ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانیوں کی طنابیں کٹ گئیں

بجھ گئیں شمعیں قرار و قول کی
فرشِ وفا کی سخت و پائندہ سلیں بھی پھٹ گئیں
اور دو پیکر
خود اپنے خنجروں کے وار سے
خاک و خوں میں تر بتر
فرش پر افتادہ تھے
ہم ابھی ایستادہ تھے

○
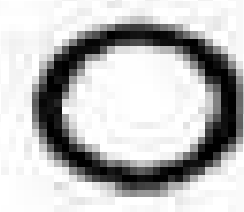
نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے ہیں لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گِلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہم سفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لئے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں، مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنّا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روز نا جرمن نژاد

روز نا جرمن نژاد

اس کے ہونٹوں میں حرارت

جسم میں طوفاں

برہنہ پنڈلیوں میں آگ

نیّت میں فساد

رنگ و نسل و قامت و قد

سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز

ہر کسی سے بے تکلّف ایک حد تک دلنواز

وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس

عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس

روز نا جرمن نژاد

اور دیکھنے والوں میں سب

اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میکساری کے سبب
پیکرِ تسلیم و سرتاپا طلب
ان میں ہر اک کی متاعِ کُل
بہائے التفاتِ نیم شب

روزنا جرمن نژاد
اور اس کا دل......زخموں سے چُور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دُور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خوں
ہر چاند سے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بُت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور
کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستک خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی

چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرتِ تعمیر بھی
الوداعی شام، آنسو، عہد و پیماں
مضطرب صیاد بھی نخچیر بھی
کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا
نو مید چاہت کا غرور

روز نا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی چہرے پر اُداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سُو
تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روز نا مرمر کا بُت
اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت

سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا
ایک ہی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس
اس آنکھوں میں تجسس اور بس

○
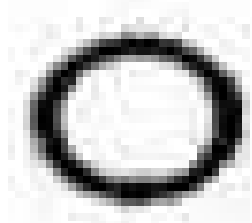
بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

بہارِ خوں سے چمن زار بن گئے مقتل
جو نخلِ دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

فرازؔ سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

فضا نورد بادل

میں سایۂ نخل میں کھڑا تھا
جب ایک فضا نورد بادل
لہراتا ہُوا نظر پڑا تھا

یوں قلب و جگر سے آگ اُٹھی
برسوں کی طویل تشنہ کامی
یکلخت ہی جیسے جاگ اُٹھی

پل بھر میں بدن دہک رہا تھا
میں سایۂ نخل سے نکل کر
بادل کی طرف لپک رہا تھا

بادل تھا سمندروں کا پیاسا
یہ اس کا کرم کہ چند لمحے
وہ مجھ کو بھی دے گیا دلاسا

دل پر لئے داغِ نامرادی
چاہا کہ پلٹ چلوں ادھر ہی
جس سمت سے درد نے صدا دی

دیکھا تو رُت بھی جا چکی تھی
مایوس کن انتظار کی دھوپ
اس نخلِ وفا کو کھا چکی تھی

○
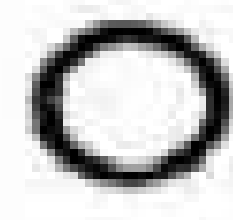
کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فرازؔ اور اُسے حالِ دل سنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اُسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لئے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے ارے زمانے جا

بہت ہے دولتِ پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے رُوٹھ چکا ہے اُسے منانے جا

سُنا ہے اُس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فرازؔ تو بھی مقدّر کو آزمانے جا

○
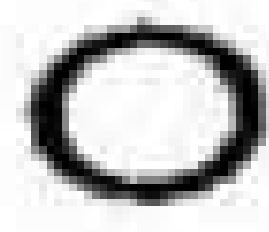
نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
ہمیں کو شوق رہا راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبیٔ قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

میں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ نکلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر سہی پر نگاہِ لطف کے بعد
فرازؔ دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا

فصلِ رائیگاں

زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں
تو دریدہ دل میں آشفتہ بیاں
زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں

رائیگاں ہر درد کے سورج کی دھوپ
آبلے ہاتھوں کے ماتھوں کا عرق
گیسوؤں کے ابر ہونٹوں کی شفق
میرے دل کی آگ تیرا رنگ روپ

رائیگاں خونِ وفا کی ندیاں
کشتِ بے حاصل کا حاصل بے نشاں
آنسوؤں کی جھیل دوپہروں کی لُو
جسم شل احساس مردہ دل لُہو

چار جانب ریت کے ٹیلے رواں
کوئی نوحہ گر نہ کوئی چشمِ نم
صرف ہم تو بھی کہاں میں بھی کہاں
جیسے ویرانے میں لاشیں بے اماں

بے کفن، بے گور، رزقِ کرگساں
اور یہ یادیں بھی کچھ لمحوں کی ہیں
جس طرح صحرا میں قدموں کے نشاں
جس طرح تعزیتی خاموشیاں

سلامتی کونسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
میرے غمخوار اُسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گسترو فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہ زناں ''امن و مساوات کی خیر''
زر کی میزان میں رکھے ہُوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اُڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اُسے
مرہمِ وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدۂ پُرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمر کوریا ویت نام دومنکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ ملا

قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو

کجکلاہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری

اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو

دم ہو بازو میں تو ہر ضربِ جنوں ہے کاری

اس جزیرہ میں کہیں نور کا مینار نہیں

جس کے اطراف میں اک قلزمِ خوں ہے جاری

"جوہرِ جامِ جم از کانِ جہانِ دگراست

تُو توقّع زگلِ کوزہ گراں می داری"

نوحہ گر چُپ ہیں

نوحہ گر چپ ہیں کہ روئیں بھی تو کس کو روئیں
کوئی اس فصلِ ہلاکت میں سلامت بھی تو ہو
کونسا دل ہے کہ جس کے لئے آنکھیں کھولیں
کوئی بسمل کسی شب خوں کی علامت بھی تو ہو

شکر کی جا ہے کہ بے نام و نسب کے چہرے
مسندِ عدل کی بخشش کے سزاوار ہُوئے
کتنی تکریم سے دفنائے گئے سوختہ تن
کتنے اعزاز کے حامل یہ گنہگار ہُوئے

یوں بھی اس دور میں جینے کا کسے تھا یارا
بے نوا بازوئے قاتل سے گلہ مند نہ ہوں
زندگی یوں بھی تو ''مفلس کی قبا'' تھی لیکن
دلفگاروں کے کفن میں بھی تو پیوند نہ ہوں

ناوکِ ظلِّ الٰہی اجل آہنگ سہی
شکر کی جا ہے کہ سونے کی اَنی رکھتے ہیں
جاں گنوائی بھی تو کیا مدفن و مرقد تو ملا
شاہِ جم جاہ طبیعت تو غنی رکھتے ہیں

○
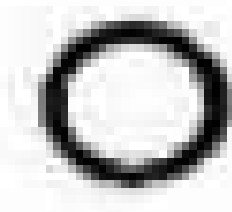
گزرا ہوں جس طرف سے بھی پتّھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

لو ہو چکی شفا کہ مداوائے دردِ دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تابکے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اے بدنصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا مقدّر لگے مجھے

منزل کہاں کی زادِ سفر کو بچائیو!
اب رہزنوں کی نیّتِ رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی
ایسی خموشیوں سے مگر ڈر لگے مجھے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فرازؔ
خود سا گناہگار پیمبر لگے مجھے

○

مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہوئی ہے پتّھر کی

رواں ہے قلزمِ خوں اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اُجاڑ پیڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجُو کو ہوس پی گئی سمندر کی

فقیہہِ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سُنا رہا ہے ہمیں آیتیں مقدّر کی

خود اپنے خوں میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتّھر کی

وہ ایک شخص کہ سورج کے روپ میں آیا
چرا کے لے گیا شمعیں فرازؔ ہر گھر کی

قاتل

قاتل چُپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اُسے
گھیرے میں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل

اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر
کب سُنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے
کس کو قتل کیا ہے؟

نہیں ہے یوں

نہیں ہے یوں کہ مرا دُکھ مری حدود میں ہے
نہ صرف دل ہی دریدہ نہ صرف جاں ہی فگار
نہ صرف دیکھتی آنکھوں میں حسرتوں کا دھواں
نہ صرف ہاتھ شکستہ نہ سر پہ زخم ہزار

جو یوں بھی ہو تو بڑی بات ہے تری قربت
تری وفا تری چاہت تری مسیحائی
ہر ایک زخم کو دھو دے شفیق ہاتھوں سے
ہر ایک درد کو چن لے تری دل آرائی

مگر یہ درد یہ دُکھ کب مری حدود میں ہے
کہاں نہیں مرا پیکر کہاں نہیں یہ فغاں
تُو اک وجود کو زندہ تو کر چکی لیکن
ہر اک صلیب پہ میرا ہی جسم آویزاں

ہر ایک تیرِ ستم پر مرا لہو لرزاں
کسے کسے تُو بچائے گی اے مری درماں

○

مزاج ہم سے زیادہ جُدا نہ تھا اُس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اُس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اُسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

وہ برق رَو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اُس کا

چلو یہ سیلِ بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اُس کا، خدا اُس کا، ناخدا اُس کا

یہ اہلِ درد بھی کس کی دُہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اُس کا

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فرازؔ
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

O
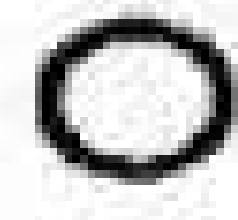
چلو اُسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اُسی کے درد سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اُسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہگزر پہ جو شمعیں دمکتی جاتی ہیں
اُسی کا قامتِ زیبا ہے چال جو بھی ہو

فرازؔ اس نے وفا کی کہ بے وفائی کی
جوابدہ تو ہمیں ہیں سوال جو بھی ہو

ادھر کچھ دور بُز غالوں کے گلے
نو جواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا...... سحر آفریں دنیا
''مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را''
ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ میں دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اُس پَل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حُوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے

نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گُم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہُوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
کبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں خمیدہ
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پا کوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے...... مجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اُٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں

ادھر کچھ دور بزغالوں کے گلے

نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت

برف سے شفاف و دل آرا

فضا حیرت فزا...... سحر آفریں دنیا

''مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشارا''

ہمارا میزباں مفلس تھا

لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر

ہم خس بدنداں تھے

کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں

بطک میں آبِ تاک

اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے

الاؤ میں دہکتی آگ

کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر ۱۳ اپریل کے تھے

جب کافرستاں کی جواں پریاں

زمینی خلد کی حوریں

دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں

اپنے محبوبوں کی فرقت کے

نشیلے گیت گائیں گی

الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت

ہم میں ہر اک

اس طلسماتی فضا کے سحر میں گُم تھا

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

سیہ ملبوس میں لپٹے ہُوئے

مرمر کے بُت

مہتاب سے پیکر

سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت

کماں کی شکل میں جُنباں

کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں

وحشت سے پا کوباں

دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں

آہستہ آہستہ

کھنکتے قہقہے...... مجوب آوازیں بھی

شامل ہو گئیں آخر

کہ جیسے نقرئی گھنگرو

اچانک جھنجھنا اُٹھیں

سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں

ہر اک فتنہ گرِ دوراں

مگر وہ سرگروہِ نازنیناں

غیرتِ ناہید

جانِ حلقۂ خوباں

کشان بی بی

قدوقامت قیامت

جُنبشیں جادو

بدن طوفاں

ضیا کردار میں گوتم

مجسّم صدق وایثار و وفا

درد آشنا و نفس کُش ہمدم

لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا

مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں

مگر باسط جو اک فنکار

لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم

قلم اس کا دُرافشان و گہر تحریر

لیکن خود تہی داماں

شکستہ دل

خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں

یہاں دنیا کے غم بھولا ہُوا

بسمل

ہراک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر جذبات کا پُتلا

مہندس

اور فقط جسموں کا سوداگر

جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا

کئی تحفے

ملمع کی ہُوئی انگوٹھیاں

جھوٹے نگوں کے ہار

دل آویز آویزے

کسی ماہر شکاری کی طرح

اپنی کمند و دام پر نازاں

ہراک پر سحر طاری تھا

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم

باسطؔ زخود رفتہ

سعیدؔ افسوں زدہ

میں بُت

کشان بی بی کے لب

کلیوں کی صورت نیم وا

اور ہم فقط

آواز کی خوشبو سے پاگل

لذّتِ معنی سے نامحرم

زبانِ یار کیلاشی و ما از حرفِ بیگانہ

(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)

کشان بی بی یہ کہتی ہے

"مرے محبوب تو اک دستۂ مُر ہے

کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں

خوشبو لٹا تا ہے

مری ہمجولیو!

بستی کے سارے نوجوانوں میں

مرا محبوب پیارا

جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ

مرا محبوب

جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گُلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اُس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنین
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آ مرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرہ
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی
ضیا گوتم سہی

لیکن کشاں بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشان بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد اندازِ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتّھر
اور پتّھر تھے تماشائی

○
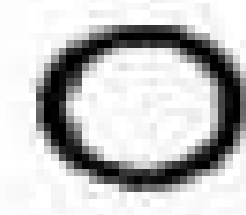
تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دُہائی نہ دُوں
میں زخم زخم ہوں پھر بھی تجھے دکھائی نہ دُوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سنائی نہ دُوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزامِ بے وفائی نہ دوں

مری بقا ہی مری خواہشِ گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہرِ پارسائی نہ دوں

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
حریفِ جاں کو کبھی طعنِ آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محوِ آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
کہ دوسروں کو تو الزامِ نارسائی نہ دوں

فرازؔ دولتِ دل ہے متاعِ محرومی
میں جامِ جم کے عوض کاسۂ گدائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی
درد کی لذّت بھی دھوکہ قرب کا غم بھی فریب
بے قراری بھی نمائش خام یارائے شکیب
تشنگی کی آگ بھی قاتل شرابِ ناب بھی

میں نے جس دریا کی وسعت دیکھ کر چاہا اُسے
وہ تو میری موجۂ غم سے بھی تھا پایاب تر
تُو بڑھی جن ساحلوں کی سمت مجھ کو دیکھ کر
تشنگی اُن کی بجھا سکتا نہیں سیلاب بھی

واہموں میں مبتلا ہم آج تک سمجھا کیے
تیرا آئینہ بھی سورج میرے پتّھر بھی گلاب
آؤ اب تسلیم کر لیں سب غلط باتیں کہیں
کاغذی ہیں پھول میرے تیرے دریا بھی سراب
خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی

آئینہ

تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال
ایک قطرہ بھی نہیں باقی کہ ہوں پلکیں تو نم
میری آنکھوں کے سمندر کون صحرا پی گئے
ایک آنسو کو ترستی ہے مری تقریبِ غم

میں نہ رو پایا تو سوچا مسکرا کر دیکھ لوں
شاید اس بے جان پیکر میں کوئی زندہ ہو خواب
پر لبوں کے تن برہنہ شاخچوں پر اب کہاں
مسکراہٹ کے شگوفے خندۂ دل کے گلاب

کتنا ویراں ہو چکا ہے میری ہستی کا جمال
تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال

O

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے سبک رو اے حریفِ جاں ذرا آہستہ چل

منزلوں پر قرب کا نشہ ہوا ہو جائے گا
ہم سفر وہ ہے تو اے ناداں ذرا آہستہ چل

نامرادی کی تھکن سے جسم پتھر ہو گیا
اب سکت کیسی دلِ ویراں ذرا آہستہ چل

جام سے لب تک ہزاروں لغزشیں ہیں خوش نہ ہو
اب بھی محرومی کا ہے امکاں ذرا آہستہ چل

ہر تھکا ہارا مسافر ریت کی دیوار ہے
اے ہوائے منزلِ جاناں ذرا آہستہ چل

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اے غریبِ شہرِ ناپرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فرازؔ
کچھ تو ظالم پاسِ ہمراہاں ذرا آہستہ چل

○
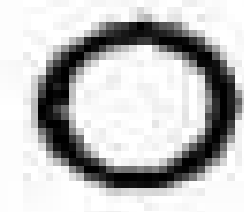
گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم ہی سبب بن گیا اداسی کا

ملول کر گئی ویران ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ تھا
تجھے بھی رنج ہُوا بات اک ذرا سی کا

فرازؔ آج شکستہ پڑا ہوں بُت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی ایک دیو داسی کا

نذرِ نذرل[1]

فنکار جو اپنے سحرِ فن سے
پتّھر کو زبان بخشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدا میں
آواز کو جان بخشتا ہے
تاریخ کو اپنا خون دے کر
تہذیب کو شان بخشتا ہے

---

[1] نذرالاسلام

فنکار خموش ہو تو جابر
ظلمت کے نشان کھولتا ہے
ہر اہلِ نظر کو دستِ قاتل
نیزے کی اَنی پہ تولتا ہے
انساں بزورِ خاک و خوں میں
انساں کے حقوق رولتا ہے

فنکار اگر زباں نہ کھولے
انبارِ گہر نصیب اُس کا
ورنہ ہر شہر یار دشمن
ہر شیخِ حرم رقیب اُس کا
چاہے وہ فراز ہو کہ نذرل
بولے تو صلہ صلیب اُس کا

لہولہان مسیحا

زمیں نے سانولے چہروں کی دُھند پھیلا دی
جب آفتاب نے چاہا کہ اپنے شعلوں سے
سمندروں کی تہوں کے تمام لعل و گہر
محبتوں کے مہکتے گلاب راکھ کرے
زمیں کے سانولے چہرے نہ سرمئی بادل
بچا سکے ہیں مرے کاسنی شگوفوں کو!
ابل رہے ہیں چٹانوں پہ رینگتے چشمے

ہر ایک سرو صنوبر، چنار کی صُورت
بھڑک اُٹھا ہے یہاں تک کہ میرا سایہ بھی
مرے وجود کی دیوار میں سمٹ آیا!
وہ آفتاب کہ نصف النّہار پر ہے ابھی
مرے زمیں کے سلگتے ہُوئے شگوفوں کو
یقینِ غیر یقینی بہار پر ہے ابھی
پلٹ کے آئے نہ آئے اک آسرا ہے مگر
لہو لہان مسیحا کہ دار پر ہے ابھی

○
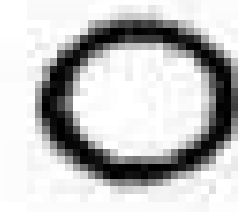
صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزمِ مے تری ساقی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

لرمے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشمِ یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ ہنر کا کون خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

○
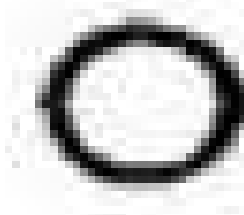
یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترکِ تعلّق کی صورتیں تھیں بہت

ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھل کے باتیں کیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھلا دیئے ہیں ترے غم نے دُکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتّھر کی مورتیں تھیں بہت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فرازؔ دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں

چلو اُس بُت کو بھی رو لیں
جسے سب نے کہا پتھر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا
کہ ہم نے پتھروں میں عمر کاٹی تھی
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چاٹی تھی

کہ پتھر تو کہیں دیوارِ زنداں
اور کہیں دہلیزِ مقتل تھے
کبھی سرمایۂ دامانِ خلقت
اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
کبھی ان کا ہدف دکانِ شیشہ گر
کبھی صورت گرِ ہنگامۂ طفلاں
کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں

بے اشک بے ارماں
کبھی لوحِ مزارِ جاں
نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں
مگر وہ بُت
چراغِ بزمِ تنہائی
مجسّم رنگ و رعنائی
فضا کی روشنی
آنکھوں کی بینائی
سکونِ جاں
وہ آنکھیں درد کی جھیلیں
وہ لب چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
وہ بُت انساں
مگر ہم نے وفورِ شوق میں
فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
یہ ہم کافر
کہ دنیا کم نظر ناداں

کبھی لائے ہمارے سامنے اوراقِ پارینہ
کہ جن پر نقش تھے

اہلِ وفا کے عکسِ دیرینہ
شکستہ استخواں بے جان نابینا
جبیں سجدوں سے داغی
اور زخموں سے بھرا سینہ
اور ان کے بُت
مآلِ سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
سبھی خود بین و خود آرا
ہر اک محمل نشیں تنہا
مگر مصروفِ نظّارا

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
نہ محرومی کو سہہ پائیں
نہ بربادی چھپانے کے رہے قابل
وہ بُت مرمر کی سِل
اور اہلِ سجدہ کی جبیں گھائل
سبھی کی بات سچ
اور ہم ندامت کے عرق میں تربتر
شرمندگی کے کرب سے بسمل

چلو اب اپنے جیسے نامرادوں سے ہنسیں بولیں
جو وہ کہتے ہیں وہ ہولیں
جبیں کے داغ آنکھوں کا لہو دھولیں
چلو اِس بُت کو بھی رولیں

○

سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لیے بہا نہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

تکمیلِ طلب نہیں ہے منزل
طے راہِ وفا قدم قدم کر

اے پچھلی رُتوں کے رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشۂ ہنر سے
ہر پارۂ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دنیا
پتّھر کی طرح نہ بیٹھ جم کر

یہ راہِ جنوں ہے اس میں پیارے
ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصرِ جہاں یہ تیرا معمار
تُو ہاتھ فرازؔ کے قلم کر

○
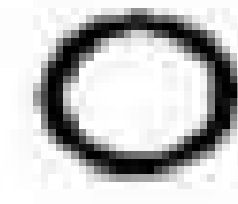
دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منوّر رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب دل کو نہیں تھی ترے آ جانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فرازؔ
درد کیسا ہی اُٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

خوں بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہُوا
بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی راکھ میں لپٹی
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا

ایک منعم کی طرح
اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہُوئے اوراق پر
لفظوں کے کچھ لعل و گہر

یاقوت و مرجاں......رکھ دیے

لو خوں بہا

اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح

چپ ہو گیا

نوحہ

اگرچہ مرگِ وفا بھی اک
سانحہ ہے لیکن یہ بے حسی
اس سے بڑھ کے جانکاہ ہے
کہ جب ہم خود اپنے ہاتھوں
سے اپنی چاہت کو نامرادی
کے ریگ زاروں میں دفن
کر کے جُدا ہُوئے تو نہ
تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا

○

یاد آتا ہے تو کیوں اُس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دُکھا ہوتا ہے

ہاتھ پر ہاتھ نہ رکھ دل کی صداقت کو پرکھ
ورنہ پیمانِ رفاقت سے بھی کیا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسمِ زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پُرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے

اِس قدر زہر نہ تھا طنزِ حریفاں پہلے
اب تو کچھ خندۂ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فرازؔ
بعض اوقات دلاسا بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا! اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح
اپنے سینے میں چھپائے ہُوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لیے ہنستا رہا میری طرح
ضوفشاں حسن ترا میرے ہُنر کی صورت
اور مقدّر میں اندھیرے کی ردا میری طرح
وہی تقدیر تری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا نخچیرِ جفا میری طرح
ترے منظر بھی ہیں ویراں مرے خوابوں جیسے
تیرے قدموں میں بھی زنجیرِ وفا میری طرح
وہی صحرائے شبِ زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانۂ جاں دشتِ بلا میری طرح

آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح
چاند نے مجھ سے کہا! اے مرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے مرے قریۂ تنہائی کا
تجھ کو معلوم ہے جو زخم مری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرف تیری شناسائی کا
موجزن ہے مرے اطراف میں اک بحرِ سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تری گویائی کا

آج کی شب مرے سینے پہ وہ قابیل اترا
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہو بھائی کا
میرے دامن میں نہ ہیرے ہیں نہ سونا چاندی
اور بجز اس کے نہیں شوق تمنّائی کا
مجھ کو دُکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دُنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ مری تنہائی کا

○
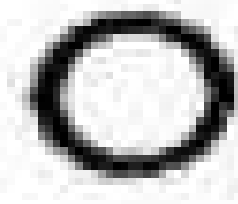
وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بُت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہُوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

وار اس قدر شدید کہ دشمن ہی کر سکے
چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

اب یہ کہ اپنی کشتِ تمنّا کو رویئے
اب اس سے کیا گلہ کہ وہ بادل ہوا کا تھا

تُو نے بچھڑ کے اپنے سر الزام لے لیا
ورنہ فرازؔ کا تو یہ رونا سدا کا تھا

سہرا

یوں بھی ہوتا ہے برسوں کے دو ہم سفر
اپنے خوابوں کی تعبیر سے بے خبر
اپنے عہدِ محبت کے نشے میں گم
اپنی قسمت کی خوبی پہ نازاں مگر
زندگی کے کسی موڑ پر کھو گئے
اور اک دوسرے سے جُدا ہو گئے

یوں بھی ہوتا ہے دو اجنبی راہ رو
اپنی راہوں سے منزل سے ناآشنا
ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں
کوئی پیمانِ الفت نہ عہدِ وفا
اتفاقات سے اس طرح مِل گئے
ساز بھی بج اُٹھے پُھول بھی کِھل گئے

○
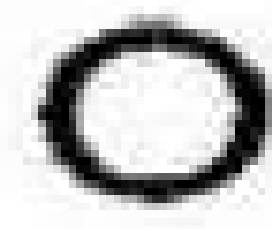
لگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اُسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اُسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بخشے وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آ گئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے

○

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبت کہاں کہ مدّت سے
نہ ابتدا کی طرح ہے نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فرازؔ کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی

کہ تجھ سے مل کر کبھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی

کہ جسم و جاں میں اُبال آئے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی

نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی

نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
نہ چُپ ہی میں خوبصورتی تھی

مجسّموں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا ہے جیسے
وہ ساعتیں بھی گزر گئی ہیں

کہ جن کو ہم لازوال سمجھے
وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں

جو تیرے میرے لہو کی حدّت
کو آخرش برف کر گئی ہیں

محبتیں شوق کی چٹانوں
سے گھاٹیوں میں اُتر گئی ہیں

وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں

اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں

○
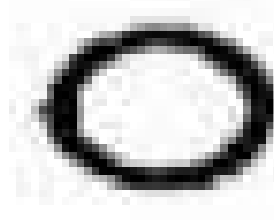
یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جُدائی کی ساعتیں کرنی

کوئی خدا ہو کہ پتّھر جسے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اُسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب اُن سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

کبھی فرازؔ نئے موسموں میں رو دینا
کبھی تلاش پُرانی رفاقتیں کرنی

○

فقیہِ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہُوا
کہ اس سے مل کے مزاج اور کافرانہ ہُوا

ابھی ابھی وہ مِلا تھا ہزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہُوا

وہ رات بھُول چکو وہ سخن نہ دہراؤ
وہ رات خواب ہُوئی وہ سخن فسانہ ہُوا

کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
تری ہی بات نہیں میں بھی کیا سے کیا نہ ہُوا

ہجوم ایسا کہ راہیں نظر نہیں آتیں
نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہُوا

شہیدِ شب فقط احمد فرازؔ ہی تو نہیں
کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہُوا

ویت نام

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کا دامان و آستیں
خونِ بے گناہاں سے تر بتر ہے
تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذّب جہاں کی مخلوق
کل ترے رُوبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو

جب تہہِ تیغ کر رہا تھا
تو تُو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ برّاں میں
اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم بھی کیا جواب دیں گے

جاناں جاناں

عطا اللہ سجاد کے نام

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

ترتیب

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہُوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہُوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہُوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہُوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھُول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دُکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جُدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنّی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اُسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

○

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی تو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بےپیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقّع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں

○
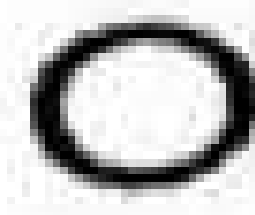
اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتّھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

○
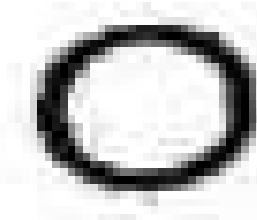
اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسُوب قاتل سے ہُوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھُول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اُتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدّر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہَوا میں مست پھرتا ہے فرازؔ
شہرِ ناپُرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہَوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھُکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہَوا کے علَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جُھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سُقراط ہیں
خواب منصُور ہیں

○
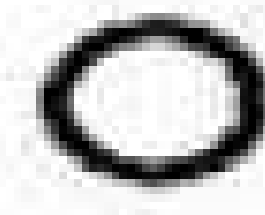
ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب تختۂ ریگ ہے یہ چہرہ
دریا تھا سراب ہو چکا ہے

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

اب اور کوئی علاج غم کا
اب زہر شراب ہو چکا ہے

اُس رُت میں بھی بے نمو ہوں جس میں
کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

○
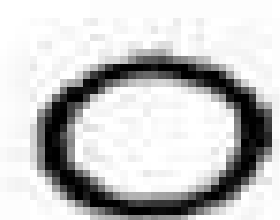
یوں تو پہلے بھی ہُوئے اُس سے کئی بار جُدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود وزیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہُوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دُور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جُدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
''میں جُدا گریہ کناں، ابر جُدا، یار جُدا''

کجکلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرّۂ دستار جُدا

اِس قدر رُوپ ہیں یاروں کے، کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جُدا اور سرِ دربار جُدا

کُوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جُدا

○
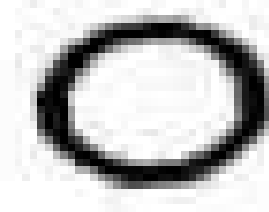
جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہُوئی ہُوئی نہ ہُوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

○
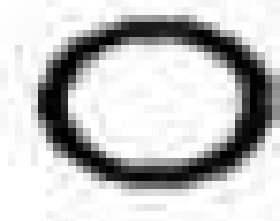
جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہُوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتّھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھُول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلّق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

مت سوچو!

اور اس نے
مرے ساغر میں
مئے سرخ انڈیلی.....تو کہا
مت سوچو!
تم یہاں آئے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس حجلۂ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں
نغمہ بلب
مست ادا مت سوچو
جاگتی رات
کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا
مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو
پردیس بھی آتے ہو
تو لے آتے ہو
بیمار شب و روز و دل افگار
عزیزانِ وطن کی یادیں
اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح
جن کے دھبّوں کو تو خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں
یہ جو زنگار ہیں غربت کے
خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں
آلائشیں جسموں کی ہیں
اس طرح سنبھالے ہُوئے پھرتے ہو
کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں
اس گھڑی تم ہو جہاں
مملکت خواب نہیں
یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں
زندگی مے کی طرح
شوخ ہے طرّار نہیں
زہراب نہیں
اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری
اس جگہ شاملِ آداب نہیں
مت سوچو!

پیرس ۱۹۷۴ء

○

سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہِ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجوم سرِ رہگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فرازؔ اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
"ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

○

سب لوگ لئے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نجانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قدو قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو!

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہُوا
اب کس کا گیت سُناتے ہو
اُس تن من کا جو دو نیم ہُوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
اِن آنکھوں کی تقدیر ہُوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہُوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہُوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہُوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بدقسمت تھا
راہوں میں بہایا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کِھلا یا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفّت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسیٰ کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

اُن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہُوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھُوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہُوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دُکھ کا نشانہ ہُوئے

اُس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصّے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھّا ہے اِس قصّے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لئے
اُس جشن میں شامل ہوں میں بھی
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

O
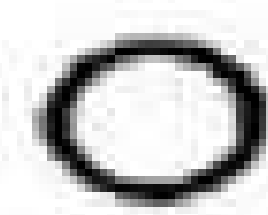
ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہدِ وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترکِ محبت کرے، کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گُل بن کے پھوٹتا ہے لہو شاخسار سے
زخمِ رگِ بہار ہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

○
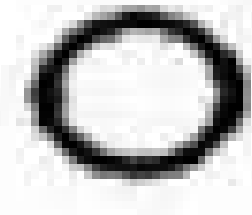
شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گُلِ حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاکِ جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمار زخم ابھی سے فرازؔ کیا کرنا
ابھی تو جان مری اِبتدا بہار کی ہے

○
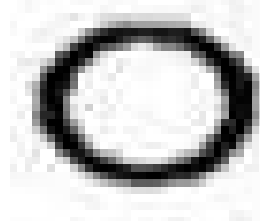
دل گرفتہ ہی سہی بزم سجالی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروّت سے مِلا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فرازؔ
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

O
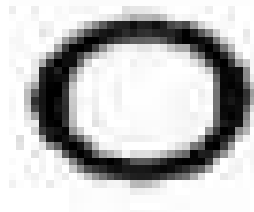
ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہُوئی چلا گیا

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اِک دِیا بجھا تو سینکڑوں دِیے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سُنا گیا

اب اک ہجومِ عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اُداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہُوا ہے اس ریاضِ دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا

شریک بزمِ دل بھی ہیں چراغ بھی ہیں پھُول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اُٹھو ستم زدو چلیں یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آ گیا

یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

اے مرے یارِ قدح ریز!

چاند نکلا ہے مری آنکھ
مرے دل میں اُتارے ہے تجھے
آ مرے یارِ قدح ریز
مرا جام پکارے ہے تجھے

یونہی تنہائی میں بیٹھا تھا
سرِ شام بھلائے ہوئے ساری دنیا
یونہی اِک یاد سی جاگ اُٹھی
تو لگنے لگی پیاری دنیا
میں تو جیسا بھی ہوں خوش وقت ہوں

کیسی ہے تمہاری دنیا
تم نے جس داؤں کو جیتا ہے
اسی بازی میں ہاری دنیا

آ مرے یارِ قدح ریز!
مرا جام ہے خالی کب سے
مرا دل چُور ہے زخموں سے
مری آنکھ سوالی کب سے
پیشِ منظر میں اب آ جاؤ
کہ ہیں اصنام خیالی کب سے
منتظر ہال میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کی طرح
یوں بجاتے رہیں تالی کب سے
آ مرے یارِ قدح ریز!
مرا نام ہے گالی کب سے

○
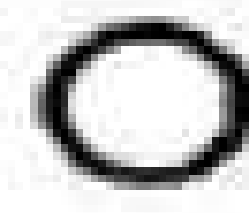
کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اُس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اُس سے

یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانۂ دل ابتدا کرو اُس سے

یہ کیا کہ تم ہی غمِ ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سُنا کرو اُس سے

فرازؔ ترکِ تعلق تو خیر کیا ہو گا!
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اُس سے

○
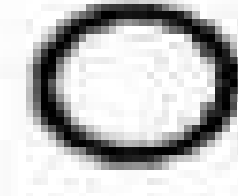
تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدّر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اُسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہُوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتّھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کا ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فرازؔ تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

○
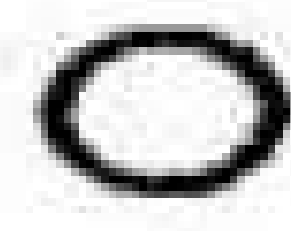
ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اِس توقع پر کہ شاید تُو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدّر دیکھتا

زندگی پھیلی ہُوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تُو بھی دل کو اِک لہو کی بُوند سمجھا ہے فرازؔ
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سُورج

سحر کے سُورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہولہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشاں
میری آبرو ہے
لہولہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہُوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے

تری شعاعوں کا نُور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

سحر کے سورج
ستم کی آندھی رُکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
سسک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا

ابھی تو میں جاں کنی کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج
مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علَم اُٹھائے
رواں ہُوئے تھے یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پر نہ حرف آئے

سحر کے سورج
مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پا بہ زنجیر
منفعل گردنیں جھکائے
عدو کے نرغے میں
ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں
جہاں حقارت کے طعن
نفرت کے سنگ
رسوائیوں کے بازار
منتظر ہیں
سحر کے سورج
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے
یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چمچماتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

وہ تو اِک خواب پریشاں تھا جو میں نے دیکھا
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پر گزرے
میرے ویران مہ و سال
مرے شام و سحر
میری مجروح محبت۔ مری درماں طلبی
سرِ دہلیزِ رقیباں
مری دریوزہ گری
آنکھ میں اشک ندامت کے
تو چہرے پہ فشارِ دل و جاں
میرا ماضی بھی اندھیرا

میں کہاں ڈھونڈتا
کھوئی ہوئی ہستی کے نشاں
تُو یہاں تھا نہ وہاں
میں یہاں تھا نہ وہاں
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پر گزرے

پھر یہ کیوں ہے
کہ مرا جسم مرا خوں
نہ ہُوا خاکستر
کون اس درد کے دوزخ میں
مہ وسال تلک جل کے بھی
استادہ رہا
زندہ رہنے پہ مصر
اور نئی زیست کا دلدادہ رہا
نئی سج دَھج سے بسر کرنے پہ آمادہ رہا
بس اسی درد کے دوزخ کا رہا ہوں ایندھن
اب جو ابھرا ہوں تو اس آگ سے کندن ہو کر
میں نے اس حسن کو پایا ہے بہت کچھ کھو کر

اپنے بکھرے ہوئے پندار

کا ریزہ ریزہ

چُن رہا ہوں شبِ صحرا سے ستاروں کی طرح

اپنے ملبوسِ دریدہ کے پریشاں ٹکڑے

جنبشِ سوزنِ اُمید کی خیاطی سے

سی رہا ہوں کہ مرا جسم برہنہ نہ رہے

میرے دیرینہ حریفوں کے لبوں پر کوئی طعنہ نہ رہے

مجھ پہ قرضِ غمِ جان و غمِ دنیا نہ رہے

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

جو مجھ پر گزرے

اور اب میں نئے موسم میں

کسی شعلۂ بے باک کسی پرچمِ پرّاں کی طرح

کرۂ خاک میں لہرانے لگا ہوں پھر سے

اے مرے لمحۂ آئندہ مرے شوق کے فردا

تری منزل کی طرف آنے لگا ہوں پھر سے

اپنے خاشاک کو

انگارے چمکانے لگا ہوں پھر سے

○
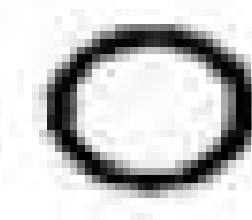
سوئے فلک نہ جانبِ مہتاب دیکھنا
اس شہرِ دلنواز کے آداب دیکھنا

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

وہ موجِ خوں اُٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
اب کے فصیلِ شہر کو غرقاب دیکھنا

ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کمیاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

پھر خونِ خلق و گردنِ مینا بچائیو
پھر چل پڑا ہے ذکرِ مئے ناب دیکھنا

آباد کوئے چاکِ گریباں جو پھر ہُوا
دستِ رقیب و دامنِ احباب دیکھنا

ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بیدلی کے ساتھ
اس انجمن میں اے دلِ بیتاب دیکھنا

حد چاہیئے فرازؔ وفا میں بھی اور تمہیں
غم دیکھنے نہ دل کی تب و تاب دیکھنا

○
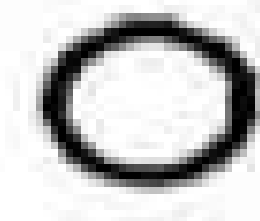
ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہُوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سُنایا اُسے فسانہ لگا

برونِ در نہ کوئی روشنی نہ سایا تھا
سبھی فساد مجھے اندرونِ خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اُڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

ستم کے عہد میں مَیں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فرازؔ مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اِک زمانہ لگا

جو سزا ہم کو ملے......

اور ہمیں درد کی منزل پہ پہنچنے والے
کہہ رہے ہیں کہ اسے اور بھی آسان کرو
تا کہ ہم اپنے پرائے کو بھی پہچان سکیں
اور کچھ دوست اسی راہ میں قربان کرو

شام آئی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر
جو کبھی خونِ تمنّا کبھی گلزار لگے
اتنی آشفتہ نہ تھی خواہشِ یاراں پہلے
اب تو ہر جذبۂ آسودہ بھی تلوار لگے

تُو کہ تنہا ہے مری طرح تو مجبور نہ بن
کارواں اُتریں گے اس کوہِ ندا سے کتنے
شمعیں بجھ جائیں گی خورشید اُبھر آئیں گے
اور اسی ساحلِ اُمّید سے پیاسے کتنے

یوں پُکاریں گے کہ یہ بُوند سمندر کر دے
آج مصلوب جو ہو اس کو پیمبر کر دے
یہ جو ہونا ہے تو ہم یونہی گنہگار رہیں
جو سزا ہم کو ملے اس کے سزاوار رہیں

○
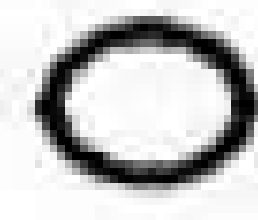
آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مرا ہم خیال ہو

اب کے وہ درد دے کہ میں روؤں تمام عمر
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

پہلے وہ اضطراب تجھے کس طرح بھلائیں
اب یہ عذاب کیسے طبیعت بحال ہو

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

پھر تُو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہُوں مگر ابھی بکھرا نہیں فرازؔ
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

○
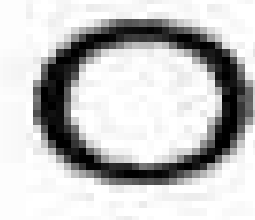
تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی اُداسی کم نہیں ہے

ہمیں بھی یاد ہے مرگِ تمنّا
مگر اب فرصتِ ماتم نہیں ہے

ہوائے قربِ منزل کا بُرا ہو
فراقِ ہم سفر کا غم نہیں ہے

جنونِ پارسائی بھی تو ناصح
مری دیوانگی سے کم نہیں ہے

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

قیامت ہے کہ ہر مے خوار پیاسا
مگر کوئی حریفِ جم نہیں ہے

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

فرازؔ اس قحط زارِ روشنی میں
چراغوں کا دھواں بھی کم نہیں ہے

○

برسوں کے بعد دیکھا ''اک شخص دِلربا سا''
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رُکی رُکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

خوابوں میں خواب اُس کے یادوں میں یاد اُسکی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جُدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدّتوں سے روئے نہیں تھے ہم بھی
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہُوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہُوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اِک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رُخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فرازؔ کا سا

○

جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

خواہشیں یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بجھتی ہیں
اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا

یار خوش ہیں کہ انہیں جامۂ احرام ملا
لوگ ہنستے ہیں کہ قامت سے زیادہ پہنا

یارِ پیماں شکن آئے اگر اب کے تو اُسے
کوئی زنجیرِ وفا اے شبِ وعدہ پہنا

غیرتِ عشق تو مانع تھی مگر میں نے فرازؔ
دوست کا طوق سرِ محفلِ اعدا پہنا

سچ بھی جھوٹا ہے

سچ بھی جھوٹا ہے
کہ اِس کے بھی کئی چہرے ہیں
ایک چہرہ کہ ترے قرب کی ساعت میں مجھے
نہ کوئی خواہشِ آغوش رسی
اور نہ تمنّائے وصال

ایک چہرہ کہ
ترے جسم کی حرمت کی قسم کھا کے
ہر اک دیدۂ مشکوک کو سمجھاتا رہا
آسمانوں کے صحیفوں سے اُتارے ہُوئے
الفاظ کو دہراتا رہا

ایک چہرہ
کہ ترے پاس سے اُٹھا ہوں
تو خود سوچتا ہوں

کہ مرا سر دلہو
گرمیِ شوق سے اور آتشِ محرومی سے
کیوں پھکتا ہے

اور بدن
نشّے کے عالم میں بھی کیوں دُکھتا ہے

○
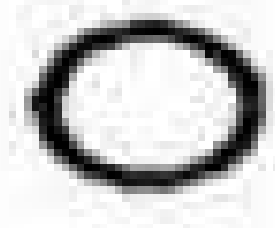
میں نے آغاز سے انجامِ سفر جانا ہے
سب کو دو چار قدم چل کے ٹھہر جانا ہے

غم وہ صحرائے تمنّا کہ بگولے کی طرح
جس کو منزل نہ ملی اس کو بکھر جانا ہے

تیری نظروں میں مرے درد کی قیمت کیا تھی
میرے دامن نے تو آنسو کو گہر جانا ہے

اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت ترے پندار کو مر جانا ہے

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اُس کو ٹھہر جانا ہے

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لئے رُکنا ہے گزر جانا ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا بُرا ہو کہ فرازؔ
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے

○
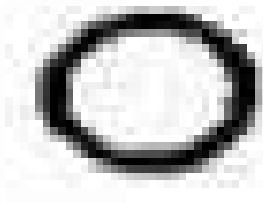
میں کہ پھر دشتِ رفاقت کا سفر کر آیا
کیا کہوں کتنی اذیّت سے گزر کر آیا

ہر کوئی ہم سے ملا عمرِ گریزاں کی طرح
وہ تو جس دل سے بھی گزرا وہیں گھر کر آیا

تم نے اِک سنگ اُٹھایا مرے آئینے پر
اور ہر شخص کو میں آئینہ گر کر آیا

مجھ سے کیا پُوچھتے ہو شہرِ وفا کیسا ہے
ایسے لگتا ہے صلیبوں سے اُتر کر آیا

صرف چہرے ہی اگر کرب کے آئینے ہیں
کیوں نہ میں دل کا لہو آنکھ میں بھر کر آیا

اب جو اس شہر کی تقدیر ہو، میں تو لوگو
درو دیوار پہ حسرت کی نظر کر آیا

ہم تو سمجھے تھے محبت کا پیمبر ہے فراز
اور وہ بے مہر بھی توہینِ ہنر کر آیا

○

ہاتھ اُٹھائے ہیں مگر لب پر دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو وہ جس کی جزا کوئی نہیں

یہ بھی وقت آنا تھا، اب تُو گوش برآواز ہے
اور میرے بربطِ دل میں صدا کوئی نہیں

آ کہ اب تسلیم کر لیں تُو نہیں تو میں سہی
کون مانے گا کہ ہم میں بے وفا کوئی نہیں

وقت نے وہ خاک اُڑائی ہے کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقشِ پا کوئی نہیں

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

کیسے رستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فرازؔ
یا ہجومِ دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

تو بہتر ہے یہی

یہ تری آنکھوں کی بیزاری یہ لہجے کی تھکن
کتنے اندیشوں کی حامل ہیں یہ دل کی دھڑکنیں
پیشتر اس کے کہ ہم پھر سے مخالف سمت کو
بے خدا حافظ کہے چل دیں جھکا کر گردنیں

آؤ اس دُکھ کو پکاریں جس کی شدت نے ہمیں
اس قدر اک دوسرے کے غم سے وابستہ کیا
وہ جو تنہائی کا دُکھ تھا تلخ محرومی کا دُکھ
جس نے ہم کو درد کے رشتے میں پیوستہ کیا

وہ جو اس غم سے زیادہ جاں گسل قاتل رہا
وہ جو اک سیلِ بلا انگیز تھا اپنے لیے
جس کے پَل پَل میں تھے صدیوں کے سمندر موجزن
چیختی یادیں لیے اُجڑے ہُوئے سپنے لیے

میں بھی ناکامِ وفا تھا تو بھی محرومِ مراد
ہم یہ سمجھے تھے کہ دردِ مشترک راس آ گیا
تیری کھوئی مسکراہٹ قہقہوں میں ڈھل گئی
میرا گم گشتہ سکوں پھر سے مرے پاس آ گیا

تپتی دوپہروں میں آسودہ ہُوئے بازو مرے
تیری زلفیں اس طرح بکھریں گھٹائیں ہو گئیں
تیرا برفیلا بدن بے ساختہ لَو دے اُٹھا
میری سانسیں شام کی بھیگی ہوائیں ہو گئیں

زندگی کی ساعتیں روشن تھیں شمعوں کی طرح
جس طرح سے شام گزرے جگنوؤں کے شہر میں
جس طرح مہتاب کی وادی میں دو سائے رواں
جس طرح گھنگھرو چھنک اُٹھیں نشے کی لہر میں

آؤ یہ سوچیں بھی قاتل ہیں تو بہتر ہے یہی
پھر سے ہم اپنے پُرانے زہر کو امرت کہیں
تو اگر چاہے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفاؤں کے لئے روتے رہیں

○
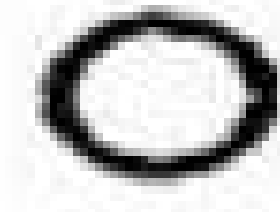
یہ جو نشّے ہیں سفر کے نہ اُتر جائیں کہیں
کوئی منزل نہ سہی سامنے پڑ جائیں کہیں

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

تجھ کو یہ دُکھ کہ مری چارہ گری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں

اس خلا میں تو زمیں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
کوئی قلزم ہو کہ دلدل ہو اُتر جائیں کہیں

گھر سے نکلے تھے کہ دُنیا نے پکارا تھا فرازؔ
اب جو فرصت ملے دُنیا سے تو گھر جائیں کہیں

○
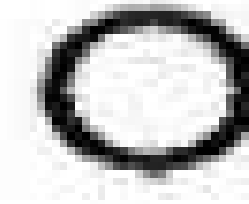
روک آنسوؤں کو دامنِ زخمِ جگر نہ کھول
جیسا بھی حال ہو نگہِ یار پر نہ کھول

جب شہر لُٹ گیا ہے تو کیا گھر کو دیکھنا
کل آنکھ نم نہیں تھی تو اب چشمِ تر نہ کھول

چاروں طرف ہیں دامِ شنیدن بچھے ہُوئے
غفلت میں طائرانِ معانی کے پَر نہ کھول

کچھ تو کڑی کٹھور مسافت کا دھیان کر
کوسوں سفر پڑا ہے ابھی سے کمر نہ کھول

عیسیٰ نہ بن کہ اس کا مقدّر صلیب ہے
انجیلِ آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

امکاں میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

میری یہی بساط کہ فریاد ہی کروں
تُو چاہتا نہیں ہے تو بابِ اثر نہ کھول

تُو آئینہ فروش و خریدار کور چشم
اس شہر میں فرازؔ دکانِ ہنر نہ کھول

○
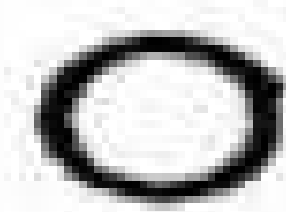
عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

یہ کون پھر سے انہی راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لبِ چارہ گر سے نکلا تھا

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا

یہ اب جو سر ہیں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عیب بھی تو ہم اہلِ ہنر سے نکلا تھا

وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فرازؔ
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

ترچ میر

ترچ میر!
میں تیرے قدموں میں
اِک بے وقر سنگ ریزے کی صورت
تری جاں رُبا رفعتوں کی طرف دیکھتا ہوں
تری چوٹیاں
برف کے تاج پہنے
ازل سے اسی تمکنت سے ستادہ ہیں
سورج کی لالی میں ڈوبے ہوئے ابر
ان کا لبادہ ہیں
اور آسمانی ہواؤں کی مانند
مشرق سے مغرب تلک
ان کے دامن کشادہ ہیں
اے آسمانی ہواؤں کے مسکن
تری آنکھ نے
روز و شب کے سپید و سیہ

اَن گنت قافلوں کا تماشا کیا ہے
تری بے صدا گھاٹیوں سے
کئی فاتحوں کے جری لشکروں نے گزرتے ہُوئے
صاف وشفّاف چشموں کا پانی پیا ہے
کنڑ
وقت کی آبجو کی طرح
تیرے پہلو میں بہتا ہے
اوران کی تاریخ کہتا ہے
جواب عدم کا سفر کر چکے ہیں
جو تیرے مکینوں کی مانند
زندہ ہیں
پر مر چکے ہیں
میں اُن کی صدا سن رہا ہوں
تو کیا
اپنے مردوں کی پرچھائیاں
صرف غیض وغضب جانتی ہیں
تو کیا قہر ہی
ان کی برحق عدالت کا دستور ہے
صرف ادبار کی بجلیاں
ان کا سارا اثاثہ ہیں

اور اپنی درگاہ کے سائلوں میں
ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں
قیامت ہے
اے اپنے آبا کی روحوں کے مسکن
کہ وادی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی نحوست ہے
اور مرد و زن، ڈھور ڈنگر
سبھی بھوک سے ادھ موئے ہو رہے ہیں
ہمارے سیہ بخت بچے فلاکت کے غاروں میں دبکے ہوئے
تیرے سورج کی ضو کو ترستے ہیں
پالے کی شدّت سے ہر اک چراگاہ
صحرا کی مانند سوکھی پڑی ہے
اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں
کی خونخوار آنکھیں ہمیں حرص سے
دیکھتی ہیں
ترے موسموں اور گھٹاؤں کی بخشش
فقط قحط ہے
قہر ہے
غیض ہے
اے ترچ میر
تو کتنا بے فیض ہے!

○

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہرِ رسوائی درِ جاناں سمیت

اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پُرنم ہے دل آزاراں سمیت

اِک فقیہہِ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت

یہ رعونت تابکے اے دل فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرّۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

وہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فرازؔ
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

○
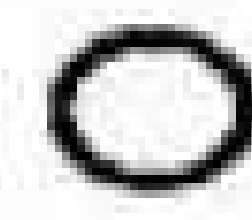
میں تو لب کھول کے پابندِ سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تُو صاحبِ محفل ٹھہرا

کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل کوئی قاتل ٹھہرا

خوابِ آوارہ کسی آنکھ کی تقدیر تو بن
کسی منزل پہ کبھی قافلۂ دل ٹھہرا

مجھ کو بھی تیری اُداسی دلِ ویراں سی لگی
تو بھی اے شہرِ جُدائی مرے قابل ٹھہرا

کیا گلہ تجھ سے کہ آشوبِ جہاں ایسا ہے
میں بھی اے یار تری یاد سے غافل ٹھہرا

خوشنوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا

کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جانِ فراز
نہ ترا درد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا

○
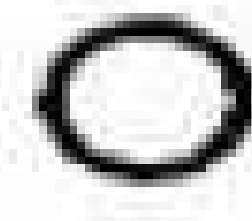
اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف، خون کو پانی کوئی لکھو

کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہُوئے
کیوں رُک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

کیوں اہلِ شوق سر بگریباں ہیں دوستو
کیوں خوں بہ دل ہے عہدِ جوانی کوئی لکھو

کیوں سرمہ درگلو ہے ہر اک طائرِ سخن
کیوں گلستاں قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو

ہاں تازہ سانحوں کا کرے کون انتظار
ہاں دل کی واردات پرانی کوئی لکھو

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہُوں
وہی آج تُو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازوِ سناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے

قلم نے لکھا تھا

یہ دھرتی اسی کی ہے جو

ظلم کے موسموں میں

کھلے آسمانوں تلے

اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے

جو اپنے لہو کی تمازت سے

زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے

وہی جس کی پوروں کے مَس سے

سکوتِ زمیں بولتا ہے

مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا

اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی

جس کا پیکر مشقّت سے پتھرا گیا

اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی

اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بُو ہے

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے

کہ اس نے لکھا تھا

وہ بازو

جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرالیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب اُن کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

○

آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے
جو اہلِ وفا واقفِ آداب بہت تھے

اِس شہرِ محبت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے

کچھ دل ہی نہ مانا کہ سبک سر ہوں وگرنہ
آسودگیٔ جاں کے تو اسباب بہت تھے

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

اب دیکھ یہ حسرت بھری اُجڑی ہوئی آنکھیں
دُنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے

میں کیوں نہ فرازؔ ان کی طرح مُہر بلب تھا
اِس بات سے ناخوش مرے احباب بہت تھے

○
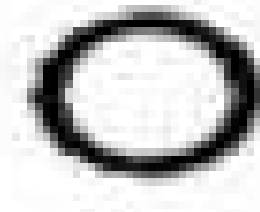
وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا
اگر چلا ہے تو جو کچھ مجھے دیا لے جا

مقامِ سُود و زیاں آ گیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی تیر تو اُٹھا لے جا

یہی ہے قسمتِ صحرا یہی کرم تیرا
کہ بُوند بُوند عطا کر گھٹا گھٹا لے جا

غرورِ دوست سے اِتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اُس کے سامنے دامانِ التجا لے جا

ندامتیں ہوں تو سربارِ دوش ہوتا ہے
فرازؔ جاں کے عوض آبرو بچا لے جا

○
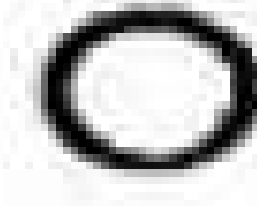
دوست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
یہ تو مجھ پر اب کھلا ظالم کہ تُو میرا نہ تھا

اِس طرح خوش ہو رہا ہوں جشنِ مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوکِ خنجر پر لہو میرا نہ تھا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یک جا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تُو میرا نہ تھا

وہ کہیں بھی چھوڑ جاتا کیا گلہ اس سے کہ وہ
اِک مسافر تھا شریکِ جستجو میرا نہ تھا

اب تو خود سے بولتے میں خوف آتا ہے فرازؔ
اتنا دل آزار طرزِ گفتگو میرا نہ تھا

خٹک ناچ

اِک ہاتھ میں رومال ہے اِک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار
جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار
ہر بات پہ تیاّر

کہسار کے سُورج کی طرح گرم و شفق رو
خیبر کی ہَواؤں کی طرح تُند و تنک خُو
یہ نغمۂ دلدار کبھی...... شعلۂ بیدار
پشتون کا کردار

یہ مردِ کہستاں جو چٹانوں میں ڈھلا ہے
شاہیں صفت آزاد فضاؤں میں پلا ہے
رقصندہ و رخشندہ و تابندہ و طرّار
پشتون کا کردار

یہ رقصِ وفا کا بھی جنوں کا بھی یہی رقص
جینے کی ادا گردشِ خوں کا بھی یہی رقص
وہ جنگ کا میدان ہو یا امن کا دربار
پشتون کا کردار

جو پیار کرے پیار ملے، وار کرے وار
ہر بات پہ تیّار
پشتون کا کردار

○
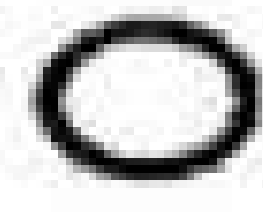
جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دُھند ہے بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو

اِس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہُوں کہ کوئی اور ہے دنیا ہے کہ تم ہو

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھو یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

یہ عمرِ گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

ہر بزم میں موضوعِ سخن دل زدگاں کا
اب کون ہے شیریں ہے کہ لیلیٰ ہے کہ تم ہو

اِک درد کا پھیلا ہُوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اِک موج میں آیا ہُوا دریا ہے کہ تم ہو

وہ وقت نہ آئے کہ دلِ زار بھی سوچے
اِس شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو

آباد ہم آشفتہ سروں سے نہیں مقتل
یہ رسم بھی اس شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو

اے جانِ فرازؔ اتنی بھی توفیق کسے تھی
ہم کو غمِ ہستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو

○

نوحہ گروں میں دیدۂ تر بھی اُسی کا تھا
مجھ پر یہ ظلم بارِ دگر بھی اُسی کا تھا

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلّق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اُسی کا تھا

آنکھیں کشاد و بست سے بدنام ہوگئیں
سُورج اُسی کا خوابِ سحر بھی اُسی کا تھا

خنجر در آستیں ہی ملا جب کبھی ملا
وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اُسی کا تھا

نشتر چبھے ہُوئے تھے رگِ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اُسی کا تھا

محفل میں کل فرازؔ ہی شاید تھا لب کُشا
مقتل میں آج کاسۂ سر بھی اسی کا تھا

○

زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اُجالوں جیسی
پر طبیعت ہے وہی بھولنے والوں جیسی

اِک زمانے کی رفاقت پہ بھی رَم خوردہ ہے
اُس کم آمیز کی خُوبُو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

اس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں مرے بالوں جیسی

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

عید کارڈ

تجھ سے بچھڑ کر بھی زندہ تھا
مر مر کر یہ زہر پیا ہے
چپ رہنا آسان نہیں تھا
برسوں دل کا خون کیا ہے
جو کچھ گزری جیسی گزری
تجھ کو کب الزام دیا ہے

اپنے حال پہ خود رویا ہوں
خود ہی اپنا چاک سِیا ہے
کتنی جانکاہی سے میں نے
تجھ کو دل سے محو کیا ہے
سنّاٹے کی جھیل میں تُو نے
پھر کیوں پتّھر پھینک دیا ہے

○
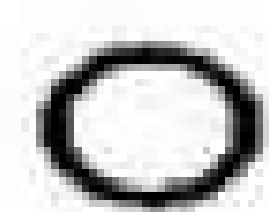
نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دُور جا نکلتی ہے

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نِکلتی ہے

وصالِ بحر کی حسرت میں جُوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لئے مرے دل سے دعا نِکلتی ہے

وہ زندگی ہو کہ دُنیا فرازؔ کیا کیجے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے

O
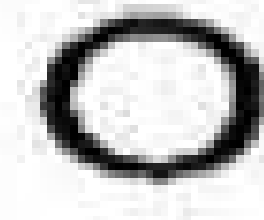
ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہُوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہُوئے

بہت سے زخم ہیں ایسے جوان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرِ دوستاں ہمارے ہُوئے

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دُکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہُوئے

گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہُوا کہ وہی بادباں ہمارے ہُوئے

فرازؔ منزلِ مقصود بھی نہ تھی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساتھی رواں ہمارے ہُوئے

○

فرازؔ اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں

لب و دہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اُداس ہُوں بھی نہیں

مری زبان کی لکنت سے بدگمان نہ ہو
جو تُو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

دُکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اسی دیار کا میں بھی ہُوں اور ہُوں بھی نہیں

فرازؔ جیسے دیا قربتِ ہَوا چاہے
وہ پاس آئے تو ممکن ہے میں رہوں بھی نہیں

میورکا

(سپین کا ایک خوبصورت جزیرہ)

میورکا کے ساحلوں پہ کس قدر گلاب تھے
کہ خوشبوئیں تھیں بے طرح کہ رنگ بے حساب تھے
تنک لباسیاں شناوروں کی تھیں قیامتیں
تمام سیم تن شریکِ جشنِ شہرِ آب تھے
شعاعِ مہر کی ضیا سے تھے جگر جگر بدن
قمر جمال جن کے عکس روشنی کے باب تھے
کھلی فضا کی دھوپ وہ کہ جسم سانولے کرے
بُتانِ آذری کہ مستِ غسلِ آفتاب تھے

یہیں پتہ چلا کہ زیست حسن ہے بہار ہے
یہیں خبر ہُوئی کہ زندگی کے دُکھ سراب تھے
یہیں لگا کہ گردشوں کے زاویے بدل گئے
نہ روز و شب کی تلخیاں نہ وقت کے عذاب تھے
مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم
مری نظر میں تیرے خدّ وخال تیرے خواب تھے
میں دُوریوں کے باوجود تیرے آس پاس تھا
میورکا کے ساحلوں پہ میں بہت اُداس تھا

سپین
۱۹۷۶ء

○
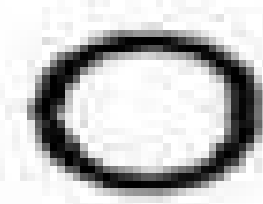
تھی مرے جام میں دُردِ مئے تنہائی بہت
کل کسی یارِ قدح ریز کی یاد آئی بہت

نہ کوئی مونسِ دل تھا نہ کوئی دشمنِ جاں
پہلے پہلے تو طبیعت مری گھبرائی بہت

کیٹس کی قبر پہ پہنچا تو بھر آئی آنکھیں
اس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

نشّہ اُترا تو بدن یوں تھا شکستہ جیسے
بادہ پیمائی تھی کم بادیہ پیمائی بہت

اب تو رشک آتا ہے یاروں کی جوانمرگی پر
زندگی میں بھی کبھی تھا ترا شیدائی بہت

روم کا حسن بہت دامنِ دل کھینچتا ہے
اے مری خاکِ پشاور تری یاد آئی بہت

اوّلِ عشق کی بات اور تھی جو بھی ہوتا
اب تو ملیے کہ نہ ملنے میں ہے رسوائی بہت

اب فراز اپنے مسیحا سے بھی امّید نہ رکھ
وہ تنک دل ہے ترے زخم میں گہرائی بہت

○
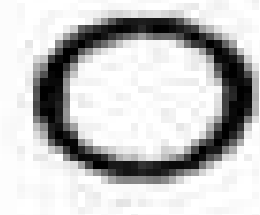
جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اُترنے لگے
نسیمِ ہجر کے جھونکے اُداس کرنے لگے

گئی رُتوں کا تعلّق بھی جان لیوا تھا
بہت سے پھُول نئے موسموں میں مرنے لگے

غزل میں جیسے ترے خدّ وخال بول اُٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

وہ مدّتوں کی جُدائی کے بعد ہم سے ملا
تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے

بہت دنوں سے وہ گھمبیر خامشی ہے فرازؔ
کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے

○
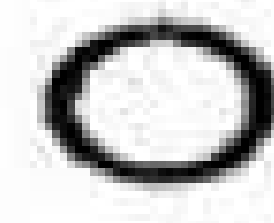
انہی خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

یہ اُداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو کسی درد کو جگاؤ

وہ کہانیاں ادھوری جو نہ ہو سکیں گی پُوری
اُنہیں میں بھی کیوں سُناؤں انہیں تم بھی کیوں سناؤ

یہ جدائیوں کے رستے بڑی دُور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا مری بات مان جاؤ

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فرازؔ کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

○
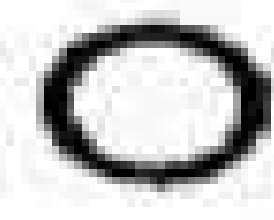
طعنہ زن کیوں ہے مری بے سر و سامانی پر
اِک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر

واعظو میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

ان کے ملبوس میں پیوند مرے جسم کے ہیں
اور یاروں کی نظر ہے مری عریانی پر

وقت رُکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہُوئے پانی پر

کشتیِ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فرازؔ
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

اہلِ تاشقند کے نام

(ایک مجسمہ دیکھ کر)

کانسی کے مجسّمے میں کیا کیا
اظہار ہے، کرب ہے، نمو ہے

انسان کے عزم کی علامت
فطرت کے ستم کے روبرو ہے

ہاتھوں میں غضب کا حوصلہ ہے
ماتھوں پہ جلالِ آبرو ہے

آنکھوں میں وقار فاتحانہ
چہروں پہ گلاب سا لہو ہے

ہر بار بلا کا رَن پڑا تھا
ہر بار حیات سرخرو ہے

جیسے کہ مجسّمے میں مَیں ہُوں
جیسے کہ مجسّمے میں تُو ہے

تاشقند ـ ۱۹۷۶ء

○
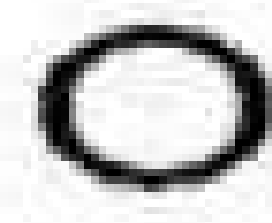
خود آپ اپنی نظر میں حقیر میں بھی نہ تھا
اس اعتبار سے اس کا اسیر میں بھی نہ تھا

بنا بنا کے بہت اُس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر میں بھی نہ تھا

نبھا رہا ہے یہی وصفِ دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی!
وہ خوش مزاج اگر تھا تو میرؔ میں بھی نہ تھا

میں برگِ آخرِ شہرِ خزاں تھا خاک ہُوا
کھلا کہ موسمِ گل کا سفیر میں بھی نہ تھا

میں کہہ رہا تھا رفیقوں سے جی کڑا رکھو
چلا جو درد کا اِک اور تیر میں بھی نہ تھا

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فرازؔ
سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا

○
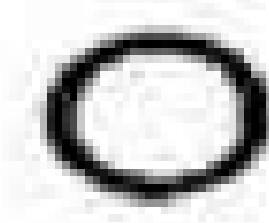
یوں تو محرومِ نواکب سے دہَن میرا تھا
پھر بھی چرچا ہُوا جس کا وہ سخن میرا تھا

میں نے کس نشّۂ نخوت میں کماں کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اُترا وہ بدن میرا تھا

تو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تارِ کفن میرا تھا

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

آخری شامِ خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا

میری آنکھوں نے جو دیکھا مرے لب پر آیا
میری تقصیر ہی بے ساختہ پن میرا تھا

تھی افق تا بہ افق یوں تو مری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

○
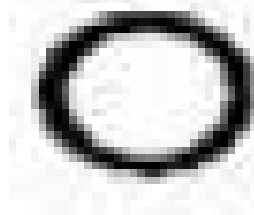
ہوا کے زور سے پندارِ بام و در بھی گیا
چراغ کو جو بچاتے تھے اُن کا گھر بھی گیا

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہُوا دریا کے پار اُتر بھی گیا

اب احتیاط کی دیوار کیا اُٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چُپ رہا کہ اسی میں تھی عافیت جاں کی
کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا

سلگتے سوچتے ویران موسموں کی طرح
کڑا تھا عہدِ جوانی مگر گزر بھی گیا

جسے بھلا نہ سکا اس کی یاد کیا رکھتا
جو نام لب پہ رہا ذہن سے اُتر بھی گیا

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

مگر فلک کو عداوت اسی کے گھر سے تھی
جہاں فرازؔ نہ تھا سیلِ غم ادھر بھی گیا

○

ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اے دل اسے بھلا ہی دے

لٹنے والے سے یوں گریز نہ کر
کیا خبر وہ تجھے دعا ہی دے

جس کے چہرے پہ میری آنکھیں ہیں
وہ مجھے طعنِ کم نگاہی دے

یہ بھی اِک شیوۂ رفاقت ہے
جانے والوں کو راستا ہی دے

جانکنی کے عذاب سے نکلوں
آخری تیر بھی چلا ہی دے

اب تو جیسے فرازؔ بادِ مراد
زندگی کا دیا بجھا ہی دے

کہا نہیں تھا

کہا تھا
اُس شہر کو نہ جاؤ
اب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے
تو رو رہے ہو
کہ اب وہاں تم نہیں
نئے لوگ بس گئے ہیں
کہا تھا
اب شہرِ آرزو
دشتِ جاں رُبا ہے
گئے زمانوں کی خوشبوئیں کب سے مر چکی ہیں
جدائیاں کام کر چکی ہیں
تمہارے نغموں کے نرم پودے
نئی رُتوں کی شدید لُو سے جھلس گئے ہیں
گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں کو
کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں

وہ گفتگوؤں کی آبجوئیں
سکوت کے ریگزار میں دفن ہو گئی ہیں
وہ عہد و پیماں کی فاختائیں
افق کے اُس پار کھو گئی ہیں
کہا تھا...... وہ ساعتیں نہ لَوٹیں گی
جو گئی ہیں

کہا تھا
تم قرب کے نشے میں
اَنا کے مینار چُن رہے ہو
کہا تھا
تم اس وفا کے صحرا میں
اپنی آواز سن رہے ہو
ڈراؤنے خواب بُن رہے ہو
تمہیں بڑا زعم تھا
کہ آنکھوں کے آئنوں سے
ہر انجمن کو سجا رہے تھے
تمہیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لُٹا رہے تھے
کہا تھا
ان آئنوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ

کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا
ان راستوں پر اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے محوِ رقص ہوں گے
یہ آئنے
جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں
تمہارے اشکوں کی کانچ ہے بس
یہ برف کے پیکروں کے شعلے
تمہارے سانسوں کی آنچ ہے بس
فراق کی بات ہی جُدا ہے
یہاں تو آنکھوں سے آئنوں سے
جو عکس اوجھل ہُوا
تو پھر وہ کہیں نہیں تھا
پلٹ کے آئے تو کیا
نہ آئے تو کیا
کہ آنکھیں تو آئنے ہیں
اور آئنوں کو غرض نہیں ہے
کہ کون چہرہ نظر نشیں تھا
وہ کوئی پتھر تھا یا نگیں تھا
کہا نہیں تھا

○

قامت کو تیرے سرو و صنوبر نہیں کہا
جیسا بھی تُو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا

اُس سے ملے تو زعمِ تکلّم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا

اتنی مروّتیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
یاروں نے جو کہا مرے منہ پر نہیں کہا

مجھ سا گناہگار سرِدار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سرِ منبر نہیں کہا

برہم بس اس خطا پہ امیرانِ شہر ہیں
ان جوہڑوں کو میں نے سمندر نہیں کہا

یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فرازؔ خود کو پیمبر نہیں کہا

○
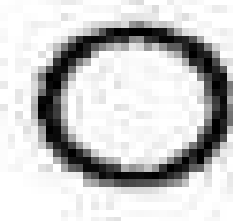
اِتنا بے رنگ دُکھ کو نہیں جاہیے، ہر رگِ جاں شعاعِ بدن ہوئے گی
لوگ پھر سے اُچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوئے گی

تابکے یونہی اختر شماری کرو، جوئے خوں اپنی رگ رگ سے جاری کرو
اور کچھ روز سینہ فگاری کرو، بزمِ خاموش بزمِ سخن ہوئے گی

تم نے ہونٹوں پہ مُہریں لگا دیں تو کیا، تم نے شمعیں نوا کی بجُھا دیں تو کیا
جو حکایت سُنی اَن سُنی ہو گئی، اب وہی انجمن انجمن ہوئے گی

اب تلاشِ مسیحا عبث دوستو، اب جو قاتل ہے بس جستجو اُسکی ہو
ورنہ نامِ خدا ناسزا ہوئے گا، اور خلقِ خدا بے کفن ہوئے گی

رُت کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصلِ دار ورسن ہوئے گی

میں ترا قاتل ہوں

میں ترا قاتل ہوں
اے مشرق مجھے مصلوب کر
میں جو عیسا کے لبادے
میں ترے بیمار فرزندوں کے گھر
آیا تھا
کل چارہ گری کے واسطے
میں نے ان سے کیا کیا
میں کہ درماں بن کے آیا تھا
ترے ناسور زخموں کے لئے
بارود کا مرہم لئے
بندوق کا پرچم لئے
میرے بوجھل بوٹ
جن کی چاپ
تیرے چوبداروں سی تھی

اب کی بار ایسے زلزلے لائے

کہ تیرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے

(اور در و دیوار کے ڈھیروں میں کرلاتا ہُوا

گونگے مکینوں کا لہُو)

خاک وخوں کے اس گلابے سے

میں اپنے بھاری بوٹوں کو نکالوں کس طرح

یہ مری بندوق میرے دوش پر بارِ گراں ہے

اور زمیں مجھ کو نگلتی جا رہی ہے دم بدم

میرے مشرق

جانکنی کے اس مسلسل کرب سے

مجھ کو بچا میرے لہو میں ڈوب کر

میں ترا قاتل

ترا عیسا

مجھے مصلوب کر

○
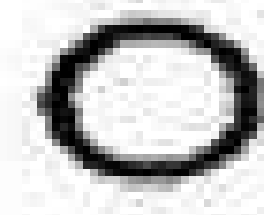
جو سر بھی کشیدہ ہو اسے دار کرے ہے
اغیار تو کرتے تھے سو اب یار کرے ہے

وہ کون ستم گر تھے کہ یاد آنے لگے ہیں
تُو کیسا مسیحا ہے کہ بیمار کرے ہے

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ درو دیوار کرے ہے

کیا دل کا بھروسہ ہے یہ سنبھلے کہ نہ سنبھلے
کیوں خود کو پریشاں مرا غمخوار کرے ہے

ہے ترکِ تعلّق ہی مداوائے غمِ جاں
پر ترکِ تعلّق تو بہت خوار کرے ہے

اِس شہر میں ہو جنبشِ لب کا کسے یارا
یاں جنبشِ مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

تو لاکھ فراز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چُپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

○
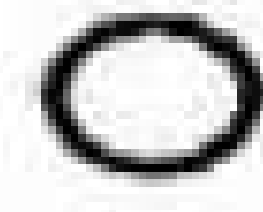
کشیدہ سر سے توقّع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گِلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدّت اسی لگاؤ کی تھی

مگر یہ دردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیلے پار اُتر کر یہ ناخدا نے کہا
مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

چراغِ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہَوا بھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فرازؔ
میں جانتا تھا یہی راہ اِک بچاؤ کی تھی

○

ہر کوئی جاتی ہُوئی رُت کا اشارہ جانے
"گل نہ جانے بھی تو کیا باغ تو سارا جانے"

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

جان نکلی کسی بسمل کی نہ سورج نکلا
بجھ گیا کیوں شبِ ہجراں کا ستارا جانے

جو بھی ملتا ہے ہمیں سے وہ گِلہ کرتا ہے
کوئی تو صورتِ حالات خدارا جانے

دوست احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
کس نے خنجر مرے سینے میں اُتارا جانے

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہوگا کہ فرازؔ
دشمنِ جاں کو بھی تُو جان سے پیارا جانے

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہِ معلّٰی میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اِک گنہگار انساں کھڑا ہے
نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے.
نہ ماتھے پہ محرابِ داغِ ریا ہے
یہ وہ بد مقدّر رہے
جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے
غربال ہے
جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے

ان دائمی اور سقاک سچائیوں کا
کہ جو تُو نے کاذب جہاں کو عطا کیں
یہ مجرم ہے
ان بے غرض جراُتوں کا
جو تُو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں
یہ کہتا ہے
اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انسان سارے برابر ہیں
ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے
الفاظ سب سے مقدّس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے
یہ سرکش
مقدّر کو انساں کا رہوار کہتا ہے
آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر
یہ شوریدہ سر

حرف زن ہے
کہ محراب و منبر سے
فتویٰ گر و فتنہ پردازِ دیں
حرفِ حق بیچتے ہیں
فقیہانِ مسند نشیں
حرصِ دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اِک اِک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیمبر!
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوّتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنّم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

سلام اُس پر!

حسین!

اے میرے سر بریدہ

بدن دریدہ

سدا ترا نام برگزیدہ

میں کربلا کے لہولہو دشت میں تجھے

دشمنوں کے نرغے میں

تیغ در دست دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں

کہ تیرے سارے رفیق

سب ہمنوا

سبھی جانفروش

اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں

گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں

ہوائے جانکاہ کے بگولے

چراغ سے تابناک چہرے. بجھا چکے ہیں
مسافرانِ رہِ وفالُٹ لٹا چکے ہیں
اوراب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارۂ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے
اِک داستاں کا حِصّہ نہیں ہے
اِک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج اسی کربلا میں
بے آبرو نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی

حسینؑ کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عزّ و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لُٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے
سلام اُس پر
سلام اُس پر

○
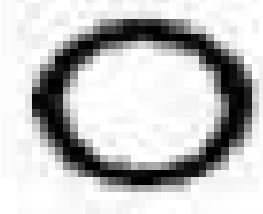
گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی
کیا وصف اس شاعر میں تھا کیا بات اس پاگل میں تھی

ایسا ستم کیا ہو گیا اِک راہرو تھا کھو گیا
پھر زندگی کی شام تھی اور شام بھی جنگل میں تھی

کیا کیا ہوا چلتی رہی یہ لو مگر جلتی رہی
کیا زور اس آندھی میں تھا کیا تاب اس مشعل میں تھی

شعلہ بہ دل آتش بجاں پھرتا رہا وہ بے اماں
ورنہ صبا زلفوں میں تھی ورنہ گھٹا کاجل میں تھی

ترسی ہُوئی آنکھوں میں کن کن ساحلوں کے خواب تھے
پر کشتیٔ عمرِ رواں حالات کی دلدل میں تھی

خلقت نے آوازے کسے طعنے دیے فتوے جڑے
وہ سخت جاں ہنستا رہا گو خودکشی پل پل میں تھی

اپنی کشیدِ جاں سے ہی پیتا رہا جیتا رہا
نشہ کہاں ساغر میں تھا مستی کہاں بوتل میں تھی

شب خون

ڈاکٹر محمد شفیق کے نام

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو میں سجتے تھے
وہ ریت ابھی تک باقی ہے، یہ رسم ابھی تک جاری ہے

ترتیب

اے مری ارضِ وطن!

اے مری ارضِ وطن، پھر تری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے برسے ہُوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اُجڑا ہُوا موسم جیسے
سانس لیتے ہُوئے اِس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اُٹھتا ہے ظالم جیسے

تو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحر مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

اور میں مستِ مئے رامش و رنگِ ہستی
اتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر
یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو ملا؟
جو لٹا دیتا ہے نشّے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مرے گھر کا چراغ
تیرے میخانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا ایاغ
میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چوما
گرچہ جو یائے محبت تھے ترے جسم کے داغ

حجلۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور تھا گر محوِ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹّی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنّائی تھا
ایک پل آنکھ اُٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا

اور اب خواب سے چونکا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
ایک اِک حرف مرا تیرِ ملامت ہے مجھے
تُو اگر ہے تو مرا فن بھی مری ذات بھی ہے
ورنہ یہ شامِ طرب صبحِ قیامت ہے مجھے
میری آواز کے دُکھ سے مجھے پہچان ذرا
میں تو کہہ بھی نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

آج سے میرا ہُنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اُتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلّم ہے پکاروں گا تجھے

میں کیوں اُداس نہیں

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو، ویتنام ہو کہ بٹ مالو[1]
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج اپنا
متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو

نہیں کہ درد نے پتھّر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب، میرے شعر ثبوت
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

---

[1] کشمیر کا ایک قصبہ

بجا کہ امن کے بربط اُٹھائے آج تلک
ہمیشہ گیت محبت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی
بجا کہ پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی پھوار
ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

میں سنگدل ہوں نہ بیگانۂ وفا یارو
نہ یہ کہ میں ہوں کسی خواب زار میں کھویا
تمہیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے
تو بند رہ نہیں سکتا مرا لبِ گویا
وہ مرگِ ہم نفساں پر حزیں نہیں ہے تو کیوں
جو فاطمی و لوممبا کی موت پر رویا

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر
مرا جگر بھی لہو ہے پہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لیے
جز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں نوحے
یہ شہرِ زندہ دلاں آج بھی اُداس نہیں

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم
وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلۂ ما نیست

○

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے بھی دل نذر کیا جاں واری ہے

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو میں سجتے تھے
وہ رِیت ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حشم مے خانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ دیا دیکھا کہ یہ پتّھر بھاری ہے

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اُس وقت سے لے کر آج تلک جلاّد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر اُن کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

کس زعم میں تھے اپنے دشمن شاید یہ اُنہیں معلوم نہ تھا
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

اے مرے شہر!

''جنگ ۱۹۶۵ء میں ۱۳ ستمبر کو کوہاٹ پر بھارت کی وحشیانہ بمباری کی وجہ سے بیشمار معصوم جانیں تلف ہوئی تھیں''

مرے شہر!
میں تجھ سے نادم ہوں
اِس خامشی کے لیے
جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ
بھیگی ہُوئی رات میں
آگ برسا رہا تھا
میں چپ تھا

مرے شہر!
میں تیرا مجرم ہوں
اس بے حسی کے لیے
جب ترے بام ودر

طاق ودہلیز ودیوار

تیرے مکینوں کے

خونِ حنا رنگ سے

تر بتر ہو رہے تھے

تو میں چشم بستہ تھا

اے میرے آباء کے مسکن!

میں تیرا گنہگار ہوں

جب ترے آئینہ رنگ چشموں سے

اک جوئے خوں آملی تھی

تو میرے لبوں پر

کوئی حرفِ ماتم نہ آیا

کہ جب تیرے زرتاب خرمن پہ

سفّاک بجلی گری تھی

تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف

با دلِ چاک و با چشمِ پُرنم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں

اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی

کہ اِس درد کی فصل میں
تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پر
ترا اسمِ اعظم نہ آیا
یہ سب کچھ بجا ہے
یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدّس زمیں!
تیری مٹّی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تُو نے
مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دُکھوں کے سمندر نہ دیکھے
مگر دوسروں کے نمِ چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری رگِل نے وہ احساس بخشا
جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتّھر بنا دم بخود ہو
مگر کاہشِ دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو

مرے شہر!
جب تیرے سینے سے

مینارِ خوں اُٹھ رہا تھا

میں اُس وقت

غافل نہیں تھا

میں بے حِس نہیں تھا

مگر اُس گھڑی میرا سارا وطن

ظلم کی زد میں تھا

میرا سارا چمن

آگ کی حد میں تھا

ساری دُنیا کی مظلومیت، میری آہوں میں تھی

ساری دنیا ہی میری نگاہوں میں تھی

اس سمے

تُو ہی تُو تھا

پشاور کا

لاہور کا

اور

بنگال کا نام، کوہاٹ تھا

کاشمیر

کوریا

ہیروشیما کا ویتنام کا نام، کوہاٹ تھا

ساری مظلوم دُنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا

اے مرے شہر!
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم سہی
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے
فقط تو نہیں ہے

نیا کشمیر

میری فردوس گل و لالہ و نسریں کی زمیں
تیرے پھولوں کی جوانی ترے باغوں کی بہار
تیرے چشموں کی روانی ترے نظّاروں کا حُسن
تیرے کہساروں کی عظمت ترے نغموں کی پھوار
کب سے ہیں شعلہ بداماں و جہنّم بکنار

تیرے سینے پہ محلّات کے ناسوروں نے
تیری شریانوں میں اک زہر سا بھر رکھّا ہے
تیرا ماحول تو جنت سے حسیں تر ہے مگر
تجھ کو دوزخ سے سوا وقت نے کر رکھّا ہے
تجھ کو غیروں نے سدا دست نگر رکھّا ہے

مہ و انجم سے تراشے ہُوئے تیرے باسی

ظلم و ادبار کے شعلوں سے جہاں سوختہ ہیں

قحط و افلاس کے گرداب میں غرقاب عوام

جن سے تقدیر کے ساحل بھی بر افروختہ ہیں

سالہا سال سے لب بستہ زباں دوختہ ہیں

اُن کی قسمت میں رہی محنت و دریوزہ گری

اور شاہی نے تری خلد کو تاراج کیا

تیرے بیٹوں کا لہو زینتِ ہر قصر بنا

تجھ پہ نمرود کی نسلوں نے سدا راج کیا

ان کا مسلک تھا کہ پامال کیا راج کیا

لیکن اب اے مری شاداب چناروں کی زمیں

انقلابات نئے دور ہیں لانے والے

حشر اُٹھانے کو ہیں اب ظلم کے ایوانوں میں

جن کو کہتا تھا جہاں بوجھ اُٹھانے والے

پھر تجھے ہیں گل و گلزار بنانے والے

یہ پرچمِ جاں......

(تحریکِ آزادئ کشمیر کی نذر)

جنّت میں بھڑک رہے تھے شعلے
پھُولوں کی جبیں جھُلس گئی تھی
شبنم کو ترس گئی تھیں شاخیں
گلزار میں آگ بس گئی تھی

نغموں کا جہاں تھا ریزہ ریزہ
اِک وحشتِ درد کُوبکُو تھی
ہر دل تھا بجھا چراغ گویا
ہر چشمِ طلب لہو لہو تھی

میں اور میرے رفیق برسوں
خاموش و فسردہ دل کھڑے تھے
پر جاں کا زیاں قبول کس کو
منزل کے تو راستے بڑے تھے

لیکن یہ سکوتِ مرگ آسا
تادیر نہ رہ سکا فضا میں
اِک شور سا چار سمت اُٹھا
کچھ مشعلیں جل اُٹھیں ہَوا میں

اک رقصِ جنوں ہُوا ہے جاری
یہ رقصِ جنوں نہ رُک سکے گا
یہ شمعِ نوا نہ بجھ سکے گی
یہ پرچمِ جاں نہ جھک سکے گا

چلو پھر ہم صف آرا ہوں

چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں
کہ دشمن چار سُو آئے
کہ قاتل رُو برو آئے
کہ اُن کے کاسۂ خالی میں
کچھ اپنا لہو آئے

کہ بجھ جائے ہر اک مشعل
تو ظلمت کُو بکُو آئے
کہ اہلِ صدق و ایماں بے سہارا ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں کہ پہلے بھی
ستم ایجاد آئے تھے

نشانِ ظلم اُٹھائے تھے
لہو سے تر بتر خنجر
قباؤں میں چھپائے تھے
ہوس کی تُند آندھی نے
دیے کیا کیا بجھائے تھے
جو اب دستِ ستم اُٹھے
مثالِ سنگِ خارا ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں کہ پھر آئیں
تو قاتل سرنگوں جائیں
پشیمان و زبوں جائیں
گنوا کر اپنے جسم و جاں
بہا کر اپنا خوں جائیں
عدو سفّاک ارادوں سے
اگر آئیں تو یوں جائیں
کہ شرمندہ دوبارہ ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں

نشانِ ظلم اُٹھائے تھے
لہو سے تر بتر خنجر
قباؤں میں چھپائے تھے
ہوس کی تند آندھی نے
دیے کیا کیا بجھائے تھے
جو اب دستِ ستم اُٹھے
مثالِ سنگِ خارا ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں کہ پھر آئیں
تو قاتل سر نگوں جائیں
پشیمان و زبوں جائیں
گنوا کر اپنے جسم و جاں
بہا کر اپنا خوں جائیں
عدو سفاک ارادوں سے
اگر آئیں تو یوں جائیں
کہ شرمندہ دوبارہ ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں

سپاہی

اور

موت

کردار:۔

- زخمی سپاہی
- پہلا سپاہی
- دوسرا سپاہی
- موت

(ہوائی جہازوں کی بمباری...... مورچے' لڑائی کا منظر......
آہستہ آہستہ کیمرہ ایک پہاڑ کی طرف رُخ پھر لیتا ہے جہاں برف
سے ڈھکی چوٹی پر ایک زخمی سپاہی برف میں دبا پڑا ہے۔)

سپاہی: کہاں ہوں

مرے جسم پر بوجھ کیسا ہے

کیا میں پہاڑوں کے نیچے دبا ہوں

مری سانس کیوں رُک رہی ہے

یہ ٹھنڈک رگ و پے میں کیوں ہے

مرے بازوؤں میں سکت ہے

نہ ہونٹوں میں جنبش کا یارا

نہ آنکھوں میں ہی روشنی ہے

چٹانوں کی صورت گرانبار پلکیں اُٹھانے سے عاری

تو کیا میری بینائی بھی جا چکی ہے؟

نہ چہرے' نہ منظر

نہ کوئی صدا ہے؟

یہ کیا ہے؟

مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی ہے

فقط دھند ہی دھند

اور برف کے بیکراں سائباں چار سُو ہیں

یہ سکرات کا پَل ہے

یا مجھ پہ کابوس سایہ کناں ہے

...... یہ کیا؟

میرے بازو میں کیوں درد کی لہر اُٹھی

میں زندہ ہوں

لیکن

بدن برف میں دفن ہے

اور چہرہ مرا

زمہریری ہواؤں سے سُن ہو چکا ہے

کسی کو خبر تک نہ ہوگی

کہ میں اِس پہاڑی کی چوٹی پہ زخموں سے چھلنی پڑا ہوں

کوئی مہرباں ہاتھ...... ہمدرد بازو نہیں ہے

جو اس کرۂ مرگ سے مجھ کو باہر نکالے

نہ جانے بہادر رفیقوں کے دستے کہاں ہیں
تو کیا میں یہاں
کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دوں گا
تو کیا اِس پہاڑی کی چوٹی پہ میرے تجسّس میں کوئی
نہ آئے گا
کوئی نہ آئے گا
کوئی......

موت: مگر میں سپاہی
فقط میں ۔ اجل ۔ موت
ازل سے ابد تک
تری غمگسار اور ساتھی
اکیلے دُکھی بے نواؤں کی واحد مسیحا
کہ جو زندگی کی جفاؤں سے تنگ آ چکے ہوں
کہ جو زندگی کی کڑی اور لمبی مسافت سے اُکتا چکے ہوں
کہ جو زندگی کے سرابوں سے
پھیلے خرابوں سے گھبرا چکے ہوں
سبھی نامرادوں کو میں نے ہی آخر سہارا دیا ہے
جنہیں زندگی تج گئی ہو
انہیں صرف میں نے گوارا کیا ہے

ادھر آ...... مجھے ہاتھ دے

میں تری آخری چارہ گر ہوں

تری ہمسفر ہوں

تری راہبر ہوں (موت ہاتھ بڑھاتی ہے)

ادھر آ سپاہی۔ مرے ساتھ چل

یہی وقت ہے

جبکہ تو اِک چراغِ سحر کی طرح

رہگزارِ عدم کا مسافر ہے

آ تجھ کو اپنی حفاظت میں

اِس برف کے تند طوفان سے لے چلوں میں

تجھے کیا خبر

کیسی قاتل ہواؤں کے جھکڑ

ہمارے تعاقب میں ہیں

اے سپاہی مرے ساتھ چل

(ہواؤں کا شور)

سپاہی: کون ہے تو

اجل

فاحشہ!

تجھ کو کس نے پکارا کہ تو

بن بلائے یہاں آ گئی ہے

میں زندہ ہوں

میری نقاہت سے تُو نے یہ سمجھا

کہ میں زندگی سے مفر چاہتا ہوں

مری غیر ہموار سانسوں سے تو نے یہ جانا

کہ میں نزع میں ہوں

پرے ہٹ مرے جسم سے اپنی پرچھائیں کو دُور لے جا

موت: ترا جسم بے حس ہے

اور تیری آنکھوں پہ کہرا جما ہے

تجھے اس کا احساس بھی تو نہیں ہے

کہ تو صرف کہنے کو زندہ ہے

ورنہ اگر تو یہ دیکھے

کہ تیرا لہو کس قدر بہہ چکا ہے

اگر تو یہ دیکھے

کہ یہ لعل و یاقوت

جو تیرے پہلو میں بکھرے پڑے ہیں

ترے ہی لہو کی وہ بوندیں ہیں

جو برف پر جم گئی ہیں

تو جانے

کہ اب زندہ رہنے کی خواہش عبث ہے

چلو میں نے مانا

کہ تجھ میں ابھی زندگی کی رمق ہے

مگر کس قدر

صرف دو چار سانسوں کی مہلت

تری بے بسی اور نقاہت کا یہ حال ہے کہ

ترے زرد رخسار پر برف کی تہہ جمی ہے

مگر تجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں ہے

کہ چہرے سے اِس کو کھرچ دے

....

ترے سامنے جو اندھیرے ہیں ان سے نہ ڈر بے خبر

رات بھی دن سے کچھ مختلف تو نہیں ہے

سپاہی: چلو میں نے مانا

مگر تو بتا مجھ سے کیا چاہتی ہے

موت: زیادہ نہیں

صرف اِتنا کہ تُو مان لے

زندگی اک مسلسل اذیت ہے

تو جس سے تنگ آ چکا ہے

سپاہی: تو......

تو یوں کہہ کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت: کیوں نہیں

اور یہ الزام بھی خود پہ لینے کو راضی ہوں میں

سپاہی: دور ہٹ فاحشہ!

زندگی سے مجھے پیار ہے

موت: باؤلے!

اتنا پاگل نہ بن

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

اب ترے سامنے دوسرا راستہ ہی نہیں

اپنے ہاتھوں کی پیلاہٹیں دیکھ لے

اپنے ہونٹوں کی نیلاہٹیں دیکھ لے

اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹیں دیکھ لے

تو جو مانے تو کیا

اور نہ مانے تو کیا

سپاہی: دشمنِ جاں!

موت: ضد نہ کر دیکھ

اب تیری منزل

تری رات ہر لحہ نزدیک تر آرہی ہے

تری ضد

تیری بیچارگی

کرب واندوہ کو طول دے گی

جانکنی زندگی تو نہیں

چل مرے ساتھ چل

زندگی کے کڑے مرحلے بھول کر

چل۔

سپاہی: نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا

میں ترے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا

موت: اپنا دشمن نہ بن

تیرے پیکر میں تیرا لہو منجمد ہو رہا ہے

ترا یخ زدہ جسم

طوفان کی یورشوں سے نہیں بچ سکے گا

ادھر آ تجھے اپنا آنچل اوڑھا دوں

جو تجھ کو قیامت تلک گرم رکھے گا

او ناسمجھ نوجواں

میرے سینے کی حدت

ترے یخ زدہ جسم کو

سرمدی امن بخشے گی
آ تجھ کو اپنے گلے سے لگا لوں
یقیں کر!
کہ تو کربنا کی کی شدّت سے نالہ کناں ہے
تری بے کسی اور فرماں پذیری
مجھے حوصلہ دے رہی ہے

سپاہی: فریبی!
مجھے اپنی حیلہ گری اور مکّاریوں سے
تہہِ دام لانے کی کوشش نہ کر
کذب گو
میں تو سردی کی شدّت سے بیکل ہوں
تجھ سے تو خائف نہیں۔

موت: خواہ آنسو خوشی کے ہوں یا کرب کے
ایک ہی بات ہے
بے خبر!
شام ڈھلنے کو ہے
اور میدان میں
شب کی پرچھائیاں خیمہ زن ہو رہی ہیں
کسے کیا خبر ہے

کہ تو

اِس پہاڑی پہ گھائل پڑا ہے

تری کھوج پہلے تو مشکل ہے

اور اتفاقاً اگر تیرے ساتھی

تجھے ڈھونڈ بھی لیں

تو حاصل؟

تجھے کیا سکوں مل سکے گا؟

اگر تُو کوئی روز تک اور زندہ رہا بھی تو کیا

پھر سے دُنیا کے دُکھ

زندگانی کے جنجال تیرا تعاقب کریں گے

تری بہتری ہے اسی میں

کہ بے حیل و حجت

یہاں پُرسکوں موت مر جا

سپاہی: ریاکار!

تو اپنی عیاریوں سے مجھے دام میں پھانسنا چاہتی ہے

میں زندہ رہا ہوں

میں زندہ ہوں

زندہ رہوں گا

مجھے تُو ہراساں نہیں کر سکے گی

ابھی مجھ کو جینا ہے

موت: گر تو جیا بھی تو پھر کیا؟

تجھے زندگانی کے بارے میں خوش فہمیاں ہیں

اگر تو جیا بھی

تو کیا تو سمجھتا ہے

اِس زندگی سے محبت کرے گا

جو ٹھٹھرن ہے ذلّت ہے بیچارگی ہے

ذرا سوچ اے بے خبر

زندگی بسترِ گل نہیں

پھر ذرا سوچ

سپاہی: کیا سوچنا

میں تو ہستی کے ہر زیر و بم سے ہوں واقف

مگر تو بھلائے ہُوئے ہے

کہ یہ جنگ ہے

موت: باؤلے!

میں نے مانا کہ تُو جنگ میں

سرخرُو ہو چکا ہے

وطن کی حفاظت کا حق

جان پر کھیل کر تو ادا کر چکا ہے

مگر تجھ کو اِک مرتبہ اپنے گھر اور عزیزوں کے دُکھ پھر سے
تڑپائیں گے

سب زمانے کے غم تجھ کو کھا جائیں گے

سپاہی: جبھی تو مجھے اس قدر بے کلی ہے

کہ میں حملہ آور غنیموں کو جلدی ٹھکانے لگا لوں

تو پھر گھر کو جاؤں

مرے گھر کی دہلیز ہر دم مری منتظر ہے

موت: بجا ہے

اگر گھر ترا منتظر ہو

اگر تیرے گھر کے در و بام باقی رہے ہوں؟

اگر صرف اینٹوں کے انبار اور راکھ کے ڈھیر گھر ہیں

تو پھر وہ ترے منتظر ہیں

(قہقہہ)

کھنڈر چاروں جانب کھنڈر ہیں

سپاہی: تو پھر کیا؟

مرے بازوؤں میں توانائی ہے

میرے کندھوں سے بندوق اُترے تو پھر میرے بازو

کدالوں کے اور بیلچوں کے رفیقِ سفر ہیں

سپاہی خرابوں کو تعمیر کرتا رہا ہے

موت: زمیں جل چکی ہے

سپاہی: میں پہلے بھی ویران خطوں کو زرخیزیاں دے چکا ہوں

موت: مگر اب یہ ممکن نہیں ہے

کہ پانی کے چشمے۔ کنویں اور نہریں

بموں کی لگاتار بارش سے اب خشک اور بے نشاں ہو چکے ہیں

درانتی۔ ہتھوڑے۔ سلاخیں۔ کدالوں کے پھل اور

ہل۔ گویا سب تیرے اوزار۔ ہتھیار تُڑ مُڑ چکے ہیں

سپاہی: مگر تا بکے

میں سپاہی ہوں

گر بخت نے یاوری کی

اور اک بار میرے قدم

اپنے شہروں میں پہنچے

تو پھر سے

یہ مسمار گھر

منہدم کارخانے

جلی کھیتیاں

اور خاموش بازار

یوں جی اُٹھیں گے

کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا

موت: بجا

پر یہ اُس وقت ممکن ہے

سپاہی: لیکن......

موت: ٹھہر تو مری بات سن

یہ تو اُس وقت ممکن ہے جب

تیرے بازو سلامت ہوں اور جسم کا کوئی حصّہ نہ بیکار ہو

مگر ایسے عالم میں بھی

تیری خوش فہمیاں تجھ کو بہکا رہی ہیں

ہلاکت کی آندھی ترے جسم کا ریزہ ریزہ اُڑانے کو پر تولتی ہے

ابھی وقت ہے سوچ لے

سپاہی: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہُوئے اپنے آپ سے) تو کیا کوئی قوت بھی ایسی نہیں ہے

کہ جو موت کے زعم و پندار کو چُور کر دے

کوئی ایسی صورت نہیں

جس سے میں قلعۂ مرگ کو منہدم کر سکوں

نہیں...... آج تک موت پر کس کو قدرت ملی

اگر یُونہی ہوتا رہا ہے

تو پھر کیوں نہ میں خود کو اس کے حوالے ہی کر دوں

کشاکش کا حاصل؟

فقط نزع کا طول۔ اور پھر
ہزیمت شکستِ نفس
(موت کی طرف دیکھتے ہوئے)
موت!
میں صرف اِک شرط پر زندگی کی متاعِ گراں تیرے قبضے میں دینے کو تیار ہوں
موت: شرط!
(قہقہہ لگاتی ہے)
بھلا موت سے بھی کسی نے کوئی شرط منوائی ہے؟
سپاہی: جانتا ہوں کہ میں
دوسروں سے کسی طرح بہتر نہیں ہوں
اگر آج تک کوئی تجھ سے نہ جیتا
تو مجھ کو بھی مرنے میں پھر عذر کیوں ہو
مگر دشمنِ زندگی
صرف اک شرط پر
موت: کونسی شرط؟
سپاہی: بس یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو تو اک روز کے واسطے تو مجھے چھوڑ دیگی
بس اک روز کے واسطے
تاکہ میں اپنے غازی رفیقوں کی صف میں کھڑا
فتح کے گیت گاؤں

ظفر مند پرچم کھلے تو
سلامی کی تقریب میں
دوسرے جاں نثاروں کے ہمراہ میں بھی کھڑا ہوں
مرے کان بھی یومِ نصرت کی توپوں کی گونجار سے گونج اٹھیں گے

اور اُس وقت
جب فتح و نصرت کے نغمات سے
سرزمینِ وطن کی فضا رقص میں ہو
میں عجلت سے گھر جا کے دیکھوں

وہ محبوب چہرے
جو میرے لیے اپنی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو تو
ہاتھوں میں پھولوں کے کنٹھے لیے راستوں پر مرے منتظر ہوں
مرے گاؤں والے
مرے یار احباب مجھ کو
ظفر مند پرچم کی مانند اُٹھا لیں......

اور میں
ان کے اِس خیر مقدم کو
مغرور آنکھوں کی چپ مسکراہٹ سے دیکھوں

فقط اِس قدر
اے مری مسکراہٹ کی دشمن!

موت: نہیں تیری یہ شرط ناقابلِ اعتنا ہے

سپاہی: تو پھر بیسوا!

دُور ہو۔ میں سپاہی ہوں

اور زندگی کی چمکتی دمکتی ہُوئی آگ میرے بدن میں ابھی ہے

میں زندہ ہوں۔ زندہ رہوں گا

موت: مگر کب تلک

سپاہی: جب تلک میری آواز میں زندگی کی لپک ہے

مرا دل دھڑکتا رہے گا

موت: مگر تا بکے

سپاہی: تا بکے؟

جب تلک یہ مراخ زدہ جسم اِن آسمانوں کی مانند نیلا نہ ہو جائے

میں

اِس پہاڑی کی چوٹی پہ دم توڑ دوں گا

مگر تیرے آگے نہ ہرگز جھکوں گا

یہ ممکن نہیں ہے

کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت: حوصلہ! حوصلہ!

اے سپاہی یہ جذباتیت بے اثر اور عبث ہے

اگر مجھ سے تُو ہار تسلیم کر لے

تو یہ زندگی کے اُسی ضابطے ہی کی تائید ہوگی
جو روزِ ازل سے ابد تک رہا ہے
رہے گا
نہ اِس سے زیادہ نہ کمتر
نہ اس سے زیادہ نہ کمتر

(قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے
کچھ دور سپاہیوں کے چہرے جن میں
سے ایک کے کندھے پر برف ہٹانے والا
کدال اور دوسرے کے کندھے پر تہہ کیا
اسٹریچر دھرا ہے۔)

سپاہی: ٹھہر!

مرے ہی رفیقوں کے قدموں کی مانوس آواز میری طرف
بڑھ رہی ہے عجب کیا کہ یہ زخمیوں کے تجسّس میں ہی
آ رہے ہوں

موت: کہاں بے وقوف

سپاہی: اُس طرف

موت: (دیوانہ وار ہنستی ہے۔ قدموں کی چاپ قریب تر آ جاتی ہے)
باؤلے یہ جماعت تو وہ ہے جو لاشیں ٹھکانے لگاتی ہے
سُن تو!

(کدالوں اور بیلچوں کے کھڑ کنے کی آواز)

یہ تیرے درماں نہیں گورکن ہیں

سپاہی: وہ کچھ بھی ہوں زندہ تو ہیں اور زندوں کے دشمن نہیں

یہ مرے شیر دل ہم وطن ہیں

(کیمرہ بلندی سے گھاٹی پر مرکوز ہوتا ہے)

پہلا سپاہی: بہت تھک گئے

اِس پہاڑی پہ چڑھنا غضب تھا

دوسرا سپاہی: یہاں چند سانسوں کو ستانے کے بعد

آگے بڑھیں گے

کہ اب اور چلنے کی طاقت نہیں ہے

پہلا سپاہی: تھکن سے مری ہڈیاں

ریزہ ریزہ ہُوئی جارہی ہیں

پہلا: ترے پاس کھانے کو ہے کچھ؟

دوسرا: کہاں۔ چند سگریٹ بچے ہیں۔ اگر تم......

پہلا: غنیمت ہے یہ بھی۔ قیامت کی سردی ہے

دوسرا: چائے پیئو گے؟ اُبلتی ہُوئی گرم چائے پہ بالائی کی تہہ جمی ہو تو کیسی رہے گی

پہلا: چلو اک پیالہ۔ نہیں دو ہی

دوسرا: یہاں کون زخمی ملے گا؟

(دونوں ہنستے ہیں)

پہلا: تصوّر کی جادوگری خوب ہے

دوسرا: ہاں خیالی پلاؤ کی خوشبو سے بھی کچھ تسلّی ہوئی ہے

(سپاہی کے کراہنے کی آواز آتی ہے)

سپاہی: میں زندہ ہوں۔ زندہ ہوں

اِس بدنفس کو مرے سامنے سے ہٹاؤ

یہ ظالم چڑیل

اپنے بازو پسارے

نمعلوم کب سے مری گھات میں ہے

میں زندہ ہوں

زندہ ہوں مجھ کو بچالو

پہلا سپاہی: سنو جیسے کوئی یہیں پاس ہی ہو

دوسرا سپاہی: ترا واہمہ ہے۔ یہاں کون ہوگا

سپاہی: مرے پاس آؤ رفیقو

مرے سر پہ یہ بے حیا گدھ کی مانند منڈلا رہی ہے

پہلا سپاہی: سُنی تم نے آواز؟

دوسرا سپاہی: ہاں وہ......اُدھر۔ برف میں

دفن لاشہ

پہلا سپاہی: چلو۔ بیلچہ لو۔ وہ زندہ ہے

دوسرا سپاہی: حیرت

اگر اس جگہ لاش ہوتی تو میں اتنا حیراں نہ ہوتا

مگر ایک زندہ سپاہی

یہاں معجزہ ہے

پہلا سپاہی: تو جلدی کرو۔ رات ہونے کو ہے

(دونوں سپاہی زخمی سپاہی

کے قریب آ جاتے ہیں)

دوسرا سپاہی: (چھوتے ہُوئے) واقعی اس میں جاں

ہے ابھی

سنو تم میں اتنی سکت ہے

کہ اِس کو اُٹھا کر ہم اپنے ٹھکانے تلک جا سکیں

پہلا سپاہی: اگرچہ تھکن سے مری ہڈیاں کڑکڑانے لگی ہیں

مگر اِس سپاہی کو دستِ اجل سے بچانا مقدّم ہے

آؤ اِسے ہاتھ دیں

دوسرا سپاہی: اچھا ہُوا ہم اِدھر آ گئے

ورنہ اِس بادوباراں کے طوفاں میں زخموں سے گھائل

مجاہد کبھی بچ نہ سکتا

شہیدوں کی فہرست میں یہ بھی ہوتا

پہلا سپاہی: بس اب وقت ضائع نہ ہو

بیلچے سے تہیں برف کی تم ہٹاؤ

میں اتنے میں کوئی دوا دیکھتا ہوں

دوسرا سپاہی: خدایا......! ذرا اِس کے یخ جسم کو چھو

کے دیکھو

پہلا سپاہی: نمعلوم یہ اب تلک کیسے زندہ بچا ہے

موت: (اپنے آپ سے) یہ کچھ بھی کریں۔ میرے چنگل سے

اس کو نہیں چھین سکتے

یہ نخچیر میرا ہے۔ میں اس کو جانے نہ دوں گی

یہ ہمدرد

دو چار سانسوں کے ساتھی

اِسے راہ میں پھینک جائیں گے یا خود بھی بھوک اور تھکن

ہی سے دم توڑ دیں گے

میں اِن کا تعاقب کروں گی

میں اِن کا تعاقب کروں گی

یہ نخچیر میرا ہے

میرا ہے

میرا ہے

(دونوں سپاہی! اِدھر اُدھر سے برف

ہٹاتے ہیں اور زخمی سپاہی کو اُٹھا کر کندھے

پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوا کا شور
اور برف باری کی شدّت بڑھ جاتی ہے)

پہلا سپاہی: ذرا ہاتھ دو تا کہ میں اِس کو کندھے پہ آرام سے
ڈال لوں

سپاہی کا ہمدرد ساتھی سپاہی ہی ہوتا ہے۔ آؤ ذرا تم اِدھر سے

(زخمی سپاہی کراہتا ہے)

زخمی سپاہی: مرے ساتھیو! تم کو تکلیف ہوگی
یہ رستہ اندھیرا ہے اور پُر خطر ہے
ذرا دیکھ کر......
میرا کیا ہے کہ میں تو
فقط چند سانسوں کا مہمان ہوں......
پر تمہارے لیے زندگی کے مہ و سال کی بے کراں
وادیاں ہیں

پہلا سپاہی: نہیں تم سلامت رہو گے۔ ہمارے وطن کے سپاہی
کہ اب زندگی اور محفوظ رستے پہ تم گامزن ہو چکے ہو

(چلنے لگتے ہیں)

زخمی سپاہی: مگر ظلمتوں سے سبھی راستے ڈھک چکے ہیں
یہ گھاٹی نہایت خطرناک ہے
اپنی جانیں مری زندگی کے لیے مت گنواؤ

دوسرا سپاہی: یہی زندگی ہے۔ سپاہی ہمیشہ سپاہی ہی رہتا ہے
اِس کے لیے ہی خطرناک رستے بنے ہیں
ہماری مسرّت یہی ہے
کہ ہم تم کو زندہ سلامت۔ گجردم وہاں لے چلیں
جس جگہ اس مقدّس زمینِ وطن کے زن و مرد۔
پیر و جواں
یومِ نصرت کے موقع پہ غازی سپوتوں کو
فخر و عقیدت سے دیکھیں گے
توپوں کی گونجار میں ان بہادر جوانوں پہ
تکریم کے پھول برسیں گے
جو جنگ سے سرخرو ہو کے آئے
زخمی سپاہی: مرے واسطے اِس سے بڑھ کر کوئی بھی
تمنّا نہیں ہے
کہ میں بھی وہاں ہوں
مگر دوستو
چند لمحے تو ستا بھی لو۔ تم بہت تھک چکے ہو
پہلا سپاہی: تھکن؟
تم ہماری نہ پروا کرو
ایک بے جان لاشے کو دو گام بھی کھینچنا سخت اذیت ہے

پر ایک زندہ سپاہی کو کندھوں پہ ڈالے اگر سینکڑوں میل کا
بھی سفر ہو تو کچھ بھی نہیں

دوسرا سپاہی: اور سپاہی اگر یوں تھکے تو سپاہی نہیں

پہلا سپاہی: ہوائیں بہت سرد ہیں اور تمہارے ٹھٹھرتے
ہُوئے ہاتھ......اُف کس قدر یخ زدہ ہیں
یہ دستانے لو۔ میرے ہاتھوں میں کافی حرارت ہے

زخمی سپاہی: لیکن

دوسرا سپاہی: سنو! یہ تکلّف کا موقع نہیں

پہلا سپاہی: بس یہ ڈھلوان اب ختم ہونے کو ہے
اور ہم اپنی منزل کے نزدیک آ چکے ہیں

موت: یہ مخلوق کیسی ہے
اک دوسرے سے اِنہیں کس قدر اُنس ہے
یہ مجھے مات دے کر
''اُسے''
میرے نخچیر کو
مجھ سے چھینے لیے جا رہے ہیں
یہ کیسے سپاہی ہیں کتنے نڈر ہیں
کہ میں تھک گئی
اور یہ جا رہے ہیں

مجھے مات دے کر

مجھے مات دے کر

مجھے مات دے کر

(موت منہ کے بل گر پڑتی ہے)

خیال: ترادووسکی

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
کے نام

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اِک بُوند نے طوفان اُٹھایا آخر
تم نے اک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے زلفِ ایّام
حریت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدّس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ اُمّید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہُوئی شعلۂ خورشید بنی

دیکھنا یہ ہے

آج اغیار کے تیروں سے بدن پر میرے
پھر وہی زخم چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
پھر اسی دشمنِ جاں دشمنِ دیں کے ہاتھوں
میرا ملبوس ہے گلرنگ بہاروں کی طرح
پھر مرے دیس کی مٹی سے لہو رِستا ہے
پھر در و بام ہُوئے سینہ فگاروں کی طرح

میرے دشمن، مرے قاتل نے ہمیشہ کی طرح
پھر سے چاہا کہ شکستہ مرا پندار کرے
جس طرح رات کا سفّاک شکاری چاہے
کہ وہ سُورج کی شعاعوں کو گرفتار کرے
یا چراغِ سرِ دیوار کو تنہا پا کر
جس طرح تند ہوا ٹوٹ کے یلغار کرے

میرے دشمن نے یہ سوچا ہی نہیں تھا شاید
یہ دیا بادِ فنا سے بھی بھڑک سکتا ہے
اس کو قوت پہ تکبّر ہے مگر مجھ کو یقیں
دستِ حق بازوئے قاتل کو جھٹک سکتا ہے
میرے جلّاد کو معلوم نہیں ہے شاید
میرا دل دستِ اجل میں بھی دھڑک سکتا ہے

جانے کس زعم میں آیا تھا مقابل میرے
وہ اندھیروں کا پُجاری وہ اُجالے کا عدو
اس نے اک مشعلِ تاباں کو بجھانا چاہا!
اور فضا میں لپک اُٹھے ہیں کروڑوں بازو
میرا مشرق ہو کہ مغرب، مرے سارے اطراف
میری قوت مرا پیکر، میری جاں میرا لہو

دیکھنا یہ ہے کہ اس باطل و حق کے رَن میں
رات مرتی ہے کہ زنجیر سحر ہوتی ہے
آخری فتح مری ہے مرا ایمان ہے یہ
جس طرح ڈوبتے سورج کو خبر ہوتی ہے
میں تو سو بار اسے اپنا مقدّر کر لوں
جس شہادت سے مری ذات امر ہوتی ہے

ترانہ

دائم آباد تیری حسیں انجمن

اے وطن ...... اے وطن

تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے

تیرے شہروں کا سُکھ تاقیامت رہے

تا قیامت رہے یہ بہارِ چمن

اے وطن ...... اے وطن

تیری آباد گلیاں مہکتی رہیں
تیری راہیں فضائیں چمکتی رہیں
مسکراتے رہیں تیرے کوہ و دمن

اے وطن ...... اے وطن

تیرے بیٹے تری آبرو کے لیے
یوں جلائیں گے اپنے لہو کے دِیے
پھوٹ نکلے گی تاریکیوں سے کرِن

اے وطن ...... اے وطن
دائم آباد تیری حسیں انجمن

میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ

۷ا دسمبر ۷۲ء

آج کے دن

مرا چہرہ مری آنکھیں لاؤ

کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں

تو رو دیتا ہوں

وہی آنکھیں

جو گئے سال گئی تھیں تو نہ واپس آئیں

جو سرافراز ہی لوٹی ہیں نہ بے بس آئیں

وہی چہرہ

جو شفق بن کے کِھلا تھا

نہ بنا صبح کا سورج

نہ مری شام کا پیوند ہُوا

مری شعلہ بھری آنکھیں

مرا انگار سا چہرہ لاؤ

کہ مرے ہاتھ مرا دل

مرے بازو مرے ارماں

مرا سارا پیکر

خود کو پہچان سکے

وہ جو بھونچال کل آیا تھا

جو گزری تھی قیامت

اسے نیرنگِ نظر جان سکے

میں ابھی زندہ ہوں

موجود ہوں

یہ میری انا مان سکے

آج کے دن ہی گئے تھے

مرے ساتھی

مری شعلہ بھری آنکھیں

مرا انگار سا چہرہ لے کر

ان اندھیروں کے سمندر کی طرف

جہاں مرتی ہوئی شمعوں کی ضیا چیختی تھی

جہاں نفرت سے حقارت سے

ہر اک موجِ بلا چیختی تھی

کشتیاں کرب سے گرلاتی تھیں

ساحل کی ہوا چیختی تھی

مجھ کو معلوم تھا

بے جاں ہیں رجز کے نغمے

میرے لفظوں میں فنا چیختی تھی

اب نئے سال کی تقویم کا پہلا دن ہے

اور مرے پاس نہ شعلہ بھری آنکھیں ہیں

نہ انگارسا چہرہ ہے کہ میں

اپنے یاروں سے کہوں

تم تہِ دام سسکتے ہو

مگر ہم بھی سرِ شاخِ چمن

دل گرفتہ ہیں

کہ یارانِ صبا کب آئیں

ہم بھی ہر پھول کو ہر خار کو

سینوں سے لگائیں

گل و گلشن کو سجائیں

وہ جوانانِ چمن جب آئیں

نئی تقویم کے اوراق چمک اُٹھیں

اور آئینوں میں
عکس بچھڑے ہُوئے یاروں کے نظر سب آئیں

اے اسیرانِ عدو!
تم تو اس دیس کی مٹی ہو کہ جو
جس قفس میں بھی ہو
زنداں کی فضا مہکے گی
اب اسیری کے نمعلوم زمانوں کو مقدّر کر لو
کس پہ افشا ہے
کہ آزردہ پرندوں کی زباں
کب چہکے!

جانے کس روز مرے شہر کو لوٹے گی
وہ غربت کی بہار
جس میں فصلِ گل و لالہ
نئی شمعوں کی طرح لہکے گی
اور فضا اس طرح دہکے گی
کہ محشر میں جہنّم جیسے
ہر طرف آگ کے دریاؤں میں
شعلوں کا تلاطم جیسے

میری تقویم کے نوروز
پھر اُٹھیں گے
مرے زخم کا پرچم
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر

سرِ میدانِ وفا تم جیسے
آج لیکن مری مانند
ہر اک صحن
ہر اک کھیت
ہر اک راہ میں
مفلوج ادھورا پیکر
چیختا ہے
مری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں

یہ کھیت یہ کھلیان

یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے
پُورے ہُوئے اِک عمر کے ارمان ہمارے
ہم وہ جو کڑی دھوپ میں جسموں کو جلائیں
ہم وہ ہیں کہ صحراؤں کو گلزار بنائیں
ہم اپنا لہو خاک کے تودوں کو پلائیں
اس پر بھی گھروندے رہے ویران ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

ہم روشنی لائے تھے لہو اپنا جلا کر
ہم پھول اُگاتے تھے پسینے میں نہا کر
لے جاتا مگر اور کوئی فصل اُٹھا کر
رہتے تھے ہمیشہ تہی دامان ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

اب دیس کی دولت نہیں جاگیر کسی کی
اب ہاتھ کسی کے نہیں تقدیر کسی کی
پاؤں میں کسی کے نہیں زنجیر کسی کی
بھولے گی نہ دنیا کبھی احسان ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

سیّد الشّہدا ء

دشتِ غربت میں صداقت کے تحفظ کے لیے
تُو نے جاں دے کے زمانے کو ضیا بخشی تھی
ظلم کی وادیٔ خونیں میں قدم رکھا تھا
حق پرستوں کو شہادت کی ادا بخشی تھی
آتشِ دہر کو گلزار بنایا تو نے
تو نے انسان کی عظمت کو بقا بخشی تھی

اور وہ آگ وہ ظلمت وہ ستم کے پرچم
تیرے ایثار ترے عزم سے شرمندہ ہُوئے
جرأت وشوق وصداقت کی تواریخ کے باب
تری عظمت، ترے کردار سے تابندہ ہُوئے
ہو گیا نذرِ فنا دبدبۂ شمر و یزید
کشتگانِ رہِ حق مر کے مگر زندہ ہُوئے

لیکن اے سیدِ کونین حسینؑ ابنِ علیؑ
آج پھر دہر میں باطل کی صف آرائی ہے
آج پھر حق کے پرستاروں کا انعام ہے دار
زندگی پھر اسی وادی میں اُتر آئی ہے
آج پھر مدِ مقابل ہیں کئی شمر و یزید
صدق نے جن کو مٹانے کی قسم کھائی ہے

دل کہ ہر سال ترے غم میں لہو روتے ہیں
یہ اسی عہدِ جنوں کیش کی تجدید تو ہے
جاں بکف حلقۂ اعدا میں جو دیوانے ہیں
ان کا مذہب ترے کردار کی تقلید تو ہے
جب سے اب تک اسی زنجیرِ وفا کا رشتہ
بیعتِ دستِ جفا کار کی تردید تو ہے

ترانہ

لبوں پہ اہلِ امن کے

لہو ترنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

چلو کہ دشمنوں کا یہ گھمنڈ

توڑ دیں

جو ہاتھ ہم پہ ظلم کا اُٹھے

اُسے مروڑ دیں

غنیم پر یہ عرصۂ حیات

تنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

جنگ ہی سہی

کہاں گیا ہے تو

مرے دیارِ پاک کو پکار کر

جو حوصلہ ہے کچھ تو سامنے سے وار کر

اگر جواب خشت و سنگ ہے

تو سنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

جنگ ہی سہی

نہ چاہتے تھے ہم مگر

یہ امتحاں بھی ہو چلے

کہاں ہے لشکرِ ستم

کہ آ گئے ہیں منچلے

اسی کی خاک اسی کے خوں سے

لالہ رنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

ترانہ

اِن چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو
درد کی راتوں کو ڈھلنا ہے ہوا جیسی ہو
شوق کی آگ کو مدھم نہ کرو دیوانو
اپنی آواز کی لَو کم نہ کرو دیوانو
پھر سے سورج کو نِکلنا ہے گھٹا جیسی ہو
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو

یہی مٹی تھی تمہیں جان سے بڑھ کر پیاری
آج اسی خاک سے اک چشمۂ خوں ہے جاری
راہ کتنی ہو کڑی رات ہو کتنی بھاری
ہم کو اس دشت میں چلنا ہے فنا جیسی ہو
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو

اپنے زخموں کو سجائے ہُوئے تاروں کی طرح
پرچمِ جاں کو لیے سینہ فگاروں کی طرح
اِس بیاباں سے گزرنا ہے بہاروں کی طرح
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو
درد کی رات کو ڈھلنا ہے فضا جیسی ہو

ترانہ

اے وطن

جگ جگ جیے تو

اے وطن ۔ اے وطن

تو مری جاں میرا دل میرا لہو

میرا بدن ۔ اے وطن

تیرے آئینے بھی سورج تیرے کانٹے بھی گلاب

تیرے ویرانے بھی جنت کی فضاؤں کا جواب

تو نے بخشا زندگی کو زندگی کا بانکپن

اے وطن

اے وطن جگ جگ جیے تو

اے وطن

تو کسی کا خواب بھی ہے خواب کی تعبیر بھی

تو مرا نغمہ، مرا پرچم، مری شمشیر بھی

رنگ و خوشبو سے گل و گلزار تیرا پیرہن

اے وطن

تیرے دریاؤں سے نغموں کی کھنک آتی رہے

تیرے کہساروں سے پھولوں کی مہک آتی رہے

تیرے پتّھر بھی ہیں موتی تیرے صحرا بھی چمن

اے وطن

اے وطن جگ جگ جیے تو

اے وطن۔اے وطن

ترانہ

مرا بدن لہو لہو

مرا وطن لہو لہو

مگر عظیم تر

یہ میری ارض پاک ہو گئی

اسی لہو سے

سرخرو

وطن کی خاک ہو گئی

مرا بدن لہو لہو

بجھا جو اِک دیا یہاں

تو روشنی کے کارواں

رواں دواں رواں دواں

وفا کی مشعلیں لیے نکل پڑے

یہ سرفروش جانثار چل پڑے

یہاں تلک کہ ظلم کی

فصیل چاک ہوگئی

عظیم تر یہ ارضِ پاک ہوگئی

مرا بدن لہو لہو

غنیم کس گماں میں تھا

کہ اس نے وار کر دیا

اسے خبر نہ تھی ذرا

کہ جب بھی ہم بڑھے

تو پھر رُکے نہیں

یہ سر اُٹھے تو کٹ مرے

مگر جھکے نہیں

اسی ادا سے رزم گاہ تابناک ہوگئی

عظیم تر...... یہ ارضِ پاک ہوگئی

مرا بدن لہولہو

مرا وطن لہولہو

ہر ایک زخم فتح کا نشان ہے

وہی تو میری آبرو ہے آن ہے

جو زندگی وطن کی راہ میں ہلاک ہوگئی

عظیم تر...... یہ ارضِ پاک ہوگئی

تیرے بعد

(بحضورِ قائدِ اعظم)

پھول روتے ہیں کہ آئی نہ صدا تیرے بعد
غرقۂ خون ہے بہاروں کی ردا تیرے بعد

آندھیاں خاک اُڑاتی ہیں سرِ صحنِ چمن
لالہ و گل ہُوئے شاخوں سے جُدا تیرے بعد

جاہ و منصب کے طلبگاروں نے یوں ہاتھ بڑھائے
کوئی دامن بھی سلامت نہ رہا تیرے بعد

جن کو اندازِ جنوں تو نے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بپا تیرے بعد

کس سے آلامِ زمانہ کی شکایت کرتے
واقفِ حال کوئی بھی تو نہ تھا تیرے بعد

اب پکاریں تو کسے زخم دکھائیں تو کسے
ہم سے آشفتہ سرو شعلہ نوا تیرے بعد

پھر بھی مایوس نہیں آج ترے دیوانے
گو ہر اک آنکھ ہے محرومِ ضیا تیرے بعد

راستے سخت کٹھن منزلیں دشوار سہی
گامزن پھر بھی رہے آبلہ پا تیرے بعد

جب کبھی ظلمتِ حالات فضا پر برسی
مشعلِ راہ بنی تیری صدا تیرے بعد

آج پھر اہلِ وطن انجم و خورشید بکف
ہیں رواں تیری دکھائی ہوئی منزل کی طرف

سبھی شریکِ سفر ہیں

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے
یہاں یہ قافلۂ رنگ و بُو اگر ٹھہرے
تو حسنِ خیمۂ برگِ گلاب سب کا ہے
یہاں خزاں کے بگولے اُٹھیں تو ہم نفسو!
چراغ سب کے بُجھیں گے عذاب سب کا ہے

ہمیں خبر ہے کہ جنگاہ جب پُکارتی ہے
تو غازیانِ وطن ہی فقط نہیں جاتے
تمام قوم ہی لشکر کا روپ دھارتی ہے
محاذِ جنگ پہ مردانِ حُر تو شہروں میں
تمام خلق بدن پر زرہ سنوارتی ہے

مِلوں میں چہرۂ مزدور تمتماتا ہے
تو کھیتیوں میں کسان اور خون بھرتے ہیں
وطن پہ جب بھی کوئی سخت وقت آتا ہے
تو شاعرانِ دل افگار کا غیور قلم
مجاہدانِ جری کے رجز سناتا ہے

جلیں گے ساتھ سبھی کیمیا سبھی ہوں گے
اور اب جو آگ لگی ہے مرے دیاروں میں
تو اس بلا سے نبرد آزما سبھی ہوں گے
سپاہیوں کے علم ہوں کہ شاعروں کے قلم
مرے وطن ترے درد آشنا سبھی ہوں گے

میرے اپنے لوگو!

(جنگی قیدیوں کی واپسی پر)

میں بھی اوروں کی طرح

جانبِ در آیا تھا

کہ میں ان آنکھوں کو ان چہروں کو دیکھوں

جو گئے سال گئے تھے

تو نہ واپس آئے

میں بھی آنکھوں کے چراغوں کو جلائے

انہیں رستوں پہ کھڑا تھا

مرے اپنے میرے پیارے لوگو

انہیں رستوں پہ جہاں

ہجر کی تاریک گھڑی

یوں قضا بن کے کھڑی تھی

کہ ٹلے گی ہی نہیں

میں بھی اوروں کی طرح

ہجر کی دہلیز پہ استادہ رہا

آتے جاتے ہُوئے موسم

انہیں گلیوں سے گزرتے ہُوئے

اِک پل کو ٹھہرتے

تو یہ کہتے

''ابھی وہ رُت نہیں آئی

ابھی وہ رُت نہیں آئی''

میں مگر شوق کی دہلیز پہ استادہ رہا

کہ مری طرح کئی ہجر زدہ دل

کئی روتی ہُوئی آنکھیں

کئی بسمل جانیں

آتے جاتے ہُوئے جھونکوں کو صدا دیتی تھیں

کوئی پیغام؟

کسی کُشتۂ بیدار کے نام

اور خاموش ہوائیں جیسے

عمر بجھتے ہُوئے شعلوں کی بڑھا دیتی تھیں

ہر کوئی نقش بدیوار

سرِ راہگزار

ایک سی سب کی طلب

وہ گرانی ہے
کہ پابستۂ زنجیر لگیں
آنے والے مجھے انساں نہیں تصویر لگیں
میں تو آیا تھا
کہ دیکھوں گا انہیں
جو مری طرح مرے ہم وطنوں کی مانند
درد کی آگ میں ڈھل کر بھی توانا ہوں گے
نئی سج دھج سے
نئی سمت روانہ ہوں گے
ان کے جسموں میں مگر
خوں کی رمق بھی تو نہیں
ایسے ویران ہیں چہرے
کہ انہیں اپنی اسیری کا
قلق بھی تو نہیں

وہ گرانی ہے

کہ پابستۂ زنجیر لگیں

آنے والے مجھے انساں نہیں تصویر لگیں

میں تو آیا تھا

کہ دیکھوں گا انہیں

جو مری طرح مرے ہم وطنوں کی مانند

درد کی آگ میں ڈھل کر بھی توانا ہوں گے

نئی سج دھج سے

نئی سمت روانہ ہوں گے

ان کے جسموں میں مگر

خوں کی رمق بھی تو نہیں

ایسے ویران ہیں چہرے

کہ اُنہیں اپنی اسیری کا

قلق بھی تو نہیں

میرے خواب ریزہ ریزہ

شعیب سلطان کے نام

میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری

ترتیب

روشنیوں
کا
شہر

پہلا منظر

(گھڑیال سات بجاتا ہے اور پھر کسی آباد بازار کی مختلف آوازیں فیڈ اِن ہوتی ہیں۔ اِن آوازوں میں محض کاروں کے ہارن، گھنٹیاں، قہقہے اور بال رُوم کی موسیقی ہے)

بوڑھا: (کھانستے ہُوئے، اپنے آپ سے)

اُف یہ جاڑے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے ...... جسم مفلوج ہُوا جاتا ہے
جیسے شریانوں میں تھم جائے لہو کی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خزاں کا موسم
دونوں بے رنگ، حرارت سے تہی ...... دونوں محرومِ تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنّم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو اک پیکرِ خاکستر ہوں
زندگی راکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدّتِ جاں تاب نہیں دے سکتی

اُف یہ جاڑے کی خنک شام

یہ ٹھنڈے جھونکے

(لہجہ بدل کر) خالدہ!

بند کردے یہ دریچے سارے

کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی

میں چراغِ سحری' اور تجھے

طلبِ بادِ شمال

کیا اِسی دن کے لیے تجھ کو جواں ہونا تھا؟

(اپنے آپ سے)

کاش اِس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت

بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات

بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات!

آمنہ: (قدرے دُور سے......سن رسیدہ آواز)

کیا ہُوا؟ کیوں بلاوجہ پریشان ہُوئے جاتے ہو؟

اِک ذرا صبر کرو

آگ روشن کیے دیتی ہوں ابھی

تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو

ایسے مطعون کرو

خالدہ بیٹیوں سے بڑھ کر مری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹتی گرتی ہُوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہارا ابھی بہت ہے ہم کو
جو شب و روز جوانی کے تقاضوں کو نچھاور کر کے
ہم پہ قربان ہُوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کمر بستہ ہے

بوڑھا: آمنہ، کتنی کم فہم ہے تُو
تیری کوتاہ نظر
صرف امروز کی مجرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں
خالدہ کس لیے ہر شام کئی پہروں تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اِس دریچے میں کھڑی رہتی ہے

آمنہ: یوں اگر ہے بھی تو پھر
کونسا ظلم ہُوا!
دن بھر اسکول پڑھانا بھی تو کچھ سہل نہیں
نوکری ایک اذیت ہے، کوئی کھیل نہیں

اور وہ بیچاری تھکن کی ماری
شام کے وقت کبھی اپنے دریچے میں کھڑی
خود کو بہلائے اگر شہر کے نظاروں سے
تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جُرمِ عظیم
کتنے بے درد ہیں احسان فراموش ہیں ہم
کتنے ظالم ہیں ستم کوش ہیں ہم

(دھیمے اور اُداس لہجے میں)

خالدہ! کتنی بد بخت ہے تُو
کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری
تیری قسمت میں نہیں ہے شاید
کہ تری مانگ میں افشاں کے ستارے چمکیں
کہ ترے ہاتھوں میں گلزارِ حنا کے مہکیں
تیری تقدیر میں محنت کے بیاباں ہیں فقط
اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں
کتنی بد بخت ہے تُو!

(سسکیاں لینے لگتی ہے...... دُور سے خالدہ کے گنگنانے کی آواز آتی ہے)

بوڑھا: سُن!

سُن یہ آواز کہ ہے اس میں نہاں

تیری بیٹی کا سسکتا فردا

غم فشاں، نوحہ کناں!

خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر

مجھ کو اس ہنستے ہُوئے شہر سے خوف آتا ہے

اس کے ہنگاموں سے رعنائیوں سے

جگمگاتی ہُوئی راہوں سے، چمکتے ہُوئے بازاروں سے

قہقہوں اور بھٹکتی ہُوئی خوشبوؤں سے

اس کے نغموں سے، حسیں رنگوں سے

اس کی دیواروں سے نظاروں سے خوف آتا ہے

تو نہیں جانتی

اِس شہر کی یہ روشنیاں

چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننھا سا یہ معصوم چراغ

آنکھ کا نور، بڑھاپے کا سکوں...... خالدہ

(خالدہ کی آواز اُبھرتی ہے)

خالدہ: اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے

شام کے سائے روشنیوں میں ڈوب چلے
یہ خوشبو کے بوجھل جھونکے
یہ کرنوں کی نہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

یہ لوگوں کے ہنستے ارمانوں کے روپ
رات ہوئی تو دمک اُٹھی چہروں کی دھوپ
میرے دل میں کیوں ہے اک
انجانے درد کی لہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہی نور
میرے دھیان میں تاریکی ہے، میں مجبور
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں
تو امرت یا زہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

(نغمہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے اور موسیقی سے منظر بدلنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہال میں ایک مصور کی تصویروں کی نمائش ہے، ہجوم کی ملی جلی آوازوں کے اثرات)

دوسرا منظر

آواز نمبر۱: خوب تصویریں ہیں

نمبر۲: کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں

نمبر۱: ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے

نمبر۲: ذرا دیکھو تو

نمبر۱: اس طرف دیکھو یہ تصویر

نمبر۲: ''غزالِ صحرا'' فن کی معراج ہے یہ۔ جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی

نمبر۱: اے مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں

نمبر۲: خوب تصویر بنائی مرے بہلانے کو

نمبر۱: ''صبحِ نو''

نمبر۲: قابلِ داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی

نمبر۱: کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط

نمبر۲: نور و ظلمت کی کشاکش کا عجب منظر ہے

نمبر۱: جس طرح شب کی قبا چاک ہُوئی جاتی ہے

نمبر۲: آبشارِ کلۂ کوہ سے گِرتا ہُوا دریا' توبہ!

نمبر۱: کتنی بپھری ہُوئی ہر موج نظر آتی ہے

جیسے ہر سنگِ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا

جو بھی تصویر ہے شہکار ہے' فن پارہ ہے

سلمیٰ: ارے زاہدہ تم بھی موجود ہو

زاہدہ: کون؟ سلمیٰ...... یونہی بس چلی آئی تھی

اس مصّور کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

سلمیٰ: بڑی خوبصورت تصاویر ہیں

زاہدہ: واقعی فن کے شہکار ہیں

سلمیٰ: جس کو دیکھو وہی نقش ہائے مصّور میں گم' بُت بنا ہے

ارے! خالدہ اور یہاں

زاہدہ: کیوں اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہُوئی

سلمیٰ: بچاری کی تقدیر میں صرف اسکول ہے اور گھر ہے

زاہدہ: مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہُوئی ہے

خدا جانے کیسے بچاری کا مفلوج باپ اور معذور ماں

دونوں اِس کے سہارے پہ زندہ ہیں......
اور خالدہ خود بھی اس عمر میں فلسفی بن چکی ہے
کہ جیسے کسی اور دنیا کی باسی یہاں آ گئی ہو
اِسے آرٹ سے ہے لگاؤ
مگر زندگی کے کسی اور رخ سے محبت نہیں ہے

زاہدہ: بچاری اکیلی کھڑی ہے
چلو اس سے باتیں کریں

سلمٰی: زاہدہ تم نہیں جانتیں
اس کی دنیا اِنہیں سرد تنہائیوں ہی سے آباد ہے
دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے کیسے مبہوت ہے

زاہدہ: اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے محوِ سخن ہو

سلمٰی: چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں

(ہجوم کی آوازیں فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں)

خالدہ: (اپنے آپ سے) یہ تصویر کس شہر کی ہے؟ سماں
کتنا مانوس ہے
جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں
یہ اُونچی عمارات یہ جگمگاتے در و بام۔ روشن دریچے
یہ شفاف سڑکیں، بھڑکتے لبادوں میں خوش باش انساں

حسیں رقص گاہوں میں یہ قمقمے، قہقہے
زندگی، روشنی۔ زندگی، روشنی
اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکاں
نیم واک دریچہ
یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی
اِک کرن سے بھی محروم ہے...... کیوں؟
نہیں، یہ چمکتا ہوا شہر......
اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکاں
جیسے میرا ہی شہر اور...... میرا مکاں ہو
مصّور
مصّور! یہ کس کا مکاں ہے؟

مصّور: یہ کس کا مکاں ہے؟ یہ کس کا مکاں ہے،
مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہوا جگمگاتا ہوا شہر کس کا ہے
اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکاں خود مرے واسطے اجنبی ہے

خالدہ: (چونک کر) کون ہے؟

مصّور: خاتون! میں ہی وہ مجرم مصّور ہوں جس کی پریشان تصویر نے آپ
کے ذہن کو اِتنا اُلجھا دیا ہے،
سبھی لوگ میری بنائی تصاویر کو دیکھ کر جا چکے ہیں
مگر اُن کی آنکھیں

فقط شوخ رنگوں، چمکتی لکیروں، فسوں کار قوسوں میں کھوئی رہی ہیں
سبھی نے فقط جگمگاتے ہُوئے شہر کا نور دیکھا
مگر بھول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا
یہ سایوں کی دنیا، اندھیروں کا مسکن
مصور کا اک نقش نوحہ کناں ہے
یہ ناکام کاوش!
مری ناتمام آرزو اِس ہجومِ فراواں میں بھی
اک نگاہِ کرم کو ترستی رہی ہے
یہ توہین فنکار کی موت ہے
ہاں یہ توہین۔ فنکار کی موت ہے

خالدہ: مصور مگر اس کی...... قیمت؟

مصور: فقط قدر دانی

خالدہ: مرا مدّعا ہے...... اگر میں اسے لینا چاہوں

مصور: نہیں یہ ابھی نامکمل ہے

خالدہ: وہ کس طرح؟

مصور: اس اندھیرے مکاں کا دریچہ
ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا
جس کے رگ و پے میں یہ جگمگاتا ہُوا شہر طوفاں اُٹھالے
مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو

یہی نور و ظلمت کی پیہم کشاکش
مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی
مجھے اس خیالی ہیولے کی، اس پیکرِ خواب کی جستجو ہے
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

(اپنے آپ میں کھوئے ہُوئے لہجے میں)

یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھوگئی ہے
یہ بکھری ہُوئی زلف۔ جیسے زمانے کا دُکھ اِس پہ سایہ فگن ہو
یہ غمگین آنکھیں۔ کہ جیسے کسی خواب گوں جھیل میں
دو کنول شامِ ہستی کے کہرے میں لپٹے ہُوئے ہوں
یہ گلنار لب جیسے باغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجام سے باخبر ہوں
یہ معصوم چہرہ کہ جیسے کسی جگمگاتے ہُوئے شہر پر دھند سی چھا گئی ہو
مسلسل اُداسی میں ڈوبی ہُوئی نوجوانی
خموشی میں بھی نوحہ گر ہے
یہ پیکر وہی ہے جسے میں نے
مغموم صبحوں میں، خاموش شاموں میں، ویران راتوں میں ڈھونڈا
مجھے مل گیا میرے تاریک و تنہا مکاں کا مکیں
(قریب آتے ہُوئے) اجنبی نیک خاتون! میں آپ کی قدردانی کا مشکور ہوں

میرے فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کردوں یہ تصویر
لیکن اگر آپ کچھ روز اس نا مکمل ہیولے کی تکمیل تک ایک زحمت اُٹھائیں

خالدہ: وہ کیسے؟

مصور: مری آرزو ہے کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دریچے میں
اس روشنی کی کرِن کھینچ لاؤں
جو اس جگمگاتے ہُوئے شہر کی تابنا کی سے تابندہ تر ہو
اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے
مرے سامنے آ کے بیٹھیں
تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اِس دریچے کی زینت بنا دوں
یہ شاہکار جس دن مکمل ہو......بس آپ کا ہے

خالدہ: مصور۔ مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
گر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے
تو میں......خواہ کچھ ہو۔ یہاں روز آتی رہوں گی
ارے شام ڈھلنے کو ہے......لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے اب میں بھی جاؤں

مصور: تو کل شام؟

خالدہ: ہاں میں ضرور آؤں گی

آہ اِس شہر کی یہ روشنیاں!

آمنہ: جانے کیوں واہمے بدظن کیے دیتے ہیں تمہیں
خود سے، ماحول سے، بیٹی سے، سبھی دنیا سے!
واہمے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہُوئے بُت پوجتا ہے
ہم کہ اب عمر کی اِس منزلِ تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضو
ایک ہلکی سی کرن
خیرہ کر دیتی ہے آنکھوں کو۔ وہاں
تابِ نظارگیٔ مشعلِ خورشید کسے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اِس تنگ نگاہی کا سبب
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بوڑھا: ٹھیک کہتی ہو مگر
یہ مرے واہمے وہ تلخ حقائق ہیں جنہیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر
یہ چکاچوند، یہ جلووں کا ہجوم
رنگ و آہنگ کا طوفان۔ یہ سیلِ انوار
اک ملمّع ہے، نمائش ہے، دکھاوا ہے جسے

تیسرا منظر

(وہی جو پہلے منظر میں ہے)

بوڑھا: آمنہ!

ہو چکی شام مگر خالدہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی

وسوسے مجھ کو پریشان کیے دیتے ہیں

آمنہ: آج کچھ دیر سے آنے کے لیے اس نے کہا تھا مجھ سے

اس کے اسکول کے پاس

اِک نمائش تھی۔ وہیں آج اسے جانا تھا

ابھی آتی ہوگی

بوڑھا: ہوں، تو اب

اُس کو بھی اس شہر کی رنگینیاں بہکانے لگیں

آخر اس پر بھی یہ پرچھائیاں اب چھانے لگیں

آہ اس شہر کی یہ روشنیاں!

کتنے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں

کتنے تاریک مکانوں کو لٹا دیتی ہیں

اک فسوں کار نے ہر سمت سجا رکھا ہے

ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت

جو فقط ظاہری جلووں سے ہو مسحور مگر

موت کے دام سے بیگانہ رہے

اپنے انجام سے بیگانہ رہے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے)

آمنہ: خالدہ آ گئی۔ بہتر ہے کہ خاموش رہیں

بوڑھا: میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا

میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا

چوتھا منظر

(مصور کا کمرہ' چاروں طرف نامکمل تصویریں بکھری پڑی ہیں'
جن پر گرد کی تہہ جم چکی ہے'مصور 'روشنیوں کے شہر' کی تصویر ایزل
پر رکھے اس کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اب اِک تصویر میں
تاریک مکان کی جگہ روشن مکان نے لے لی ہے)

مصور: تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

میرا دل میری تمنا ' مری جاں ہو جیسے
چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
زلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
حُسن کو پیرہنِ رنگ میں پنہاں کر دوں
جھیل میں پرتوِ مہتاب رواں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسونِ شباب
جس طرح شیشۂ مے سے نہ چھپے عکسِ شراب
آپ سے آپ کھلے جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب

آمدِ صبحِ بہاراں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

کس قدر سادہ و رنگیں ہے جوانی تیری
میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری

ہر مصور تری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ۔ کمرے کا دروازہ
کھلتا ہے اور مصور خاموش ہو جاتا ہے)

مصور: کون؟ تم خالدہ، آؤ بیٹھو

خالدہ: مصور، بڑے خوش نظر آرہے ہو
کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمہیں مل گئی ہو

مصور: بہت خوش ہوں میں، واقعی۔ جس طرح ایک دریوزہ گر کو
کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت

خالدہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ کون حاتم ہے اور کونسی بادشاہت

ہے جس کے سبب تم وفورِ مسرّت سے نغمہ بلب تھے

مصوّر: سخاوت اگر ہو تو ایسی

کہ دستِ کرم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہو

مرے سامنے ہیں وہ بخشندہ و بادشاہت

خالدہ: (مسرّت سے) مصوّر!

مصوّر: مری ناتمام آرزو آج پُوری ہُوئی ہے

یہ تصویر میری تمنّا کی معراج

دیکھو۔ اندھیرے مکاں کے دریچے میں

یہ روشنی کی کرن۔ کس قدر ضوفشاں ہے

خالدہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مرا ہی مکاں تھا

جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟

مصوّر: نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہُوئے ہیں

یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں

ایک فنکار کا غمکدہ، اِک مصوّر کا تصویر خانہ تھا جس پر

زمانے کی بے اِعتنائی کے سائے پرافشاں رہے ہیں

کسی نے تمہارے سوا یہ نہ دیکھا

کہ اس سیلِ رنگ و طرب میں بھی آخر کوئی نوحہ گر ہے

تمہارا کرم تھا کہ تم حسبِ وعدہ

مرے فن کی تکمیل کو میرے ظلمت کدے میں کئی روز تک،
روشنی لے کر آتی رہی ہو

خالدہ: تو کیا اے مصورؔ تمہارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟
تو کیا ہر مکاں تیرہ و تار سایوں میں ڈوبا ہوا ہے؟
یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟
کہاں ہے وہ خورشید، وہ منبعِ نور؟
وہ روشنی کا سمندر
کہ جس کے لیے تیرہ و تار دنیائیں شام و سحر منتظر ہیں
مصورؔ تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں
میرا تاریک گھر اک کرن کو ترستا ہے
اور یہ کرن...... یہ کرن؟

مصور: ہاں تمہاری ہے اور حسبِ وعدہ یہ تصویر حاضر ہے
اب اِس مکاں میں اندھیرا نہیں
یہ بھی اس جگمگاتے ہوئے شہر کا ایک حصّہ ہے
یہ تو دہ تیرگی سیلِ انوار میں گھُل گیا...... مِل گیا......
روشنی تو ملی...... روشنی تو ملی

خالدہ: اچانک تمہاری نگاہوں میں کس سوچ کے دائرے تیرنے
لگ گئے ہیں
یکا یک مسرت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے

جس طرح تیری پل بھر میں ہی چھن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت
کہو...... چپ ہو کیوں...... کچھ تو بولو، مصور

مصور: نہیں کچھ نہیں، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی
محتاج ہیں روشنی کے

تو پھر میں اندھیروں کا باسی
کہ جس کے مقدر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں
کیوں آرزوئے ضیا میں۔ اُجالوں سے شکوہ کناں ہوں
مجھے میری تاریکیاں چاہئیں، صرف تاریکیاں، صرف تاریکیاں
مجھے جگمگاتے ہُوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا ہے
کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا
مصور کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
اسے جگمگاتے ہُوئے شہر سے کیا؟
تو...... خاتون...... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا
کل شام، اسی وقت

خالدہ: تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟
مصور نہ جاؤ...... نہ جاؤ مصوّر،

مصور: مجھے صرف فن سے محبت ہے
شہروں سے، لوگوں سے، صبحوں سے، شاموں سے نسبت نہیں ہے
مجھے آپ سے آپ کا عکس پیارا ہے

جو میں نے خونِ جگر سے سجایا ہے، روشن کیا ہے
اسی کے لیے میں یہاں چند دن رُک گیا تھا
اور اب جب مکمل ہے یہ نقش...... میں جا رہا ہوں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

پانچواں منظر

(وہی جو پہلا منظر ہے)

بوڑھا: آمنہ! ہو چکی شام مگر خالدہ گھر آئی نہیں
جانے کیا بات ہے۔ کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری
آمنہ: ابھی آتی ہوگی
بوڑھا: ابھی آتی ہوگی
اب تو یہ روز کا معمول ہُوا
خالدہ شام سے پہلے کبھی گھر آتی نہیں
اور گھر آئے تو اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتی ہے
نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال
طَور بے طَور ہُوئے جاتے ہیں

اس کے انداز ہی کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

آمنہ: جانے یہ واہمے کب ختم تمہارے ہوں گے
تم کو معلوم تو ہے
خالدہ ان دنوں اسکول میں مصروف بہت رہتی ہے
صبح سے شام تلک
اِک اذیت میں گرفتار ہے نازک بچّی

بوڑھا: چاہے تم کچھ بھی کہو (تلخ لہجے میں) کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

(خالدہ کے قدموں کی چاپ)

آمنہ: خالدہ آ گئی

بوڑھا: کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

خالدہ: کیا ہُوا؟

بوڑھا: خالدہ! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
سن لیا؟ کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ: ماں.....مگر

بوڑھا: بس نہیں جاؤ گی تم

آمنہ: لیکن اتنا سوچو
خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر؟

تم بھی معذور ہو...... میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

بوڑھا: وائے محرومیِ تقدیر کہ جس کے باعث
آج میں اپنی جواں بیٹی پر
بار ہوں...... بارِ گراں
پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا
خالدہ، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مری
اتنی تذلیل کرے
اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا
مری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے
میں بجھا دوں گا ہر اک شمعِ حیات
زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں......
کچھ بھی ہو
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

(شدّت سے کھانستا ہے)

موسیقی

(شام کا منظر۔ گھڑیال سات بجاتا ہے۔ کسی آباد شہر کا بازار
ہارن۔ گھنٹیوں، قہقہوں اور بال روم کی موسیقی کے اثرات)

چھٹا منظر

(وہی پہلا منظر۔ کھڑکی سے روشنیوں کا شہر دکھائی دے رہا ہے۔
موسیقی کی آواز لوگوں کے قہقہوں میں گھلتی جارہی ہے۔ کرسی خالی
ہے۔ خالدہ کھڑکی سے لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہے)

خالدہ: (اپنے آپ سے) آہ یہ شام کس درجہ اندوہ گیں ہے
مگر آج بھی شہر کا ہے یہ عالم
کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہُوا ہو
وہی روز کے زمزمے، قہقہے، قمقمے جیسے جشنِ طرب ہو
وہی جگمگاتے در و بام، روشن دریچے
وہی رقص گاہوں کے منظر
یہ نغموں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں
بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رہگیر، خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی۔ روشنی زندگی
اور میرا امکاں۔ اے مصوّر، یہ تصویر میری نہیں ہے
نہیں...... میری دنیا میں اب تک اندھیرے بسے ہیں
یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصوّر

مصوّر کی خیالی آواز: نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہُوئے ہیں

مجھے جگمگاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا

کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہوا چھوڑ کر

سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا

مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے

میں یہ جگمگاتا ہوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا

کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

خالدہ: مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

مگر...... ہاں۔ تمہیں اپنے فن سے غرض

اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیروں سے

خاموش سایوں سے، ساکن ہیولوں سے اُلفت ہے

تم نقش گر ہو، تمہارے لیے زندگی میں

دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھلملاتے چراغوں لپکتی شعاعوں میں

کچھ بھی نہیں ہے!

فقط کاغذی بُت، خیالی صنم، سرد لاشیں

تمہاری نگاہوں کے مرکز...... مگر بولتی زندگی سے گریزاں

بوڑھا: (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ: (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر

تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور

دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ: نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے

میں کب تک یہ لاشیں اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں

مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے

مصور! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں ہے

کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہوئے شہر کی اک کرن تھے

تمہارا وجود ایک زرتاب ذرّہ تھا جو

اپنے مرکز سے پھر جا ملا

تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے

جوان اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس

اک کرن، ایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے

یہ لاشیں

کہ جن کے لیے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے

اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں

تو کیا وہ مقدّس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر

میں اک لاش بن کر، اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں

تو کیا یہ مری زندگی شپّرک کی طرح

تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی

مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہوا شہر ہے

روشنی کا سمندر ہے
جو سردلاشوں سے بیگانہ ہنستی ہُوئی زندگی کا جہاں ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت مری آرزوؤں کی قاتل
اُدھر روشنی......زندگی
اور اِدھر......موت، اور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر، موت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنالوں؟
میں اِس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اِس کشمکش کا مداوا ہے
میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت، شعاعوں بھرے شہر (دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)

بوڑھا: خالدہ! خالدہ!

(غمگین موسیقی)

آہ اے شہر، چمکتے ہُوئے ہنستے ہُوئے شہر
کتنا بے رحم ہے سفّاک ہے تُو
تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلاّد
تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا، تیغِ ستم
تیرے نغموں کی کھنک، ساغرِ سم
تیری ضوبار عمارات ہیں، مقتل گاہیں
تیری رعنائیاں، آنکھوں کا فریب

یہ ترا حسن ملمّع ہے، نمائش ہے فقط
ریگِ رواں، موجِ سراب!
تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
تُو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا

اے چمکتے ہُوئے شہر
اے چمکتے ہُوئے شہر

ساحل
کی
ریت

(سمندر کی لہروں کا خروش...... آبی پرندوں کی صدائیں
...... بعض ساحل نشینوں کی آوازیں اور قہقہے...... دُور سے
دھیمی آوازوں میں ملاحوں کا گیت سنائی دیتا ہے)

سلیماں: (خود کلامی کے انداز میں)

سمندر کی یہ نیلگوں وسعتیں کتنی سحر آفریں ہیں
ہواؤں کی نمناک خوشبو
تھکے ذہن کو کتنی آسودگی بخشتی ہے

سرِ شام
جب جھلملاتی ہے بھیگی ہوئی روشنی ساحلوں کی
تو کتنے ہی گلرنگ چہرے فضا تاب پیکر سنہرے بدن
چاند تاروں کی مانند اُترتے ہیں
اس تختۂ ریگ پر جس پہ میں بھی کھڑا ہوں
اداس اور تنہا
کوئی بھی تو ان میں نہیں ہے

جو آ کر مرے خواب زاروں کے
خاموش و ویراں جزیروں کو دیکھے
جو تنہائیوں کے سمندر میں ڈوبے ہُوئے
بیس برسوں سے اب تک
زمانے کی آنکھوں سے اوجھل
کسی اجنبی چاپ کے منتظر ہیں
اگر کوئی آتا
تو بس...... میری تنہائیوں کے سمندر کو
ساحل سے ہی دیکھتا
اور پھر لوٹ جاتا
کسے کیا خبر
کون مجبورِ غم ان جزیروں میں محصور
خوابوں کی دنیا میں نوحہ کناں ہے
کہ میں ایک موج
اور منزل مری ہے حبابِ گریزاں
حبابِ گریزاں تلک کب کوئی موج پہنچی
مسافر کے ہمراہ منزل بھی گرمِ سفر ہے

(سمندری لہروں کا اثر)

مری زندگی تا بکے کُہر آلودہ خوابوں میں ڈوبی رہے گی
مجھے اب یقیں ہو چلا ہے
صداؤں کی شمعیں چمکتی رہیں گی
مگر میری خاموش و تاریک تنہائیوں میں اُجالا نہ ہوگا
اُجالا نہ ہوگا...... اُجالا نہ ہوگا

(لہروں کا صوتی اثر اور وحشیانہ قہقہہ)

ہمزاد: اُجالا نہ ہوگا......

سلیماں: کون...... تو کون ہے؟
جو مری سوچ پر خندہ زن ہے
کہ میں تیری آواز سنتا ہوں لیکن تجھے دیکھ سکتا نہیں
کہ میں تیرے قدموں کی آہٹ سے بھی بے خبر اور تو
میرے خوابوں کی گونجار تک سن رہا ہے
بتا کون ہے؟...... تو کہاں ہے؟

ہمزاد: مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں
مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں
مگر میں ترے پاس ہوں
میں ترے ساتھ ہوں
سالہا سال سے
میں تجھے جانتا ہوں

تری سوچ بھی میری نظروں سے مخفی نہیں

میں ازل سے ترا راز داں...... تیرا سایہ

مگر ایسا سایہ جو تاریکیوں میں بھی مرتا نہیں

ظلمتوں میں بھی ہمراہ رہتا ہے

میں تیرا ہمزاد

جو ہر قدم، تیری راہوں کے ہر پیچ و خم

تیری سانسوں کے ہر زیر و بم سے شناسا ہوں

سلیماں: اگر تو مرا راز داں ہے

مری تلخ محرومیوں سے ہے واقف

تو کیا پھر یہی ہے شعارِ وفا

ایک محرومِ قسمت کو تسکین دینے کے بدلے

تمسخر کے نشتر چبھوئے

تو کیا بس ترے پاس اک نامرادِ ازل کے لیے

صرف تضحیک کے تازیانے ہیں

ہمدرد آنکھوں کے آنسو نہیں ہیں

ہمزاد: نہیں تو نہیں جانتا

تو کہ تجھ کو کبھی آج تک میری موجودگی

میری قربت کا احساس ہونے نہ پایا

کہ میں تیری آشفتگی پر

تری زیست کی بیکلی پر شب و روز
آنسو بہاتا رہا ہوں
مگر ایک سائے کی وقعت ہی کیا ہے
جو دیوار کے ساتھ رہ کر بھی
گرنے سے اُس کو نہیں روک سکتا
تری زندگی بھی ہے مائل بہ افتادگی
اور میں ایک بے جان سایہ
مگر سن
یہ آواز
جو زندگی کی صدا ہے
جو میرے لیے میری ہمدردیوں سے سوا ہے
ذرا سن!

(پس منظر سے مانجھیوں کا گیت اُبھرتا ہے)

رُت طوفانی گہرا پانی قدم قدم منجدھار
تیز ہوائیں دل دہلائیں منزل ہے دشوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

جیون اک طوفانی ساگر ہر دم موج کے ریلے
تنہائی کا سفر کڑا ہے ساتھ کسی کو لے لے
کس نے اکیلے صدمے جھیلے کون ہُوا ہے پار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

تیرے خوابوں کی دنیائیں دُور بہت دیوانے
راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے رستے ہیں اَنجانے
بازو شل ہو جائیں تو کب کام آئے پتوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

نغمہ فیڈ آوٹ ہو جاتا ہے
طوفانی لہروں کا صوتی اثر

ہمزاد: سُنا تو نے؟
یہ زندگی کی صدا ہے
جو طوفانِ ہستی میں بھی
کن اداؤں سے نغمہ سرا ہے
یہی تیرے دُکھ کی دوا ہے

سلیماں: نہیں میری محرومیوں کا کوئی بھی مداوا نہیں

اور میں
زندگی کا سفینہ شب و روز کھیتا رہا ہوں
فقط تند لہریں ہی میرا مقدر رہی ہیں
مگر اب مرے دست و بازو بہت تھک چکے ہیں
یہ معمول
دو چار دن کا
برس دو برس کا نہیں
بیس برسوں سے ہر شام
میں اِس سمندر کی بیتابیاں دیکھتا ہوں
یہ موجیں مری آشنا ہیں
میں اِن کے اشارے سمجھتا ہوں
جیسے یہ کہتی ہوں
آؤ......یہیں ہے تمہارے حسیں خواب زاروں کا مدفن
یہاں ایسی گہرائیاں ہیں
کہ جن میں ہمالہ سے کہسار بھی ڈوب جائیں
کہ چشمِ خضر بھی نشاں تک نہ پائے
جہاں اتنی وسعت ہو
اتنی کشادہ دلی ہو
وہاں ایک کمزور انساں

پرِ کاہ سے بھی ہے کم تر

تو پھر کیوں نہ میں

زندگی کا سفینہ

سکوں بخش موجوں میں غرقاب کردوں

ہمزاد: ٹھہر...... یہ ترا واہمہ ہے

تو کہ خود اپنی تنہائیوں کا ہے محرم

ذرا سوچ کیا تیری دنیا میں کوئی نہ آیا

ذرا بیس برسوں کی گزری ہوئی منزلوں کی طرف

لوٹ کر دیکھ

کیا کوئی دل بھی تری آرزو میں نہ دھڑکا

کوئی زلف بھی تیری خاطر نہ بکھری

کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جس کی پلکوں پہ تیرے لیے

آنسوؤں کے ستارے دمکتے

ذرا سوچ ناداں

یہ سب کچھ تھا لیکن

تری زندگی ایک ساحل کی مانند تھی

جو سدا بحر سے لب بلب رہ کے بھی

مستقل تشنگی کی گلہ مند ہو

سوچ! اس تشنہ کامی کا باعث

سمندر ہے یا ریگِ ساحل

سلیماں: مگر کون تھا وہ سمندر؟

مری زندگی تو فقط قلزمِ ریگ ہے

جس میں ہر دم سرابوں کی لہریں ہیں

پانی کی بوندیں نہیں

اور سرابوں کا حاصل

بجز مرگِ تشنہ لبی اور کیا ہے

فقط شوق کی آندھیوں اور تنہائیوں کے بگولوں سے

کب تشنگی بجھ سکی ہے؟

ہمزاد: اور وہ نبیلہ؟

سلیماں: نبیلہ...... نبیلہ

نبیلہ تو صحرا کا بادل تھی

جس کا کرم چند لمحوں کا سایہ

بھلا چند لمحوں کے سائے سے برسوں کی حدّت کہیں کم ہوئی ہے؟

نبیلہ کی آواز...... دو چار لمحوں کی گونجار تھی

اور دو چار لمحوں کی گونجار......

(پس منظر میں گیت اُبھرتا ہے)

بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی
مری زندگی تجھ سے کب آشنا تھی

گھٹائیں اُٹھیں اور ہوا گنگنائی
تڑپتی ہُوئی موج ساحل تک آئی
وہ کیسا سماں تھا وہ کیسی فضا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

بدن میں سُلگتی ہیں چنگاریاں سی
یہی رُت تھی پہلے بھی لیکن جُدا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

جواں ہیں ابھی خواہشوں کے جزیرے
چلو ہم بھی جائیں ادھر دھیرے دھیرے
کہیں پھر نہ کہنا کہ وہ بے وفا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

نبیلہ: بتا میرے ساتھی......

مرا گیت سن کر نہ جانے تمہیں
کیوں خموشی کے گرداب نے آلیا ہے
کہو کیا تمہیں میری آواز سن کر......

سلیماں: نبیلہ مجھے تیری آواز سن کر یہ محسوس ہوتا ہے

جیسے

مجھے کوئی ایسے جزیروں سے آواز دیتا ہو

جو میرے خوابوں میں آباد ہیں

پر مری آنکھ ان کو نہیں دیکھ سکتی

یہ آواز پل بھر کا جادو

جو کانوں میں رس گھول دے

اور آنکھوں سے بینائیاں چھین لے

جس طرح معبدوں کی سُبک گھنٹیاں یک بیک بج اُٹھیں

اور پجاری

وفورِ عقیدت سے سر کو جھکا لیں

مگر اُن کی آنکھیں

دلوں میں بسائے ہُوئے دیوتا کی جھلک کو بھی ترسیں

مرے سامنے تُو ہے...... پھر بھی

مرے سامنے تُو نہیں ہے

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے

سب واہمہ ہے...... یہ سب واہمہ ہے

نبیلہ: سلیماں تمہیں اپنی آنکھوں پہ شاید بھروسہ نہیں ہے

مگر زندگی کی یہ کیفیتیں اتنی سحر آفریں ہیں

کہ خود میں بھی ماحول سے بے خبر ہوں

چلو ان ہی کیفیتوں کے بہاؤ میں بہہ کر
اُفق کے کناروں کو چھو لیں
سلیماں!

سلیماں: نمعلوم کیوں میرا دل مجھ سے کہتا ہے
یہ چند لمحوں کا نشہ
سلگتی ہُوئی زندگی کے لیے اِک فریبِ حسیں ہے
فقط چند لمحوں کا نشہ
کہ جس کے اُترتے ہی
پھر تلخ محرومیاں مجھ کو ڈسنے لگیں گی
یہ رُت' یہ سماں' یہ سمندر کی بھیگی ہوا
یہ فضاؤں کی خوشبو' یہ تیری صداؤں کے گھنگھرو
فقط خواب کے شعبدے ہیں
فقط خواب کے شعبدے
اور خوابوں پہ کب تک بھروسہ نبیلہ

نبیلہ: یہ دو چار لمحے بھی اس زندگی میں بہت ہیں
جہاں ہر طرف اجنبیت کے سائے ہوں
بیگانگی کے اندھیرے ہوں
واں یہ ملاقات...... یہ چند لمحوں کی روشن شعاعیں
بہت قیمتی ہیں

بہت قیمتی......آؤ ہم بھی سمندر کی لہروں کی مانند
اِک دوسرے سے ملیں
اور دو چار لمحوں کی کیفیتوں کو غنیمت سمجھ کر
جُدائی کا احساس تک بھول جائیں
کسے کیا خبر
کل کا دن......اپنے آغوش میں
آج کی شام لائے نہ لائے

سلیماں: یہ لمحوں کی کیفیتیں عارضی ہیں نبیلہ
یہ لہریں
جو اک دوسرے کی تمنّا سے مسحور ہو کر
کبھی آ کے شدّت سے ملتی بھی ہیں تو
فقط ایک پل کے لیے
اور پھر اپنی ہستی بھی کھو بیٹھتی ہیں
فقط عارضی کیفیت کے بہاؤ میں
کیا زندگی ہے؟

نبیلہ: یہی زندگی ہے سلیماں
یہی زندگی ہے
یہی ایک اِک پل تو
برسوں کی پھیلی ہوئی آرزو کی متاعِ گراں ہے

وگرنہ

ازل سے ابد تک اگر کوئی سانسوں کے رشتے ملائے

تو پھر اس کشاکش کی لذت کہاں ہو

جو اک لہر کو دوسری کی طرف کھینچتی ہے

کناروں کو دیکھو

جو اک دوسرے کے مقابل ہیں

لیکن طلب کی کشاکش سے محروم

ان کے لیے زندگی بے حسی ہے

سکونِ مسلسل کے مارے

فقط حسرت و یاس کی ریگ سے مطمئن ہیں

یہ اپنی ہی زنجیر کے صید......

یونہی رہیں گے......ازل سے ابد تک

(سمندری لہروں کا خروش)

ہمزاد: سنا میرے ساتھی

یہی تھی وہ آواز

جو تیری سنسان دنیا میں

لمحہ بہ لمحہ کھنکتی رہی' اور تو اس کو بھی

واہموں کے کھلونوں کی جھنکار سمجھا

یہ صحرا کا بادل سہی
پھر بھی تُو چاہتا تو
سلگتی ہوئی تلخ تنہائیوں کے بیاباں میں
برسوں کے دُکھ کی تپش بھول جاتا
مگر جب تری چشمِ سوزاں ہی
ابرِ کرم سے گریزاں رہی تو
کسی کو پھر الزام کیوں دو
تہی دست ساتھی
سوالی کا یہ حق نہیں ہے
کہ وہ اپنے بخشندۂ مہرباں کی عنایت
کو شک کی نگاہوں سے دیکھے
سلیماں: مگر میں نے کس مہرباں کی عنایات کو
شک کی نظروں سے دیکھا
مجھے بھی بتاؤ کہ کس نے مجھے اپنے دستِ کرم سے نوازا
یہ مانا کہ میں دامنِ دل پسارے
سرِ رہگزر مدّتوں تک رہا ایستادہ
مگر کون ایسا سخی تھا
جو میری طلب کو بھی خاطر میں لایا
بتاؤ!

ہمزاد: نبیلہ

سلیماں: نبیلہ بھی اک رہروِ تیز رَو تھی

اسی رہگزر کی...... جہاں اَن گنت راہرو

اپنے حسن و مروّت کے نادر خزانے لیے

روز و شب

مست و مغرور ہر دم گزرتے رہے

ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا

جو مری تلخ تنہائیوں اور محرومیوں سے

بھری زندگی کو

مسرّت کے دو چار پل بخش دیتا

نبیلہ میں اور دوسرے راہگیروں میں

گر فرق تھا تو بس اتنا

کہ اس کی نگاہوں نے دو چار لمحے

مری بے کسی کا تماشا بھی دیکھا

یہ اس کا کرم ہی سہی

پر تماشائی، اہلِ طلب کا

بھلا آسرا کب بنے ہیں

ہمزاد: نبیلہ تماشائی تھی......ہوں

یہی تو بڑی بھول ہے میرے ساتھی

ذرا یاد کرو وہ سمندر کی اک شام

جب آخری بار تجھ سے نبیلہ ملی

سلیماں: نبیلہ مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی!

مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی؟

(لہروں کا تاثر)

ہمزاد: سمندر کی وہ شام

جب کالے بادل یکا یک اُمڈ آئے تھے

اور فضا وقت سے پیشتر ملگجی ہو گئی تھی

نبیلہ ترے ساتھ کشتی میں بیٹھی

خموشی سے لہروں کے انداز کو دیکھتی جا رہی تھی

(لہروں کا تاثر اور گھٹا کی گرج)

نبیلہ: یہ کالی گھٹا آج برسے گی

نیلے سمندر کی لہروں کا ہیجان بڑھنے لگا ہے

ہوا تیز تر ہو رہی ہے

سلیماں سفینے کو ساحل کی جانب بڑھاؤ

سلیماں: نہیں آج کی شام ہیبت فزا ہی سہی

پھر بھی طوفاں نہ آئے گا

میں جانتا ہوں

گھٹا کی گرج اور لہروں کا یہ شور
کچھ بھی نہیں ہے
کہ طوفاں کی آمد سے پہلے
طیور ایک مخصوص آواز میں چیختے ہیں
ابھی ایسی کوئی علامت نہیں ہے

نبیلہ: سلیماں
تمہیں کیا خبر کتنے طوفان ایسے بھی ہیں
جن کی آہٹ سے تم آشنا تک نہیں
پرندوں کی آواز سے تم فضاؤں کے تیور تو پہچان سکتے ہو
لیکن دھڑکتے ہُوئے دل کی چیخوں سے ناآشنا ہو
وہ طوفاں جو آنے کو ہے
سوچنے کی بھی مہلت نہ دے گا

سلیماں: نبیلہ...... میں سمجھا نہیں
تیری باتوں کے انداز معمول سے مختلف ہیں
تری گفتگو اجنبیت کا پہلو لیے ہے

نبیلہ: فقط گفتگو ہی نہیں بلکہ خود ہم بھی
اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں

سلیماں: وہ کیسے؟

نبیلہ: یقیناً ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں

اور اب ہم جُدا ہو رہے ہیں

سلیماں: مگر میں نے یہ اجنبیت

ملاقات کی اوّلیں شام سے لے کر اب تک نہ محسوس کی

پھر اچانک تمہیں آج کیوں یہ خیال آ گیا ہے

نبیلہ: یہی تو ستم ہے

کبھی تم نے یہ بھی نہ سوچا

کہ میں کون ہوں؟

کیا ہوں اور میں تمہیں کس لیے......

سلیماں: مگر میں نے اِس کی ضرورت نہ سمجھی

ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے

کہ ہم دونوں اک شام

ساحل پہ اک دوسرے سے ملے

اور پھر یہ ملاقات

دونوں کا معمول سا بن گیا ہے

مجھے صرف تجھ سے غرض ہے نبیلہ

فقط تیری موجودگی سے

بس اتنا بہت ہے

کہ جب تو مرے سامنے ہو

تو میں تجھ سے باتیں کروں

تجھ کو دیکھا کروں

تجھ کو پوجا کروں

اس پجاری کی مانند

جو مورتی کی پرستش کو ہی

حاصلِ زندگی جانتا ہو

نبیلہ: مگر تابکے ہم میں یہ اجنبیت کی دیوار حائل رہے گی

مری سانس اپنے ہی پیکر میں گھٹنے لگی ہے

تمہیں پتّھروں سے عقیدت ہے

خوابوں کی دنیا سے وابستگی ہے

مجھے زندگی کی طلب ہے

سلیماں!

مجھے زندگی کی طلب ہے

(بادل کی گرج اور سمندر کا شور)

ہمزاد: وہی آخری شام تھی اس ستارے کی

جو تیری تاریک دنیا میں جلوہ فشاں تھا

مگر تیری بے التفاتی کے کہروں نے

اُس کی دھڑکتی ہوئی جھلملاہٹ کو دھندلا دیا

ہاں تجھے صرف پرچھائیوں کی تمنا تھی

پرچھائیوں سے کیسے روشنی مل سکی ہے

سلیماں: مگر وہ......

ہمزاد: بتا کون ہے تیری محرومیوں اور تنہائیوں کا سبب

بول......تو......یا نبیلہ

سلیماں: مگر وہ تو کچھ ساعتوں کے لیے میری دنیا میں آئی

ہمزاد: یہی چند لمحے تو برسوں کی تنہائیوں کا سبب ہیں

سلیماں: وہ کیا چاہتی تھی

ہمزاد: عقیدت کے سجدے نہیں......زندگی کے دھڑکتے تقاضے

سلیماں: نہیں یہ تری خود فریبی ہے

وہ......وہ......کہاں ہے

ہمزاد: تجھے اس سے اب کیا غرض

اب تری کلبلاتی ہوئی زندگی کا ٹھکانہ

سمندر کی خاموش تہ ہے

سلیماں: نہیں......اس سے پہلے کہ یہ تند موجیں

مری زندگی کے سفینے کو غرقاب کر دیں

میں اس سے ملوں گا

ہمزاد: مگر سوچ پاگل

اسے تجھ سے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا

بیس برسوں کی پھیلی ہوئی تیرگی کا زمانہ

اگر اتفاقاً کہیں تم ملے بھی

تو کیا تجھ کو اِس کا یقیں ہے

کہ تیری نظر اُس کو پہچان لے گی

سلیماں: اگر چہ بڑھاپے کے بے نُور کہرے نے میری نگاہوں کو دھندلا دیا ہے

مگر میرے کانوں میں اب تک وہ آواز محفوظ ہے

جس کو برسوں کی ناآشنائی بھی پہچان لے گی

(موسیقی۔ سمندر کی شام کے اثرات)

سلیماں: سمندر کی یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے

مری زندگی کی طرح

سرد، خاموش، ویراں

فقط چند ساحل نشیں

وہ بھی کہرے میں لپٹے ہُوئے

ایستادہ ہیں

کیا آج کی شام بھی مجھ کو مایوس ہی لَوٹنا ہے

آواز: (دور سے) نگینہ ادھر آ، وَبیٹی یہ لہریں خطرناک ہیں

بس کنارے پہ کھیلو

سلیماں: یہ آواز کس کی ہے

جس سے مری روح تک گونج اُٹھی ہے

آواز: نگینہ......ادھر آؤ بیٹا

سلیماں: وہی ہے......وہی ہے یہ آواز

میں نے جسے سالہا سال تنہائیوں میں سُنا ہے

یہی ہے مری جستجوؤں کا مرکز

مری آرزوؤں کی دنیا

نبیلہ

وہی قد وقامت

وہی دلنشیں نقش موزون پیکر

فقط وقت کے شعبدہ گر نے

بالوں کی کالی گھٹاؤں میں کچھ چاندنی گھول دی ہے

......مگر مجھ کو پہچان بھی پائے گی وہ

میں اس کو پکاروں تو کس نام سے

پاس جاؤں تو کیسے

مرے دل کی دھڑکن

خداوند......کیسے پکاروں

مگر کب تلک یہ کشاکش

یہ لمحہ جو برسوں کے پیہم تجسّس کا حاصل ہے

کیسے گنوادوں......خداوند

خاتون!......(آہستگی سے)

خاتون!!(قدرے بلند آواز سے)

اگر بارِ خاطر نہ ہوتو میں......اک بات پوچھوں

مرا مدّعا ہے مجھے آپ پہچانتی ہیں

خاتون: نہیں تو......مگر آپ کا اس سے مقصد؟

مجھے یہ گماں ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں

خاتون: مجھے؟

سلیماں: ہاں مگر آپ کی کیا خطا

سالہا سال کا بُعد پل بھر کی قربت سے کب مٹ سکا ہے

خاتون: میں سمجھی نہیں اجنبی......آپ کیا چاہتے ہیں

سلیماں: میں کیا چاہتا ہوں؟

سمندر کی اُس شام کی یاد

جب آپ اس اجنبی سے ملی تھیں

خاتون: مگر کب؟

سلیماں: کئی سال پہلے

ذرا اپنے ماضی کے لمحات کو دھیان میں لا کے سوچیں

تو شاید کسی نقش کو آپ پہچان جائیں

خاتون: نہیں......مجھ کو کچھ بھی نہیں یاد

کچھ بھی نہیں یاد

(لہجہ بدل کر) اور یاد ہو بھی تو اب اس کی تجدید سے فائدہ!

اجنبی

زندگی ریگِ ساحل کی مانند ہے

جس کے ہر نقش کو وقت کی تند لہریں مٹا ڈالتی ہیں

(لہروں کا شور اور بادل کی گرج)

آواز: نگینہ! گھٹا چھا رہی ہے اندھیرا بڑھا جا رہا ہے

(دور سے پکارتے ہُوئے) چلو گھر چلیں

سلیماں: ہوا تیز ہونے لگی ہے

(اپنے آپ سے) پرندوں کی آواز میں ایک وحشت سی ہے

جیسے طوفان آنے کو ہو

جیسے طوفان آنے کو ہو

زندگی ریگِ ساحل کی مانند ہے

جس کے ہر نقش کو وقت کی تیز لہریں مٹا ڈالتی ہیں

سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں

سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں

(سمندر کی لہروں کا شور اُبھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

موم
کے
پتّھر

بوڑھا: یہ شب کس قدر سرد ہے میرے آقا

سرِ شام ہی سے ہواؤں کا نم

آج بوجھل تھا

ہر سمت پھیلی ہوئی دھند نے

سامنے کے پہاڑوں کو کفنا دیا تھا

پہاڑی پرندوں کی چیخیں بھی

اب برف میں دب چکی ہیں

چلو اپنے کمرے میں آقا

(خود کلامی کے انداز میں)

انگیٹھی میں گو صبح سے آگ روشن ہے، پھر بھی

دسمبر کی یہ رات

شاید

جہنم کے ایندھن سے بھی گرم ہونے نہ پائے

فریدوں: نہیں

مجھے بیٹھنا ہے ابھی اِس جگہ

جب تلک میرا سینہ

مرے دُکھ کے شعلوں سے دوزخ بنا ہے

بوڑھا: مگر آج موسم بڑا جان لیوا ہے آقا

فریدوں: مجھے زندگی کی ضرورت نہیں

مرا جسم اِس زخم کی زہرناکی سے سُن ہو چکا ہے

جو کچھ روز پہلے

مجھے زندگی کی تمنا نے بخشا

مرے واسطے اب

دسمبر کی یہ برف باری ہو

یا

جون کی چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو

ایک سی ہے

بہاروں......خزاؤں

اجالوں......اندھیروں کے رشتے

فقط زندگی سے عبارت ہیں

اور زندگی

[illegible] ہے بابا

بوڑھا: مگر زندگی تو......

فریدوں: مری زندگی عالیہ تھی

فقط عالیہ

جس سے میرے لہو میں حرارت تھی،

خوابوں میں رونق تھی

سانسوں میں تحریک تھی

اور جسے وقت کے سرد و بے مہر ہاتھوں نے

مجھ سے جُدا کر دیا ہے

مری زندگی چھن چکی

لُٹ چکی

بجھ چکی ہے

مری زندگی!

بوڑھا: گئے وقت کو کون لوٹا سکا ہے

کبھی جانے والے پلٹ کر بھی آئے

اور آئے تو کب...... جب سسکتے ہُوئے منتظر

جسم خاشاک کا ڈھیر بن کر

بگولوں کے گرداب میں ڈوب جاتے ہیں

اور اُن کے ذرّے

قیامت تک اپنے بچھڑے ہُوئے پیکروں کو

نہیں ڈھونڈ پاتے

فریدوں: مگران کے سائے

مگر اُن کی یادیں

ہمیں آخری سانس تک خوں رُلاتی ہیں بابا

بوڑھا: بجا میرے آقا

مگر وقت کا شعبدہ گر

جو قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی

ہر زخم کو اپنی رفتار سے بھر بھی دیتا ہے آخر

بڑے سے بڑا داغ بھی بھول جاتا ہے انساں

فریدوں: مگر یہ مشیت کا کتنا بڑا ظلم ہے آدمی پر

بوڑھا: نہیں میرے آقا نہیں

یہ تو اُس کا کرم ہے

وگرنہ یہ دنیا

جہاں آنسوؤں اور دکھوں کے ذخیرے ہیں

اور جس جگہ قحط ہے راحتوں کا

ہمیں تلخ یادوں سے جینے نہ دیتی

فراموش کوشی کی نعمت تو قدرت کا احسان ہے ہم پہ آقا

ابھی آپ کی زیست کا نخلِ شاداب

پہلی خزاں سے شناسا ہوا ہے

مگر میں کہ اک سالخوردہ شجر ہوں
مری خشک و بے برگ شاخوں نے
برسوں
کڑے موسموں کے ستم اور طوفان دیکھے
مرا تجربہ ہے
کہ انساں اگر بھول جانے کی قدرت نہ رکھتا
تو میں اور میرے سن و سال کے لوگ دیوانے ہوتے
فریدوں: نہیں...... میں نہیں بھولنا چاہتا عالیہ کو
نہ میں بھول سکتا ہوں اس کو
جواب بھی مرے سامنے ہے
وہ دیکھو
ادھر
شہ بلوط اور شیشم کے پیڑوں کی پگڈنڈیوں سے
گزرتی ہوئی دھند میں
روشنی سی بھری ہے
کہ جیسے کسی سیمگوں ابر پارے میں
لپٹا ہوا چاند
آسودگی سے رواں ہے
یقیناً یہ مانوس سی روشنی

عالیہ ہی کے پیکر کی ہے
جس کو اُونچے پہاڑوں
بلوط اور شیشم کے پیڑوں
بلندی سے گرتی ہُوئی آبشاروں سے
اور آسمانوں کی مانند
چاروں طرف پھیلتی دُھند سے عشق تھا
کس ادا سے
وہ میری طرف آ رہی ہے
اُدھر
عالیہ!
عالیہ!!
بوڑھا: خدا کے لیے آپ خود کو سنبھالیں
یہ سوچیں یہ تنہائیاں
آپ کی زندگی کو جہنّم نہ کر دیں
یہ سب واہمے ہیں
فقط واہمے...... صرف آنکھوں کے دھوکے
خیالی ہیولوں سے وابستگی
اور اِن کا تعاقب تو دیوانگی ہے
جنوں ہے

اگر آپ اِس سالخوردہ نمک خوار کی بات مانیں
تو اِن غیر آباد اُونچے پہاڑوں کی وادی کو
کل صبح ہی چھوڑ جائیں
یہاں تلخ تنہائیوں کے سوا اور کیا ہے

فریدوں: یہ سوچیں
یہ تنہائیاں
یہ خیالی ہیولے
یہ اُونچے پہاڑوں کی سنسان وادی
یہی کچھ تو اب زندگی ہے
یہاں دوسروں کے لیے کچھ نہ ہو
پر مرے واسطے
ایک دنیا ہے
میری تمناؤں خوابوں کی دُنیا
یہاں کی فضا عالیہ کی نم آلود آنکھوں کی مانند
سحر آفریں ہے
یہاں کی ہَوا اُس کی سانسوں کی مانند
خوشبو سے بوجھل ہے
نغموں سے پُر ہے
یہاں کے پہاڑوں میں اس کی وفا کی طرح

استقامت ہے
اُس کی محبت کی مانند وسعت ہے
اُس کی نگاہوں کی صورت بلندی ہے
یہ پھیلتی دُھند اس کے خیالوں کی مانند
دلکش ہے خوابوں میں ڈوبی ہُوئی ہے
یہیں اِس فضا اِس ہوا میں
مری جنتِ گمشدہ ہے
میں اپنی متاعِ وفا کو یہاں کس طرح چھوڑ جاؤں

بوڑھا: مگر تابکے!
آپ اس وحشت انگیز ماحول میں
کب تلک رہ سکیں گے
یہاں صرف بے جان پتّھر
فقط پابہ گِل پیڑ
اور ہم سے بے روح انسان ہیں
شہر کی رونقیں ہاؤ ہو...... زندگی
آپ کی منتظر ہے
یہاں آپ تُربت کا پتّھر بنے
کب تلک
زندہ لمحوں پہ روتے رہیں گے

فریدوں: یہ سچ ہے

کہ اب میں فقط سنگِ تربت ہوں

اپنی تمنا کا بے جان سایہ

مگر تم اسی شہر کو لوٹ جانے کو کہتے ہو بابا

جہاں سے مجھے

عالیہ...... اِس سکوں بخش بستی میں لائی تھی

تا کہ مرا فن

جو شہروں کی مسموم تہذیب

مصنوعی تابندگی

اور بیمار اقدار کے محبسوں میں

مقیّد تھا

آزاد ہو کر

نئی زندگی سے لہو لے

نئی زندگی، جو پہاڑوں کی صورت

توانا ہے

چشموں کی صورت رواں ہے

چناروں کی مانند

آتش بجاں ہے

اسے میرے فن سے، مری شاعری سے

پرستش کی حد تک محبت تھی...... بابا
اُسے میری ہر ایک تخلیق سے
والہانہ عقیدت تھی
وہ چاہتی تھی
کہ میرے قلم سے
وہ شہکار ٹپکیں
جو رہتے جہاں تک رہیں
تا ابد جاوداں
اُسے مجھ سے بڑھ کر مرے فن سے وابستگی تھی
مگر میں
جو الفاظ کے بتکدوں کا تھا آذر
فقط عالیہ کے تصور میں
اُس کے خدوخال میں
اُس کی قربت کی لذّت میں
گم ہو چکا تھا
خیالوں کے بیکل ہیولے
مری جنبشِ آذری کو ترستے ترستے ہی
دم توڑ دیتے...... مگر مجھ کو اُن کی فنا کا قلق تک نہ ہوتا
بوڑھا: میں سمجھا نہیں میرے آقا!

فریدوں: مری زندگی جس طلب کی دہکتی ہوئی آگ میں

روز و شب جل رہی تھی

اُسے عالیہ کی وفا کی گھٹا نے بجُھایا

تو جیسے مرے ہونٹ چپ ہو گئے ہوں

مری روح کے جھنجھناتے ہُوئے تار

نغموں کی آغوش میں سو گئے ہوں

اور اک شام جب

عالیہ

طائرِ باد و باراں زدہ کی طرح

راہگیروں کی مشکوک نظروں کے تیروں سے

خود کو بچاتی مرے پاس آئی

تو اُس کی وفادار آنکھوں میں

معمول کی تشنگی کی بجائے

اک افسردگی تھی

عالیہ: فریدوں!

کہو کوئی تخلیقِ تازہ

فریدوں: نہیں

جانے میری طبیعت کو کیا ہو گیا ہے

مرے شوق کا ساز

مدّت سے چُپ ہے

نہ نوحہ نہ نغمہ

کہ جیسے مری زندگی کا خلا

تیری قربت سے پُر ہو گیا ہے

خلا...... جو مرے فن کی صورت میں

میری سسکتی تمناؤں کو

زندگی کا لہو بخشتا تھا

مگر جیسے اب تو

مری سوچ کی تنگنائیوں میں گاتی ہوئی

درد کی ندیاں خشک و بے آب ہیں

اور خیالوں کے پیاسے پرندے

یہاں سے سفر کر چکے ہیں

مری خواہشوں کا سمندر

تری ذات کے ساحلوں میں گِھرا

کس قدر پُرسکوں ہے

اور اب مجھ کو جینا ہے

تیرے لیے...... تیری آسودگی کے لیے

فن تو کربِ مسلسل کے اظہار کا نام ہے

کرب کا سحر ٹوٹے

تو بُت ایک بے ڈول پتھر ہے

نغمہ فقط ایک بے کیف آواز

اور شاعری صرف لفظوں کی بے جان سطریں

مری شاعری اب تمھیں ہو

مرے فن کی معراج

اب تم سے بڑھ کر

مری خواہشوں کے لیے کوئی منزل نہیں ہے

عالیہ: تو پھر یوں کہو

وہ فریدوں جو فنکار تھا

جس کے نغموں سے، گیتوں سے، فن سے

مجھے پیار تھا

مر چکا ہے

مجھے جس فریدوں سے وابستگی تھی

وہ خالق تھا

ان شاہکاروں کا

جو زندگی کے دکھوں ...... راحتوں

آنسوؤں ...... قہقہوں

ظلم کی شدّتوں ...... درد کی لذّتوں

کے امٹ نقش ہیں

نقش گر!

تو نے یہ بھی نہ سوچا

کہ میں تیری تخلیق کے معبدوں میں

فقط اک پجاری کی صورت میں

دیوی نہیں ہوں

مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے

تیری وفا سے نہیں ہے

اجنتا کے غاروں کے نقّاش

دشتِ فنا کے مسافر ہوئے

پھر بھی اُن کے

دل و دست کی کاوشیں

جاوداں ہیں

اگر میری قربت مری چاہتوں نے

ترے شوق کو بے زباں کر دیا ہے

اگر میری آواز کی تشنگی نے

تری زیست کا ہر خلا بھر دیا ہے

تو پھر میں وہ قاتل ہوں

جس نے

ترے جسم کو

شہد کے روپ میں

زہر دے کر

فنا کر دیا ہے

مجھے خود سے نفرت ہے لازم

میں قاتل ہوں

قاتل ہوں

قاتل..... فریدوں

فریدوں: نہیں عالیہ

تو مری زندگی ہے..... مری روح ہے

تجھ سے میری نگاہوں میں تابندگی

میرے دل میں حرارت ہے

پیکر میں جاں ہے

مسیحا!

ترے مہرباں ہاتھ

میرے ہر اک زخم کے چارہ گر ہیں

اگر میری محرومیوں..... میری تنہائیوں

میرے سارے دکھوں کی تپش بجھ گئی ہے

تو اِس کا سبب

میری تسکیں پرستی ہے

تیری وفا تو نہیں ہے

مرے مطمئن روز و شب

میری سوچوں کی میٹھی چبھن لے اُڑے ہیں

میں اب لفظ و معنی کی صورت گری کی بجائے

فقط تیری قربت، تری ہمنشینی کی

آسودگی چاہتا ہوں

میں قدرت کے شہکار کے سامنے

اپنے لفظوں کی تخلیق کو

ہیچ گردانتا ہوں

یہی میرے خونِ جگر کا ثمر

میری برسوں کی دیوانگی کا صلہ ہے

مری عالیہ

میرے ماضی میں اور حال میں کس قدر فاصلہ ہے

عالیہ: فریدوں...... یہ سب کچھ ہی

پھر بھی اپنی نظر میں...... میں مجرم رہوں گی

مجھے بھی ترا قرب

آسودگی بخشتا ہے

مرے واسطے بھی تری انجمن میں

وہ سب کچھ ہے جس کے سوا

زندگی اِک خلا ہے
اندھیری گپھا ہے
مگر ہم
اگر صرف لمحات کے جگنوؤں پر
ازل سے ابد تک
سدا رہنے والے اُجالوں کو
قربان کر دیں
تو یہ کس قدر ظلم ہوگا
ترا فن تو صدیوں کی تابندگی کا امیں ہے
جو میری خوشی اور تیری مسرت سے
بڑھ کر مقدس ہے
بڑھ کر حسیں ہے
مری آرزو ہے فریدوں
کہ تو اپنی عظمت کی اُن چوٹیوں پر کھڑا ہو
جہاں سے تجھے ساری دنیا کی آنکھیں
عقیدت سے دیکھیں
مرے روشنی کے فلک بوس مینار!
میری تمنا کے معیار
میں تجھ پہ نازاں رہوں گی

فریدوں: مرے فن کی معراج!

خوابوں کی تعبیر!!

اگر تیری چاہت کا معیار یہ ہے

تو میں زندگی کا ہر اک پل

ہر اک سرخوشی

ہر تمنا......تری آرزو پر نچھاور کروں گا

مرا عہد ہے عالیہ

آج سے میرے دل اور مرے ذہن کی سب

حرارت......توانائی

خونِ جگر کی ہر اک بوند!

فن کی بقا کے لیے صرف ہوگی

عالیہ: فریدوں

ترا عہد میری وفاؤں کا ضامن رہے گا

فریدوں: مگر مجھ کو اس شہر کے روز و شب

اس کی ہنگامہ پرور فضا

شور و طوفاں بھری زندگی سے

کہیں دور جانا پڑے گا

جہاں میں سکوں کے سمندر سے

افکار کے ایسے موتی چنوں

جو ترے درخورِ اعتنا ہوں

عالیہ: یہی میں بھی کہنے لگی تھی

یہاں سے فقط تین سو میل کے فاصلے پر

پہاڑوں کے سینے پہ کہسارِ مرجان کے نام کی

ایک بستی ہے

یہ بادلوں اور گھٹاؤں

سلگتے چناروں حسیں آبشاروں

مہکتے ہُوئے لالہ زاروں

خوش الحاں پرندوں کی دنیا

کسی وقت میں

آریائی قبیلوں کا مسکن رہی ہے

مگر اب فقط

علم تاریخ کے ماہروں اور اہلِ سیاحت

کی نظروں کا مرکز ہے

تخلیق و تصنیف کے واسطے

انتہائی مناسب رہے گی

گزشتہ کئی ماہ سے میرے ابّو بھی

جو ایک تاریخ داں ہیں

وہیں جاگزیں ہیں

بڑی خوبصورت جگہ ہے

فریدوں: یہ سب کچھ سہی پر......

عالیہ: تمہیں واں رہائش کی بھی کوئی زحمت نہ ہوگی

فریدوں: مگر......

عالیہ: میں بھی کچھ روز تک وہاں چلی آؤں گی

میرے ابّو نے مجھ کو بلایا ہے...... جو اپنی تخلیق کے سلسلے میں

ابھی کچھ مہینے وہیں ہیں

فریدوں: تو پھر ٹھیک ہے

کچھ دنوں تک میں اِس شہر سے چل پڑوں گا

عالیہ: تو یہ طے ہُوا

فریدوں: ہاں

عالیہ: تو بس ٹھیک ہے اب اجازت

فریدوں: خدا حافظ اے میری دنیا

عالیہ: مسافت بخیر!

(موسیقی)

پروفیسر: مجھے عالیہ نے لکھا تھا

کہ آپ آ رہے ہیں

یہ بستی کم آباد اور پُرسکوں ہے

مجھے شاعری سے زیادہ شغف تو نہیں ہے
مگر عالیہ میری بیٹی کی تحریر سے یہ عیاں ہے
کہ وہ آپ کی شاعری اور فن کی
بڑی معتقد ہے

فریدوں: یہ ان کی فقط قدر دانی ہے
ورنہ مرا فن ابھی
اس مقام اور عظمت سے نا آشنا ہے
جو اوروں کی تعریف کا مستحق ہے

پروفیسر: یہاں کی فضا میں وہ جادو ہے
جو اک مؤرخ کو بھی شعر کہنا سکھا دے

(وقفہ دے کر)

مجھے ان پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے
گزرے ہوئے قافلوں کے
نقوشِ قدم ڈھونڈنے ہیں
مؤرخ تو ماضی میں رہتا ہے
لیکن یہاں حال اتنا حسیں اور زندہ ہے شاعر
کہ میں سوچنے لگ گیا ہوں
یہاں کوئی ماضی نہیں تھا

بہر حال اگر آپ چاہیں تو

جب تک یہاں ہیں

مرے ساتھ ٹھہریں

یہاں آج کل ایک سیاح بھی

میرے ہمراہ ٹھہرا ہُوا ہے

بہت خوش مزاج اور انوکھے خیالات کا نوجواں ہے

اگر آپ بھی ہوں

تو جنگل میں منگل کا عالم رہے گا

فریدوں: کرم گستری

آپ کا قرب میرے لیے عین راحت ہے

پر میں نہیں چاہتا

میری موجودگی آپ کے روز و شب میں مُخل ہو

اگر مل سکے تو مرے واسطے ڈاک بنگلہ مناسب رہے گا

پروفیسر: چلیں جس طرح آپ خوش ہوں

یہاں ڈاک بنگلہ بھی خالی پڑا ہے

اگرچہ جگہ پُر فضا ہے مگر پھر بھی تنہائیاں جان لیوا ہیں

کوئی تو ہو، جس سے کچھ دیر کو آدمی گفتگو کر سکے

میں یہاں کچھ مہینوں سے ہوں

اور گاہے بہ گاہے اگر کوئی سیاح

یا کوہ پیماؤں کا کوئی ٹولہ
ادھر آ گیا تو یہ سب سے بڑی خوش نصیبی ہے
ورنہ یہ جنت...... جہنّم سے بڑھ کر عذاب آفریں ہے
اسی واسطے عالیہ کو بھی میں نے لکھا ہے
کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، کوہ مرجان آئے

فریدوں: بجا یہ مرا بھی تاثر ہے
اتنی کم آباد بستی میں انساں کا ملنا مسیح و خضر
کی ملاقات سے بھی ہے بہتر
تو میں شام تک ڈاک بنگلے سے آ جاؤں گا

پروفیسر: ہاں وہ سیّاح بھی جب تلک لوٹ آئے گا
اور خوب محفل رہے گی

فریدوں: بہت خوب

پروفیسر: ٹھہریں، کسی شخص کو آپ کے ساتھ کر دوں

فریدوں: نوازش...... مرے ساتھ میرا پُرانا ملازم بھی ہے
جو یہاں کی ہر اک راہ سے آشنا ہے

پروفیسر: تو پھر شام کو آپ آئیں گے

فریدوں: جی ہاں

(موسیقی)

(قہقہوں کی آواز، پیالیوں کی کھنک)

پروفیسر: چلو اب یہیں بحث کو ختم کر دیں
مؤرّخ سے شاعر کا رتبہ بڑا ہے

عالیہ: نہیں یوں نہیں
آپ یہ مانتے ہیں
کہ اِس روز و شب کی مسافت میں جس موڑ پر بھی
اندھیری گپھائیں ملی ہیں
تو تاریخ کی آنکھ پتھرا گئی ہے
مگر شاعری کی نوا تیرگی کی سلیں چیر کر
روشنی کے وہ سیلاب لائی
کہ جس کی چکا چوند کی تاب، چشمِ مؤرّخ نہیں لا سکی ہے
مؤرّخ تو میری نگاہوں میں
اس شپرّک کی طرح ہے
کہ جس کا ٹھکانہ
شکستہ در و بامِ مدفون آبادیوں اور مسمار قبروں
کے کتبے رہے ہیں
فقط بادشاہوں کے اُجڑے محلّات اور مقبروں کے
سن و سال کی یاد...... اُس کی متاعِ عمل ہے
ہیون سانگ سے ابنِ خلدون اور بعد تک کے مؤرّخ
سبھی صرف حیرت کے ساحل سے بس بے گہر سیپیاں چُن سکے ہیں

مگر دُرِ شہوار۔ ہومرؔ، سفوکلیسؔ، ملٹنؔ، سین تانگؔ، فردوسیؔ
اور شیکسپیئرؔ کا مقدر رہے ہیں

پروفیسر: اور سیاح؟

عالیہ: ابو! سیاحت تو اک انفرادی مسرت ہے
جس کا تعلق ہمہ گیر قدروں سے ہرگز نہیں ہے
مجھے کیا، اگر آپ نے نینوا اور بابل کے منظر
اجنتا کے غاروں کی نقاشیاں، مصر کے
آسماں بوس اہرام، یونان کے سنگ پیکر
عرب کے مقدس مقامات یا کافرستاں
کی وادی کو دیکھا
مگر کیٹسؔ، خیامؔ، حافظؔ، شیلےؔ، بائرنؔ
اور غالبؔ کے شہکار سب کے لیے
دولتِ مشترک ہیں
اِک ایسی مسرت جو ہر دَور میں ہر کسی کے لیے ہے

فریدوں: نہیں یوں نہیں ہے
مورّخ میں سیاح میں اور شاعر میں جو فرق ہے
وہ بجا...... پر کسی ایک کا دوسرے سے تقابل غلط ہے
میں خود ایک شاعر ہوں پھر بھی مورّخ کے اعلیٰ مقام
اور سیاح کی عظمتِ رہ نوردی سے منکر نہیں

آپ کی گفتگو کچھ دل آزار پہلو لیے ہے

پروفیسر: مجھے بھی یہ کہنا تھا بیٹا...... یہ سیاح مہمان ہیں

اور

سیاح: نہیں مجھ کو کوئی شکایت نہیں

اور نہ زعم اور دعویٰ ہے کوئی

سیاحت تو محض ایک تفریح ہے

یہ جُدا بات میں فنِ تخلیق و تحقیق سے اس کو کمتر نہ سمجھوں

پروفیسر: چلو بات کو ختم کر دیں

اور اب عالیہ گرم کافی پلاؤ

فریدون بیٹا کوئی تازہ تخلیق؟

سیاح: ہاں آپ کے فن کی عظمت کے سب معترف ہیں

کوئی نظم؟

(موسیقی)

(چڑیوں اور پرندوں کی چہکار)

عالیہ: فریدوں کہو یہ فضا تم کو اچھی لگی؟

فریدوں: ہاں بڑی خوبصورت جگہ ہے

یہاں کا سکوں، حسن اور پھر تمہاری رفاقت

مری ذات اور میرے فن کے لیے کیمیا ہے

عالیہ: تمہیں میرے ابّو ......

فریدوں: بہت ہی پسند آئے، اُن کی طبیعت کی نرمی، ملنسار لہجہ

محبت بھرا دل

اور اِن سے سوا

اُن کا بے انتہا علم، جس نے اُنہیں ایک نادر معلّم کا رُتبہ دیا ہے

مرے واسطے ان کی قربت بڑی قیمتی ہے

عالیہ: مگر اُن کی آواز میں کتنا دُکھ ہے فریدوں

فریدوں: مجھے بھی یہ محسوس ہوتا رہا ہے

وہ جب بولتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کسی درد کی آگ

لفظوں سے لپٹی ہوئی ہے

عالیہ: یہ دُکھ بیس برسوں سے اُن کو شب و روز

گھُن کی طرح کھا رہا ہے

مری ماں کا دُکھ

جو مجھے یاد تک بھی نہیں ہے

مری عمر مشکل سے جب دو برس تھی

اک ایسی ہی بستی میں اُونچی پہاڑی کی ڈھلوان پر سے

پھسل کر...... وہ ہم سے جُدا ہو گئی تھی

مجھے یاد تک بھی نہیں ہے

مگر میرے ابّو اسی دُکھ کو دل سے لگائے سلگتے رہے ہیں

اسی واسطے اُن کو ماضی سے، ماضی کی ہر شے سے اُلفت ہے

چاہے وہ تاریخِ عالم کا قصہ ہو یا بُوئے رفتہ کی یادیں

وہ مجھ کو بہت چاہتے ہیں

کبھی بھی نہ میری کسی بات پر ان کی تیوری چڑھی ہے

نہ وہ مجھ سے رُوٹھے ہیں

میں نے بھی ان کی ہر اک بات کو فرض سمجھا

فریدوں: عجب بات ہے عالیہ

ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں جاں کا زیاں جانتے ہیں

اُسی دُکھ کی شدّت

ہمارے شب و روز کے آئنوں کو جِلا بخشتی ہے

یہی دُکھ اگر جسم کا جزو ہو

تو نتیجہ فنا ہے

مگر روح میں رچ سکے تو

اسی پیکرِ آب و گِل کو پیمبر بنا دے

امٹ، بے کراں، جاوداں

سیاح: (داخل ہوتے ہُوئے)

ارے تم ابھی تک

یہاں کاغذوں کے پلندوں میں ڈوبے ہُوئے ہو

کبھی تو خیالی فضاؤں سے باہر نکل کر

ذرا جاگتی زندگی کے دھڑکتے ہُوئے رنگ دیکھو
فضا میں برستی ہُوئی برف کا رقص
دیوانہ گر ہے

فریدوں: فضاؤں کا منظر بہت خوبصورت سہی
پر مجھے اِس گھڑی اپنی دنیا سے فرصت نہیں ہے

عالیہ: فریدوں چلو گھوم آئیں

فریدوں: نہیں عالیہ اِس سے مجھ کو معذور سمجھیں

سیّاح: تو پھر عالیہ آپ آئیں...... ہم اُن کے خیالات
میں کیوں مخل ہوں

عالیہ: چلو گھوم لیتے ہیں۔ اور ہاں فریدوں
ہماری طرف شام کو آؤ گے
ذرا آج ابّو سے محفل رہے گی

فریدوں: یقیناً۔ مگر عالیہ

عالیہ: کیوں فریدوں

فریدوں: نہیں کچھ نہیں' بے ارادہ ہی کچھ کہہ دیا تھا

سیّاح: یہ شاعر عجب لوگ ہوتے ہیں' ہر دم خیالوں میں گم صم
گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے

(عالیہ اور سیّاح ہنستے ہُوئے نکل جاتے ہیں)

فریدوں: (اپنے آپ سے) گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے

اندھیرے اُجالے

اُجالے اندھیرے

یہی زندگی ہے

کہیں ناچتے تند شعلے

کہیں برف کا رقص جاری

یہ کیوں ایک بے نام سا خوف مجھ پر ہے طاری

مرا وہم میرے خیالوں کی جادوگری ہے

وگرنہ مری عالیہ

میرے خوابوں کی پیکر

کہ جس کی وفادار آنکھوں کو

کوئی کشش بھی نہ بہکا سکی ہے

نہ بہکا سکے گی

اندھیرے اُجالے

اُجالے اندھیرے

(فیڈ آوٹ)

عالیہ: (داخل ہوتی ہے)

فریدوں ابھی تم یہیں ہو

وہاں ہم بھی منتظر تھے تمہارے
چلو آج کی شام اکٹھے گزاریں
کہ کل کی شعاعِ سحر...... کیا خبر
کیا دکھائے

فریدوں: میں سمجھا نہیں عالیہ

عالیہ: بات یہ ہے کہ سیاح کل جا رہا ہے

فریدوں: مگر یوں اچانک!!

عالیہ: عجب لااُبالی طبیعت ہے اُس کی
وہ کہتا ہے سیاح دریا ہے جوہڑ نہیں ہے
حقیقی سیاحت تو ملکوں سے شہروں سے ہو کر گزرنا ہے
رکنا نہیں ہے
اگر ایک سیاح سمجھے
کہ کوئی جگہ اُس کو دل سے پسند آ گئی ہے
تو اُس کے لیے بہتری ہے اِسی میں
کہ فوراً وہاں سے وہ چل دے
ہر اک چیز کا حسن بس اجنبیت کی حد تک ہے
چاہے وہ نادیدہ خطّے ہوں یا صورتیں ہوں
مجھے یہ جگہ اور پھر آپ لوگوں کی قربت پسند آ گئی تھی
اِسی واسطے میں نے کل کوچ کا فیصلہ کر لیا ہے

فریدوں: چلو...... اس کی مرضی

عالیہ: مگر جانے ابّو کو کیا ہو گیا ہے

وہ اِس پر مصر ہیں کہ سیاح کچھ روز تک اور ٹھہرے

فریدوں: مگر کیوں؟

عالیہ: نمعلوم کیوں...... شاید ابّو کو اُس کی خوش آہنگ و دلچسپ باتیں

پسند آ گئی ہیں...... اِسی واسطے......

فریدوں: ہاں کہو

عالیہ: کچھ نہیں

فریدوں: ہاں اِسی واسطے؟

عالیہ: وہ اُسے مستقل طور پر اپنے یاں......

فریدوں: عالیہ!

عالیہ: مجھ کو احساس ہے

پر یہ ہونا ہے

ابو یہی چاہتے ہیں

مجھے یاں بلانے سے اُن کا یہی مدّعا تھا

کہ میں اُن کی خواہش کی تائید کر دوں

فریدوں: تو گویا تمہیں بھی......

عالیہ: فریدوں! تمہیں شاید اُس شام کی گفتگو یاد ہو

میں نے جب بحث کی آڑ میں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا
مگر پھر بھی ابّو نہ سمجھے
نہ سمجھے کہ وہ بس وہی چاہتے ہیں...... جو وہ چاہتے ہیں
فریدوں: مگر تم
عالیہ: اگر اُن کی سب زندگی صِرف میرے لیے
ایک صحرا کی مانند ویراں رہی
ان کی سب خواہشیں، آرزوئیں مری پرورش
میری خوشیوں کی خاطر شب و روز پامال ہوتی رہی ہیں
تو میں کس طرح...... کس طرح
صرف اپنے لیے...... اپنے معیارِ ذہن و نظر کے لیے
اُن کے دکھ بھول جاؤں
فریدوں: مگر میرے دُکھ عالیہ، میرے دُکھ
عالیہ: تم فسردہ نہ ہو
فریدوں: جیسے میں جاں سے عاری ہوں، پتھر ہوں بے حس ہوں
میری کوئی آرزو کوئی خواہش نہیں
پتھروں پر بھی تیشہ پڑے تو صدائیں نکلتی ہیں
چنگاریاں پھوٹتی ہیں
عالیہ: مگر تم تو شاعر ہو شاعر...... عظیم اور برتر
جو خود اپنے ناسور دل میں چھپائے ہُوئے

دوسروں کے لیے راحتیں ڈھونڈتا ہے
مسیحا ترا فن تو اوروں کو جاں بخشتا
اور خود درد کی دار پر جھولتا ہے
اگر اِس جہاں میں سبھی خود غرض ہوں
اگر ہر کوئی اپنے دکھ کو سنبھالے ہوئے
دوسروں کے غموں اور زخموں سے بے گانہ و بے خبر ہو
تو پھر یہ جہاں اک کھنڈر کی طرح
صرف ماتم کو ترسے

فریدوں: مگر عالیہ تم بتاؤ
کہ اب میں کہاں ہوں
مری زندگی میری قوت مری روشنی
اب کہاں ہے
یہ دکھ میری رگ رگ میں
اک زہر سا گھول دے گا

عالیہ: تمہارے ہی الفاظ میں
ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں
جاں کا زیاں جانتے ہیں
اِسی دکھ کی شدّت
ہمارے شب و روز کے آئینوں کو جِلا بخشتی ہے

یہی دکھ اگر جسم کا جزو ہو تو نتیجہ فنا ہے

مگر روح میں رچ سکے تو

اسی تودۂ خاک کو اِک پیمبر بنا دے

پیمبر......امتِ بے کراں، جاوداں

فریدوں: نمعلوم تم کس بلندی پہ ہو

اور میں کن نشیبوں میں بکھرا پڑا ہوں

مجھے چھوڑ کر تو نہ جا

میرے فن کی خداوند

میرے قلم کی توانائی

میری مرادوں کی منزل

مرے دل کی آواز

عالیہ: پگلے ترا فن تو گملے کا پودا نہیں

جنگلوں اور پہاڑوں کے سینے کا نخلِ توانا ہے

سرسبز پُر تمکنت اور قد آور

جسے برف و باراں کے موسم

نہ وحشت بھری آندھیاں کھا سکیں گی

فریدوں! میں کل جا رہی ہوں

کہاں یہ نہیں جانتی

تم یہ سمجھو کہ میں مر چکی ہوں

فریدوں: مری عالیہ مر چکی ہے!

مری عالیہ مر چکی ہے!!

عالیہ: تری عالیہ مر چکی ہے تری عالیہ

ہاں مگر اک مری آخری التجا ہے

کہ تم اپنے فن کو بلندی کی اُن چوٹیوں تک اُٹھانا

کہ میں جس جگہ ہوں...... تمہیں فخر سے اور محبت سے دیکھوں

ترا فن مری زندگی ہے فریدوں...... فریدوں...... فریدوں

آخرِ شب

کے

ہم سفر

رات کا سناٹا کہیں کہیں سے کسی چمگادڑ کے پھڑ پھڑانے اور اُلو کی آواز آ جاتی ہے۔ موسیقی رات کی ہیبت اور ویرانی کا منظر پیدا کرتی ہے۔ وقفوں کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ کا تاثر یوں دیا جائے جیسے کوئی فوجی پہرہ دے رہا ہو جب کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے قدموں کی چاپ ایک لحظہ کے لیے رُک جاتی ہے اور پھر جاری ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہتا ہے۔ پھر اچانک دُور سے ایک نوجوان عورت کی کربناک سسکیاں اور کراہیں سُنائی دینے لگتی ہیں، فوجی بوٹوں کی چاپ رُک جاتی ہے۔ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ آندھی کی سیٹیاں سُنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آواز پھر اُبھرتی ہے۔ بہت دُور سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور نوجوان عورت کی کراہیں بین کے انداز میں سنائی دیتی ہیں۔ فوجی بوٹوں کی آواز رُک جاتی ہے۔

سپاہی: یہ آواز کیسی ہے۔

جیسے کوئی شدّتِ کرب سے رو رہا ہو

مگر اس سمے؟

نصف شب ہو چکی ہے

یہاں کون ہوگا؟
یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں
اور یہ چند لاشیں
کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں
کوئی زندہ پیکر
یہاں وادیٔ مرگ میں کیا کرے گا
یہ خطّہ تو کب سے ہے ویراں
یہاں کچھ شکستہ در و بام
اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں
مدّت سے یونہی کھڑے ہیں

(پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز)

نہیں یہ مرا واہمہ ہے
یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے
کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں

(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)

(دور سے رونے کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

نہیں واہمہ یہ نہیں

یقیناً کوئی رو رہا ہے

یہ آواز عورت کی ہے

جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا

سُننے والے کے دل پر خراشیں لگائے

مگر اِس سمے اِس جگہ؟

کون ہوگا؟

یہ لاشیں مرے سامنے پتّھروں کی طرح سرد و بے حس پڑی ہیں

یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی

اور اِن کی حفاظت کو میں ہوں

فقط میں

کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے

تو پھر یہ صدا بَین کی

یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے؟

کیسی ہے؟

کیوں ہے؟

یہاں تو بجز ایک معبد

کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے

تو جیسے اِسی میں کوئی ہے

عبادت کا یہ وقت؟

(سسکی)

لیکن نہیں

یہ تو رونے کی آواز ہے

اور وہ بھی کسی اپسرا کی

چلوں جا کے دیکھوں

مگر شام تک تو

وہاں بھی

فقط چند بے نور شمعیں

شکستہ ظروف

اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی

آواز کوئی نہیں تھی

فقط خامشی اور اندھیرا

یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہوئی گھنٹیاں

بے صدا ہو چکی تھیں

تو پھر اِس سمے کون ہے؟

سحر ہے

یا مرا واہمہ

کیا خبر

کوئی آسیب ہو

کوئی بدروح

جو اپنے پیکر کی فرقت میں

نالہ کناں ہو

مگر میں سپاہی ہوں

اِن واہموں سے مجھے کیا تعلق

میں بُزدل نہیں

خواہ کچھ بھی ہو

میں اس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا

(پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز)

(قدموں کی چاپ اور سسکیاں اُبھرتی ہیں)

آواز نمبر ا: (ہش) سُنو!

نمبر۲: جیسے کوئی ادھر آ رہا ہے

نمبر ا: چلو اب اُٹھو ورنہ ہم بھی نہیں بچ سکیں گے

نمبر۲: بھلا مرنے والے کبھی آہ وزاری سے زندہ ہُوئے ہیں

یہاں تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا

مگر ہم تری دُکھ بھری التجا پر یہ تابوت' پرچھائیوں کی طرح

رینگتے رینگتے اِس جگہ لے کے آئے ہیں

یہاں اب گھڑی دو گھڑی کا توقف کھلی خودکشی ہے
یہ سارا علاقہ تو اب دشمنوں کے تسلط میں ہے
ورنہ معبد بھی
اُٹھو چلو

(بھاری قدموں کی آواز ہر لحظہ معبد کی دہلیز کی سمت
بڑھتی چلی آ رہی ہے...... سسکیاں بڑھ جاتی ہیں)

تمہیں اس جواں مرگ شوہر کے غم کی قسم اب اُٹھو

نمبر۲: چلو ہم چلیں دوسرے راستے سے نکل جائیں ورنہ......

نمبر۱: سنو پاؤں کی چاپ اِدھر ہی کو بڑھتی چلی آ رہی ہے

(آواز بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ سسکیاں
جاری ہیں۔ دونوں کرداروں کے قدموں کی
چاپ اُبھر کر غائب ہو جاتی ہے۔ بھاری قدموں
کی چاپ رُک جاتی ہے)

سپاہی: کون ہے؟
(سسکیاں)
کون ہے؟

(سسکیاں)

(قدموں کی آواز قریب آ کر رُک جاتی ہے)

بتا کون ہے تو

بتا ورنہ تیرے لیے میرے پستول کی ایک گولی بھی کافی رہے گی

(سسکیاں)

(پستول بھرنے کی آواز)

(خود کلامی کے انداز میں)

نہیں اتنی جلدی نہیں چاہیے

ذرا روشنی میں اُسے دیکھ لوں

عورت: تو رُک کیوں گئے مار ڈالو مجھے بھی، مجھے بھی،

مجھے زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے

نہ مرنے کا غم ہے

نہ جینے کی خواہش

(سسکیاں)

سپاہی: مگر تو یہاں اِس سمے

ایک ویران معبد میں کیوں رو رہی ہے

تجھے یہ خبر ہے کہ اب اِس علاقے پہ دشمن کا قبضہ ہے

اور کوئی کچھ بھی نہیں جانتا

اِس کا انجام کیا ہو

اور پھر تم تو عورت ہو

میں...... اِس لیے

عورت: قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں

یہی کہنے والے ہو تم

میرے شوہر کے قاتل

مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے

یہ تابوت جو میرے خوابوں کا مدفن ہے

میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے

اس کو مرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کر دے

کہ یہ ظلم احسان ہو گا

سپاہی: مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل

نہ میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابُوت کس کا ہے

میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سن کر اِدھر آ گیا تھا

عورت: اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہو گا

کہ قاتل تو سب ایک ہیں

ایک سے ہیں

مجھے اِس سے کیا

کس کے خنجر سے گھائل ہُوئی ہوں

مجھے اس سے کیا

کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھُونک ڈالا

وہ خنجر ترا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو
میں تو گھائل ہوئی
آگ تُو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
مرا آشیاں تو جلا
سپاہی: ہاں یہ سچ ہے
مگر نیک خاتون
یہ زندگی کا وطیرہ رہا ہے
کبھی لطف کی ساعتیں
اور کبھی ظلم کے روز و شب
اس کے نخچیر سب ہیں
تجھے کیا خبر
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
ہر کوئی خود کو معصوم گردانتا ہے
یہاں تک کہ قاتل بھی
اور یہ حقیقت بھی ہے
آج میں تیری نظروں میں قاتل ہوں
کیونکہ
مرا جسم مقتول کے وار سے بچ گیا
ورنہ ہم ایک سی نیتیں لے کے

اِک دوسرے کے مقابل ہُوئے تھے

اگرچہ یہ دُکھ جاں گسل ہے

مگر حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں

عورت: حوصلہ

تم تو پتّھر کے ہو اس لیے ہی یہ سب کہہ رہے ہو

تمہیں کیا خبر

میرا دل پھٹ رہا ہے

مری روح غم کے جہنّم میں ڈوبی ہُوئی ہے

مری سانس نشتر کی مانند میرا جگر چیرتی ہے

تمہیں کیوں خبر ہو

تمہیں تو فقط قتل کرنا سکھایا گیا اور بس......

زخم کی شدّتوں سے تمہیں کیا

جبھی تو یہ سفاک الفاظ

ہمدردیوں کی حسیں آڑ میں کہہ رہے ہو

سپاہی: تمہیں اِس کا حق ہے...... تمہیں اِس کا حق ہے

کہ تم جس کڑے درد میں مبتلا ہو

مجھے غیر جانو

مگر میری نیت کو شک کی نظر سے نہ دیکھو

مجھے تو فقط اِس قدر تم سے کہنا تھا

تم ایک کمزور عورت ہو

اور وہ بھی تنہا و بے بس

یہ ویران معبد یہ جاڑے کی تاریک شب

اور یہ مخدوش حالات

بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر لوٹ جاؤ

پہر دو پہر بعد اُجالے کے ہوتے ہی

میرے رفیقوں کے دستے یہاں آن پہنچیں گے

اور پھر کسے علم کیا ہو

تمہاری جوانی دُکھوں کے لبادے میں بھی پُر کشش ہے

مجھے تم ریاکار سمجھو کہ غمخوار جانو

تمہیں اِس کا حق ہے

مگر صبح تک میں بھی شاید

تمہاری مدد کر نہ پاؤں

عورت: مجھے اپنے انجام کا غم نہیں

ہاں مگر اس قدر

میرے محبوب کی روح

میرے لیے آسمانوں کی پہنائیوں میں

پریشان ہوگی

اگر تم مرے دادرس ہو

تو پھر اپنے پستول کی لبلبی کو دبا کر
مجھے اس اذیت سے آزاد کر دو
یہ احسان ہوگا تمہارا
مجھے صبح کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے
مجھے زندگی کے کسی بھی اُجالے کی حسرت نہیں ہے
مری مانگ کی کہکشاں
بجھ چکی ہے
مجھے اب سہاروں کے جگنو
اُجالے نہ دیں گے (وقفہ)

(وقفہ کے بعد)

تو کیا تم سے اتنا بھی ممکن نہیں ہے
یہی خیر خواہی کا دعویٰ تھا
اب چُپ کھڑے سوچ میں پڑ گئے ہو
تمہارے خیالوں کی پرچھائیاں میری آنکھوں سے مخفی نہیں ہیں
میں سب جانتی ہوں
جبھی تو مجھے تم سے کوئی توقع نہیں ہے
تمہیں کیا، کسی سے بھی کوئی توقع نہیں تھی
کہ دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں

اُن سے وفا کی توقّع عبث ہے

....

تو پھر میرے ہمدرد

جا اور سحر کے اُجالے کے ہوتے ہی

اپنے رفیقوں کے ہمراہ آ کر

مری بے کسی کا تمسخر اُڑانا

مگر میں تجھے یہ بتا دوں

کہ تم سخت مایوس ہو گے

کہ میرے بجائے

یہاں لاش ہو گی

سپاہی: نہیں یوں نہیں

میں تو یہ سوچتا ہوں

کہ اِس نفرتوں کے زمانے میں

اتنی محبت

مجھے تیرے مقتول کی خوش نصیبی پہ رشک آ رہا ہے

اگر کوئی میرے لیے

اس طرح نوحہ گر، مضطرب، خونفشاں ہو

تو میں زندگی موت پر وار دوں

اے وفادار خاتون!

مجھ کو تری چاہتوں نے
ترا معتقد کر دیا ہے

عورت: مری چاہتوں نے؟
مری چاہتیں
جو فقط آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہیں
فقط چند اشکوں کی لڑیاں
تو چاہت کی ضامن نہیں ہیں
مری چاہتیں
خود غرض اور بُزدل ہیں

ورنہ

یہ تابوت
تنہائیوں کے کفن میں لپیٹی ہوئی
صرف اِک لاش کا گھر نہ ہوتا
کہ میں اب تلک جی رہی ہوں
مری زندگی ننگِ اُلفت ہے
اِک بدنما داغ ہے
فرقِ انسانیت پر (سسکیاں لیتی ہے)

سپاہی: محبت کی دیوی
تری یہ وفا کتنی ثابت قدم ہے

تری استقامت کے آگے اجل منفعل ہے

....

مگر زندگی کی بہاریں
ابھی اپنے دامن میں خوشبو کے جھونکے لیے ہیں
ابھی تیرے پیکر میں وہ حسن ہے
جس کی شادابیاں مدّتوں تک رہیں گی
محبت تو اک جوت ہے
روشنی ہے
ضیا ہے
جو دُکھ کے گھنیرے اندھیروں میں مرتی نہیں
اور اِسے مارنا ظلم ہے قتل ہے

عورت: ہاں مگر یہ ضیا جس دیے کے لیے تھی
وہ گم ہو چکا ہے
فقط اک دیا اس ضیا کا سزاوار تھا
اور وہ آج ویران معبد میں ٹوٹا پڑا ہے
محبت کی لو
اس کی بالیں پہ نوحہ کناں ہے

سپاہی: یہ سچ ہے
وفا نام ہے ایک پیکر سے وابستگی کا

مگر تابکے شمعِ تربت بنی تم سلگتی رہوگی؟
ابھی کتنے زندہ جہاں روشنی کی کرن کے لیے منتظر ہیں
اُٹھو اِن اندھیری گپھاؤں سے نکلو
کہ تم روشنی ہو

عورت: سپاہی!
مگر شمعِ تربت کو کس نے گھروں میں جلایا
مرے سامنے اب اندھیروں کی دنیا ہے
اور وادیٔ مرگ کی خامشی ہے
یہاں اور کچھ دیر تک
ٹمٹاؤں گی
اور جل بجھوں گی

سپاہی: وفا کو حقیر اور ارزاں نہ سمجھو
یہ موتی بڑا قیمتی ہے
اسے خاک میں رول دینا
سراسر ستم ہے
اگر تم سمجھتی ہو یوں جاں گنوانے سے
یہ لاش پھر جی اُٹھے گی؟
تو پھر شوق سے موت کا زہر پی لو
اگر یوں نہیں تو

یہ دیوانگی......صرف دیوانگی ہے
نہ مقصد نہ حاصل نہ منزل
اُٹھو زندگی کے کئی راستے منتظر ہیں تمہارے
عورت: مگر تم تو دشمن ہو میرے
تمہاری بلا سے
اگر میری ہستی تباہی کے غاروں میں اُترے
تمہیں کیا اگر صبحدم آنے والے سپاہی مجھے
بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں
سپاہی: میں دشمن سہی پھر بھی انسان تو ہوں
مرا دل تمہارے دکھوں سے سلگنے لگا ہے
فقط یہ نہیں ہے
کہ تم اک حسیں نوجواں اور مظلوم بیوہ ہو
بلکہ تمہاری وفا اور وابستگی نے
مرے دل کو پگھلا دیا ہے
وگرنہ مرا دل بھی پتھر کا تھا اور پتھر کا ہو جائے گا
جب یہ منظر نظر میں نہ ہوگا
عورت: تم انساں نہیں ہو
فرشتے ہو
ورنہ ظفر مند لشکر کے وحشی سپاہی تو

مفتوح خطّے کی ہر چیز کو
نوکِ شمشیر سے تولتے ہیں
تم اُس وقت سے ایستادہ ہو
کچھ دیر کو بیٹھ جاؤ......سپاہی

سپاہی: اور مجھے یاد آیا
کہ میں سسکیاں سن کے یہ دیکھنے کے لیے
اِس طرف آ گیا تھا
کہ اِس وقت ویران معبد سے
کیسی صدا آ رہی ہے
وگرنہ
مرے ذمّے دشمن کی لاشیں ہیں
جن کی نگہداشت کرنا ہے مجھ کو

عورت: (حیرت سے) نگہداشت!
دشمن کی لاشوں کی
وہ کیوں؟
(ذرا شگفتگی سے) تمھیں اس کا ڈر ہے کہ لاشیں
کہیں پھر سے زندہ نہ ہو جائیں
اور بھاگ اُٹھیں

سپاہی: (ہنستے ہوئے) نہیں

اس سبب سے نہیں

بلکہ یہ اِس لیے

تا کہ دشمن کہیں موقع پا کر انہیں لے نہ جائے

عورت: اگر لے بھی جائے تو پھر کیا؟

بھلا تم کو لاشوں سے کیا واسطہ

سپاہی: یہ سب جنگ کے بھید ہیں

تم نہیں جان سکتیں

عورت: مگر اس میں کیا بھید ہے

سپاہی: ایک تو یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو

تو دشمن کی لاشوں کے بدلے میں

اپنے شہیدوں کی لاشیں ہمیں مل سکیں

عورت: اوہ...... یہ بات ہے

سپاہی: ہاں مجھے واپس اپنی جگہ پر پہنچنا ہے

عورت: اور میں؟

سپاہی: تم!

تم یہیں چند لمحے رکو

میں ابھی لوٹ آؤں گا

اور ہاں......

یہاں سخت سردی ہے تم کپکپانے لگی ہو

مرا کوٹ لے لو

عورت: نہیں باہر اس سے بھی بڑھ کر ہے

تم جاؤ میں تو یہیں ہوں

سپاہی: یہ لو کوٹ اور اوڑھ لو

میں سپاہی ہوں اور اِن کڑے موسموں کا مرا جسم عادی رہا ہے

عورت: ذرا جلد ہی لوٹنا

(سپاہی کے قدموں کی چاپ

فیڈ ان ہو کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(موسیقی)

(سپاہی کے قدموں کی چاپ فیڈ اِن ہوتی ہے
اور مائیک کے قریب آ کر رُک جاتی ہے)

سپاہی: (گھبرائی ہوئی آواز میں) غضب ہو گیا

عورت: کیا ہُوا دوست

سپاہی: اِک لاش کم ہے

عورت: تو پھر کیا ہُوا

سپاہی: اُف غضب ہو گیا تم نہیں جان سکتیں

کہ یہ بات کتنی خطرناک ہے

عورت: کس طرح

سپاہی: میری غفلت کے باعث یہ سب کچھ ہُوا

اوراب

اس کی پاداش مجھ کو بھگتنا پڑے گی

عورت: تو پھر

سپاہی: میں نہیں جانتا اِس کا انجام کیا ہو

کہ یہ مجرمانہ تغافل ہے

اور خاص کر حالتِ جنگ میں

اس کی پاداش

بس موت ہے

عورت: تو میں اس کا باعث بنی ہوں

مرے واسطے ہی تو تم

فرض کو بھول بیٹھے تھے

اوراب

سپاہی: میں جاتا ہوں

جو کچھ بھی ہو صبح تک میں وہیں پر رہوں گا

کہیں باقی لاشیں بھی غائب......

عورت: سُنو

تم نے میرے لیے یہ کیا

اوراب ایک صورت میں

تم...... میرے شوہر کی یہ لاش

باقی کی لاشوں میں رکھ دو

سپاہی: یہ کیا کہہ رہی ہو

مجھے اپنے کانوں پہ شک ہے

عورت: سپاہی

یہی ایک صورت ہے

اور اب تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں

چلو مل کے یہ لاش ہم لے چلیں

سپاہی: لیکن اتنا کرم!

عورت: کچھ نہیں تم چلو......

وقت کم ہے

چلو......

(موسیقی)

بے آواز گلی کوچوں میں

ڈاکٹر عطیہ کے نام

بے آواز گلی کوچوں میں غزل سرا ہے
شہرِ سخن کا ایک مُسافر تنہا تنہا

ترتیب

ناموجود

اَے خُدا تری مخلُوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چکی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی
اَب سفارتیں کیسی

بے وجود بستی میں
لوگ اب نہیں رہتے
سِسکیاں سِسکتی ہیں
سائے سرسراتے ہیں
سُورجوں، ستاروں کی
اَب بشارتیں کیسی

دُوسری ہجرت

پھر مرے مکّہ سے پیغمبر
ہجرت کر کے چلا گیا ہے
اور اب پھر سے
کعبہ کے رَم خُوردہ بُت
اصنامِ طلائی
اپنی اپنی مسند پر آ بیٹھے ہیں
سچ کا لہُو
اُن کے قدموں میں
عُنابی قالین کی صُورت بچھا ہُوا ہے
کمخوابی خیموں کے اندر
بزمِ حریفاں پھر بجتی ہے
کذب وریا کی دَف بجتی ہے

○

جاناں دِل کا شہر، نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

کِس چاہت سے زہرِ تمنّا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغر افسوس کا ہے

اِک دہلیز پہ جا کر دِل خُوش ہوتا تھا
اب تو شہر میں ہر اک در افسوس کا ہے

ہم نے عِشق گُناہ سے بَرتر جانا تھا
اور دِل پر پہلا پتھر افسوس کا ہے

دیکھو اس چاہت کے پیڑ کی شاخوں پر
پھُول اُداسی کا ہے، ثمر افسوس کا ہے

کوئی پچھتاوا سا پچھتاوا ہے فرازؔ
دُکھ کا نہیں افسوس، مگر افسوس کا ہے

○
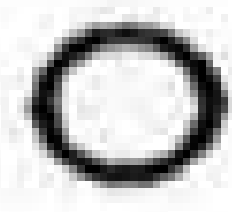
شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاعِ ہستی اپنی خواب و خیال تو ہیں
وہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دِل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہو کہنا حال کسی سے

دیکھو اِک صُورت نے دِل میں کیسی جوت جگائی
کیسا سجا سجا لگتا ہے شہرِ ملال کسی سے

تُم کو زعم فرازؔ اگر ہے تم بھی جتن کر دیکھو
آج تلک تو ٹوٹ نہ پایا درد کا جال کسی سے

○

سویا تھا یا جاگ رہا تھا ہجر کی رات
آنکھوں پر محسوس کیئے ہیں اُس کے ہاتھ

اُس کو دیکھنا دیکھتے رہنا کافی تھا
لوٹ آیا ہُوں دِل میں لے کر دِل کی بات

کیسے اب میں اوروں کو بے درد کہوں
میں بھی تھوڑی دُور گیا تھا اُس کے ساتھ

بہت زمانوں بعد کوئی واپس آیا
لے کر بھُولی بسری یادوں کی سوغات

محوِ تکلّم دُنیا بھر کے لوگوں سے
لیکن آنکھ میں وُہ ہے دِل میں اُس کی بات

شہرِ محبت کب سے خالی خالی ہے
ہم بھی فرازؔ یہاں ہیں شاید رات کی رات
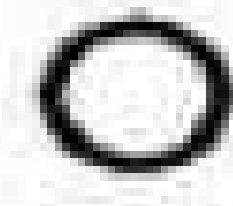
○

یہ مَیں بھی کیا ہُوں اُسے بھُول کر اُسی کا رہا
کہ جِس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اُسی کا رہا

وہ بت کہ دُشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو دَر اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دِل نے سخن معتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کِس طرح سے کہوں عُمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فرازؔ
اسی لئے کفِ قاتل پہ سَر اُسی کا رہا

○
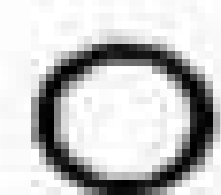
ہم سے کہیں کُچھ دوست ہمارے مَت لکھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مَت لکھو

حاکم کی تلوار مقدّس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے بارے مَت لکھو

کہتے ہیں یہ دار و رَسَن کا موسم ہے
جو بھی جِس کی گردن مارے مَت لکھو

لوگ الہام کو بھی الحاد سمجھتے ہیں
جو دل پر وجدان اتارے مَت لکھو

وہ لکھو بس جو بھی امیرِ شہر کہے
جو کہتے ہیں دَرد کے مارے مَت لکھو

خود منصف پابستہ ہیں لب بستہ ہیں
کون کہاں اَب عرض گزارے، مَت لکھو

کچھ اعزاز رسیدہ ہم سے کہتے ہیں
اپنی بیاض میں نام ہمارے مَت لکھو

دِل کہتا ہے کھُل کر سچی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مَت لکھو

○
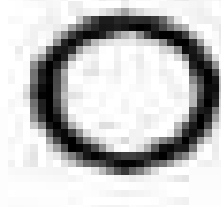
فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

کوئی موسم قرینے کا نہ آیا
ہواؤں کے سخن نا معتبر ہیں

تری قُربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عُمریں مختصر ہیں

بہت سے زخم تیرے نام کے تھے
اِسی باعث بہت سے چارہ گر ہیں

پڑے ہیں قُربتوں میں فاصلے وہ
کہ جو نزدیک تر تھے دُور تر ہیں

شبِ افسوس کے بجھتے چراغو
ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی رات بھر ہیں

فرازؔ اپنا مقدّر سنگساری
ہمیں اِس عہد کے آئینہ گر ہیں

بن باس

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو
مَیں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو اِک موسم غربت کے دُکھ جھیل کے آیا
تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تھکی ہُوئی اور ترسی ہُوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اُترتے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کر لُوں
اپنے چمن کے جلے ہُوئے پودوں
اور گرد آلود درختوں کی
مُردہ شاخوں پر بین کروں

ہر مجبور ستون کو اِتنا ٹوٹ کے چوموں

میرے لبوں کے خون سے

ان کے نقش و نگار سبھی جی اُٹھیں

گلی کے لوگوں کو اِتنا دیکھوں

اِتنا دیکھوں

میری آنکھیں

برسوں کی ترسی ہوئی آنکھیں

چہروں کے آنگن بن جائیں

پھر میں اپنا ساز اُٹھاؤں

آنسوؤں اور مُسکانوں سے جھلمل جھلمل

نظمیں غزلیں گیت سناؤں

اپنے پیاروں

درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں

لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر

اب باڑ ہے لوہے کے کانٹوں کی

شہ دروازے پر کچھ پہرہ دار کھڑے ہیں

جو مجھ سے اور مجھ جیسے دِل والوں کی

پہچان سے عاری

میرے ساز سے
سنگینوں سے بات کریں
میں اُن سے کہتا ہوں
دیکھو
میں اس شہر کا نغمہ گر ہُوں
برسوں بعد کڑی راہوں کی
ساری اذیت جھیل کے اب واپس آیا ہوں
اس مٹی کی خاطر
جس کی خوشبوئیں
دُنیا بھر کی دوشیزاؤں کے جسموں کی مہکوں سے
اور سارے جہاں کے
سبھی گلابوں سے
بڑھ کر ہیں
مجھ کو شہر میں
میرے شہر میں جانے دو
لیکن تنے ہُوئے نیزوں نے

میرے جسم کو یوں برمایا

میرے ساز کو یوں ریزایا

میرا مہکتا خون اور میرے سسکتے نغمے

شہ دروازے کی دہلیز سے

رِستے رِستے

شہر کے اندر جا پہنچے ہیں

اور مَیں اپنے جسم کا ملبہ

ساز کا لاشہ

اپنے شہر کے شہ دروازے

کی دہلیز پہ چھوڑ کے

پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پر

مجبورِ سفر ہُوں

جن کو تج کر گھر آیا تھا

جِن کو تج کر گھر آیا تھا

○
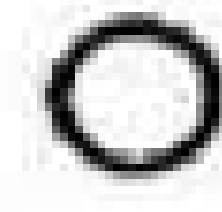
شہرِ کتاب اُجڑ گیا، حرف برہنہ سر ہُوئے
نغمہ ہے سُرمہ در گلو، شعر وطن بدر ہُوئے

موسمِ درد کے صفیر جو بھی ندیم تھے، سو تھے
اب تو سبھی فریفتہ، دانہ و دام پر ہُوئے

جام و سبُو کی آبرُو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ و محتسب، شہر میں مُعتبر ہُوئے

سروِ جواں کی موت پر روئیں گی قُمریاں بہت
یوں تو بفیضِ باغباں قتل کئی شجر ہُوئے

درخورِ حرفِ یار تھے جن کے لئے ہمیں فرازؔ
آج وُہی ستم ظریف غیر کے نامہ بر ہُوئے

○
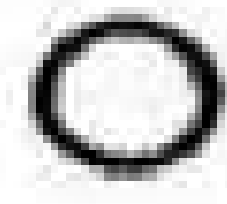
کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اِذنِ نوا دو

ہم آئینے لائے ہیں سرِ کوئے رقیباں
اے سنگ فروشو یہی الزام لگا دو

لگتا ہے کہ میلہ سا لگا ہے سرِ مقتل
اے دِل زدگاں بازوئے قاتل کو دُعا دو

ہے بادہ گساروں کو تو میخانے سے نسبت
تُم مسندِ ساقی پہ کِسی کو بھی بٹھا دو

میں شب کا بھی مُجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
لوگو مجھے اِس شہر کے آداب سِکھا دو

فیضؔ کے فراق میں

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کویتا میری تیری دھرتی کی سچّائی
تیرے بول ہیں سارے گونگے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی نَے اور آشتی کی شہنائی
آنگن اور چوپال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دِلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال
کوی تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر

اپنا شہر کہ حدِ نظر تک جیسے لہو کی نہر
یا منصور و مسیح کی سُولی یا سُقراط کا زہر
ہم آشفتہ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال
اے ماٹی کے لال
ہجر کی رت کے روز رہے گی

اور فقط کچھ روز

وصل کی ساعت آ پہنچے گی

اور فقط کچھ روز

راہ کی ہر دیوار گرے گی

اور فقط کچھ روز

گلے میں بانہیں ڈال تجھے سب یاد کریں
اے ماٹی کے لال
تجھے سب یاد کریں
تجھے سب یاد کریں

(سترویں سالگرہ پر)

○
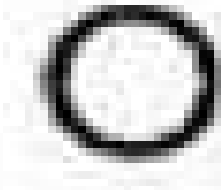
سرو و صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رُت آئی ہے
پھر سے دِلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں

کیسے کیسے یاروں کا بہروپ کھُلا
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں

ان حالوں کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کہنے کو دِن رات گزُرتے جاتے ہیں

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سُن
یوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

ماں مٹی نے خوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

کبھی کبھی کوئی ایسا مُسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

کوئی نیا احساس کہ ہمدمِ دیرینہ
جتنے پُرانے زخم تھے بھرتے جاتے ہیں

شہرِ غزل کی گلیوں میں دِلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

○

کب تک فگار دِل کو تو آنکھوں کو نم کریں
آؤ حدیثِ قاتل و بسمل رقم کریں

رِندو اُٹھاؤ جام کہ بس ہو چکی بہت
تا چند پاسِ بیعتِ شیخِ حرم کریں

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کر چراغِ درد
خونِ جگر کو پھر سے سپردِ قلم کریں

تاچند جشنِ مرگِ رفیقاں منا کے ہم
اسبابِ دلنوازیٔ قاتل بہم کریں

دلقِ اویس و چادرِ زہرا کدھر گئی
دزدانِ نیم شب سے تقاضا تو ہم کریں

زخموں سے چُور جسم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں اُنہیں کو علم کریں

قیدِ تنہائی
کی
چند عبارتیں

مانسر کیمپ ۷۷ء

پہلی آواز

اتنا سنّاٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دُہائی دی ہے

جانے زنداں سے اِدھر کون سے منظر ہونگے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دِکھائی دی ہے

دُور اک فاختہ بولی ہے بہت دُور کہیں
پہلی آواز محبت کی سُنائی دی ہے

آشیاں گُم کردہ

عجب منظر سوادِ شام کے آنکھوں میں پھرتے ہیں
ہُوا سُورج کی مشعل کو جلاتی ہے بُجھاتی ہے

اُفق پر کِتنی تصویریں اُبھرتی ہیں بِکھرتی ہیں
شفق میں آشنا چہروں کی رنگت پھیل جاتی ہے

تو دامانِ نظر میں بے محابا پھول کھلتے ہیں
تو جیسے جوئبارِ یادِ یاراں گنگناتی ہے

وہ ہمدم مجھ کو حیران و پریشاں ڈھونڈتے ہوں گے
کہ جن کی مہرباں آنکھوں میں شبنم جھلملاتی ہے

قفس میں روزنِ دیوار و زخمِ در نہیں لیکن
نوائے طائرانِ آشیاں گُم کردہ آتی ہے

پچھلا پہر

نہ کہیں شہرِ مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدم و دمساز

نہ سرِ بام زُلفِ آوارہ
نہ سرِ راہ چشمِ فتنہ طراز

نہ کہیں کُوئے چاک داماناں
نہ کہیں رُوئے دوستانِ فراز

نہ کوئی بیتِ بیدل و غالب
نہ کوئی شعرِ حافظِ شیراز

نہ کوئی شمع کشتۂ شب ہے
نہ کوئی عندلیبِ سینہ گداز

خلوتِ غم نہ بزمِ رُسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز

چار سُو اک فصیلِ بے در ہے
چار جانب حصارِ بے انداز

نیند کے طائرانِ بے پروا
شاخِ مژگاں سے کر گئے پرواز

ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اُٹھاتا ہُوں تیری یاد کا ساز

توڑ دیتی ہے سِلسلے سارے
پہرہ داروں کی بدنُما آواز

بیادِ جاناں

دِل قفس میں بھی غزل خواں ہے بیادِ جاناں
غمِ جاں بھی غمِ جاناں ہے بیادِ جاناں

کب رگ و پے میں نہ تھا درد کا قاتل نشتر
آج پیوستِ رگِ جاں ہے بیادِ جاناں

یوں صبا آتی ہے گلگشت کو، جیسے زنداں
کوچۂ چاکِ گریباں ہے بیادِ جاناں

غزالاں تُم تو واقف ہو

غزالاں تُم تو واقف ہو سو ہو مجنوں پہ جو گزری
جو نالہ محملِ لیلےٰ میں تھا ہم بھی سمجھتے ہیں

ہَوس والوں کو کیا کیا ناز ہے اپنے قرینوں پر
مگر رسم و رہِ شہرِ وفا ہم بھی سمجھتے ہیں

یونہی آئے نہیں ہیں کوچۂ چاکِ گریباں میں
مزاجِ دل محبت کی ادا ہم بھی سمجھتے ہیں

''بہار آنے سے پہلے پیرہن میں آگ لگتی ہے''
بسانِ لالۂ آتش قبا ہم بھی سمجھتے ہیں

(کلیم جلیسری)

پاس کیا تھا

پاس کیا تھا کہ لوٹتی دُنیا
ہم تو کل بھی تھے بے سرو ساماں

آج دیوار کھچ گئی ہے اگر
شہر کل بھی تھا صُورتِ زنداں

کب میسّر ہُوا تھا روزِ وصال
کب مقدّر نہ تھی شبِ ہجراں

اِک متاعِ سخن تھی پاس اپنے
ایک سازِ وفا تھا دولتِ جاں

اب بھی خوش بخت ہیں ترِے وحشی
اب بھی خوش وقت ہیں ترِے ناداں

درد قائم ہے یاد باقی ہے
اِک ترِی دید چھِن گئی جاناں

○
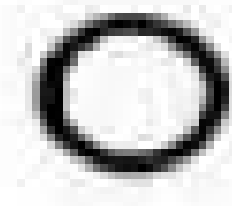
چاند رُکتا ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
کون لے جائے مرے نامے مرے جاناں کے پاس

اب بجز ترکِ وفا کوئی خیال آتا نہیں
اب کوئی حیلہ نہیں شاید دلِ ناداں کے پاس

چند یادیں نوحہ گر ہیں خیمۂ دِل کے قریب
چند تصویریں جھلکتی ہیں صفِ مژگاں کے پاس

شہر والے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہر ناپُرساں کے پاس

لوگ کیوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلّی کیا ہے غم خواروں کے پاس

اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

گیتوں سے تجھے لُبھانے والا
خوابوں سے تجھے سجانے والا
میں تیری اُداس ساعتوں میں
رَونے والا، رُلانے والا
میں تیری خوشی کی محفلوں میں
نغموں کے چراغ لانے والا

ہر راہ میں تیرا ہم سفر ہُوں
اے شہر مَیں تیرا نغمہ گر ہُوں

اب ہاتھوں میں مرے ہتھکڑی ہے
اب پاؤں میں میرے بیڑیاں ہیں
اب دستِ صبا ہے دستِ قاتل
اب ابرِ کرم میں بجلیاں ہیں
اب حبسِ دوام میری قِسمت
یا میرا نصیب پھانسیاں ہیں

میں اپنی خطا سے بے خبر ہُوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

پھر بھی نہیں جی کو رنج کوئی
اور آنکھوں میں اشکِ خوں نہیں ہے
پھر بھی نہیں درد دل گرفتہ
میں نالہ بلب ہُوں یوں نہیں ہے
دیکھو تو بیاضِ شعر میری
اِک حرف بھی سرنگُوں نہیں ہے

زنداں میں رہُوں کہ اپنے گھر ہُوں
اے شہر مَیں تیرا نغمہ گر ہُوں

ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

ندیم چُپ تھا
مگر سدا کی شفیق آنکھوں پہ
دُکھ کی کائی جمی ہوئی تھی
سدا کے اُس مہربان چہرے کا زخم
جو کب کا بھر چُکا تھا
وہ پھر ہرا ہو کے کنجِ لب سے دل و جگر تک پہنچ چکا تھا
ندیم چُپ تھا
مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے
کِسی نے اُس کے نحیف شانوں سے
اُس کے زندہ وجیہہ سر کو ہٹا کے
زُوبی کا ساختہ چہرۂ سفالیں
لگا دیا ہے
یہ کربِ ضبطِ الم کی حد تھی
بہت سے احباب جمع تھے

جب

عدالتِ عالیہ کے ایواں سے

مَیں حراست میں

باہر آیا

اِدھر اُدھر لوگ حال احوال پُوچھنے کے لیے

کھڑے تھے

تو کشور و کامراں کی آنکھوں میں سِسکیاں

اور گلے میں آنسو اٹک گئے تھے

یہ وہ گھڑی تھی

کہ میرے اندر کے حوصلوں کی

سبھی چٹانیں تڑخ رہی تھیں

وہ زلزلہ سا وجود میں تھا

کہ میری بنیاد ہل رہی تھی

گناہ میرے قلم کا سچ تھا

اور اُس کی پاداش میرے یاروں کو

میرے پیاروں کو مل رہی تھی

یہ ساعتِ جانستاں کڑی تھی

اور اس سے پہلے کہ سچ کا پندار

واہموں سے شکست کھاتا

ندیمؔ کی مہربان آنکھیں
ندیمؔ کے دلنواز لب مُجھ سے کہہ رَہے تھے
فرازؔ ہم تم تو وہ ہیں
جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیّتیں ہیں
کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں
وہ حرفِ حق کی مجاہدت ہے
ہمیں نہ حرصِ حَشَم نہ مال ومنال کی آرزو رہی ہے
بس اِک قلم ہے کہ جس کی ناموس
ہم فقیروں کا کل اثاثہ ہے آبرو ہے
بس ایک سچ ہے
کہ جس کی حرمت کی آگہی سے
مرے بدن میں ترِے بدن میں
مرے قلم میں ترے قلم میں
وہی لہُو ہے
کہ جس سے عرفان کی نمو ہے
کہ جس سے انساں کی آبُرو ہے
ابھی سے تُم ڈولنے لگے ہو
ابھی سے سُکھ کے مقابلے میں صعُوبتیں تولنے لگے ہو
مجھے بھی دیکھو

کہ جس کے پیراہنِ دِل و جاں پہ ساٹھ

پیوند لگ چکے ہیں

تمام پیوند زندگی کی ودیعتیں ہیں

مگر مجھے مضمحل بھی دیکھا!؟

کبھی مجھے منفعل بھی دیکھا!؟

مَیں اب بھی دشتِ وفا میں گرمِ سفر ہُوں گرمِ سفر رہا ہُوں

کہ میں سمجھتا ہُوں

یہ وہ صحرائے دَرد ہے جس میں

تشنگی ہے، گرسنگی ہے، برہنگی ہے

یہاں ملامت کے سنگ...... طعنوں کے تیر

شرمندگی کے خنجر برس رہے ہیں

یہاں تو ہر راہرو کی گردن میں طوق پاؤں میں بیڑیاں ہیں

یہاں تو زنداں کی ظلمتیں اور قتل گاہوں کی لالیاں ہیں

مگر کبھی مَیں رُکا نہیں ہُوں، مگر کبھی مَیں جُھکا نہیں ہُوں

یہی تو دشتِ وفا ہے جس میں

تمہارے جسموں ہمارے جسموں

کے ہر طرف استخواں پڑے ہیں

یہی تو وہ راستے ہیں جن میں

صداقتوں کے امیں لڑے ہیں

فقط ہمیں تو نہیں اکیلے
یہاں بہت سے علم گڑے ہیں
انہیں کے ایثار سے ہی جانبر صداقتیں ہیں
انہیں کے افکار سے ہی
ہم اہلِ دِل کی باہم رفاقتیں ہیں

تمُہارے بازو ابھی توانا ہیں
جسم میں خون کھولتا ہے
قلم سے عہدِ وفا کیا ہے
قلم تو پھر سچ ہی بولتا ہے
اُٹھاؤ آنکھیں کہ سچ امر ہے
قلم کا وجدان مُعتبر ہے

مَیں کنجِ زنداں میں آ چکا ہُوں
مگر ابھی تک
مری نگاہوں کے سامنے ہیں
ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

○

ہر کوئی طرّۂ پیچاک پہن کر نکلا
ایک مَیں پیرہنِ خاک پہن کر نکلا

اور پھر سَب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
میرا قاتل مری پوشاک پہن کر نکلا

ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خُدائی ساری
اِک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نکلا

ترکش و دام عبث لے کے چلا ہے صیّاد
جو بھی نخچیر ہے فتراک پہن کر نکلا

اُس کے قامت سے اُسے جان گئے لوگ فرازؔ
جو لبادہ بھی وہ چالاک پہن کر نکلا

قاصد کبُوتر

یہ لہُو
جس سے مرے
شہروں کے سارے راستے
گُلگوں ہیں
اور ہر پیرہن کا رنگ عنّابی ہے
کل کے موسموں
اور آنے والے
سُورجوں
کا زمزمہ گر ہے
چلو تُم نے تو
کالی سُرخیاں
مقراض کر ڈالیں
سخن نخچیر کر ڈالے
قلم زنجیر کر ڈالے

مگراب ان ہواؤں کو بھی روکو
جو تمہارے مقتلوں کی لالیاں
اور تازہ خوں کی خوشبوئیں
اور اُن کی آوازیں لیے
گلیوں سے
بازاروں سے
شہراہوں سے ہوکر
ہر طرف
قریہ بہ قریہ
پھیلتی جاتی ہیں
نادانو
ہوائیں نامہ بر بنتی ہیں
جب قاصد کبوتر قید ہوتے ہیں

عفریت

خوفزدہ مائیں
بچوں کو سینوں سے لپٹائے
تھر تھر کانپ رہی ہیں

بستی والے کہتے ہیں
برسوں سے
اس قریہ میں
اک آدم خور عفریت ہے
جس کے بہت سے چہرے ہیں
اور جس گھر میں بھی
کسی صدا کی شمع جلے
یا کسی دُعا کا پھُول کھلے
وہ صبح سے پہلے
سارے گھر کو کھا جاتا ہے
کتنی بار گئی

دِل والے

اپنے دُکھی سینوں میں غم کے جگر جگر انگارے

اور زخمی آنکھوں میں

جگمگ جگمگ تارے لے کر

اس عفریت کی کھوج میں نکلے

لیکن اگلی شام

اس ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈی پر

جو کالے سانپوں

اور پیلے کانٹوں والے

جنگل کو جاتی ہے

اُن کے سر

ان کے بازو

اُن کی آنکھیں

لہُولہان

اور الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ملی ہیں

اس منظر کی دید سے اب تک

بستی والوں کے

مُنہ پر

اور آنکھوں پر

خود اُن کے اپنے ہاتھ دھرے ہیں

○
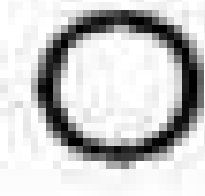
اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اُتریں گے عذاب اور طرح کے

اَب کے تو نہ چہرے ہیں نہ آنکھیں ہیں نہ لب ہیں
اس عہد نے پہنے ہیں نقاب اور طرح کے

اَب کوچۂ قاتل سے بلاوا نہیں آتا
قاصد ہیں کہ لاتے ہیں جواب اور طرح کے

سو تیر ترازُو ہیں رگِ جاں میں تو پھر کیا
یاروں کی نظر میں ہیں حساب اور طرح کے

اس درد کے موسم نے عجب آگ لگائی
جسموں میں دہکتے ہیں گلاب اور طرح کے

واعظ سے فرازؔ اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے

○
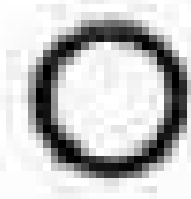
پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہُوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

قاتل اِس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عُشّاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو ناخوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازؔ
لوگ رہتے ہیں اِسی شہرِ دِل آزار کے بیچ

○
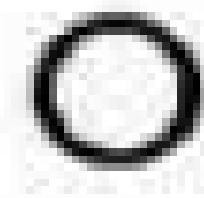
اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

کل تاریخ یقیناً خود کو دُہرائے گی
آج کے اِک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

بزم میں یاروں کی شمشیر لہُو میں تر ہے
رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا

آج تو اے دِل ترکِ تعلق پر تم خوش ہو
کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا

اِس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

اس موسم میں گلدانوں کی رسم کہاں ہے
لوگو اب پھولوں کو آتشدان میں رکھنا

○
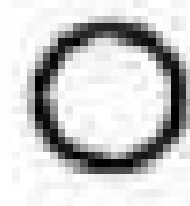
وہ ظلمتیں ہیں کہ شاید قبولِ شب بھی نہ ہوں
مگر حصارِ فلک میں شگاف اب بھی نہ ہوں

تمام شہر ہے شائستگی کا زہر پیے
نہ جانے کیا ہو جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

وہ ساعتیں ہیں عنایاتِ چشم و لب تو گئیں
وہ چاہتے ہیں حکایاتِ چشم و لب بھی نہ ہوں

ہر اک پہ وا نہ کرو شہرِ دِل کا دروازہ
کہ آنے والوں میں دزدانِ نیم شب بھی نہ ہوں

مجھے تو ڈر ہے کہ شیخِ حرم کے ہاتھوں سے
مری طرح کہیں رسوا رسول و رب بھی نہ ہوں

○
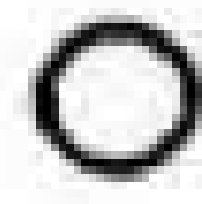
نبھائی وضعِ بسمل انتہا تک
نہ مانگا قاتلوں سے خون بہا تک

نہ جانے کیا ہُوا زندانیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیرِ پا تک

اُڑا کر لے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی ردا تک

وفا کے نام پر کچھ شعبدہ گر
چُرا لیتے ہیں ہاتھوں کی حِنا تک

فرازؔ آنکھیں گنوائیں عُمر کھوئی
کہا تھا کِس نے اُس کا راستہ تک

میرے عصر کے موسیٰ

مالک
میں لفظوں کا گڈریا
حرفوں کے بُزغالے
میری دُنیا ہے
اس دُنیا اور اس کے دُکھوں کے
بھونچالوں سے
جب بھی مجھے پل دو پل ملتے
اور تجھے
سارے افلاک
اور ساری زمینوں
کے سارے بسنے والوں کے
سارے جھوٹ اور سارے سچ کے
جنجالوں سے مہلت ملتی
ہم آپس میں باتیں کرتے
سیدھی سچی پیاری باتیں

جبر اور مکر سے عاری باتیں

تو شبنم تھا تو موتی تھا تو خوشبو تھا

میں پتا تھا مَیں پتّھر تھا میں آنسو تھا

لیکن میل رہا دونوں کا

دونوں ہی نے اکثر

سُنا کہا دونوں کا

مالک

مَیں نے اکثر سوچا

تو جس کو

دِن کا آرام

نہ راتوں کی نیندیں حاصل ہیں

ساری دُنیاؤں کی مسافت

کرتے کرتے

اپنے گلّوں اور گلّوں کے چرواہوں کی

چاہت کا دَم بھرتے بھرتے

شہد کی نہریں زہر کے ساگر

تکتے تکتے

کبھی کبھی تھک جاتا ہوگا

تیرے گیسو

کاہکشاں کی دُھول سے اَٹ جاتے ہونگے

اور تیرے شانے
سارے زمانے کے انبار سے
دُکھتے ہوں گے
تیرے پاؤں
ازل سے لے کر ابد تلک
پھیلے ہُوئے صحراؤں کے سفر سے
چھالوں سے پٹ جاتے ہوں گے
اور تیرے پیوند لگے
ملبُوس کے بخیئے
شاید جگہ جگہ سے
نکل چکے ہوں
مالک
تو اِک روز اگر
سارے زمانے سارے ٹھکانے سارے فسانے
بھُول کے میرے پاس آئے تو
میں تیرے ریشم جیسے
لانبے بالوں کو
بستی کے واحد چشمے کے
چاندی جیسے پانی سے دھوؤں
تیرے تھکے ہُوئے شانوں کو

آہستہ آہستہ دابوں اور سہلاؤں
تیرے چھلنی چھلنی پاؤں کے تلووں سے
ساری تھکن کے کانٹے چُن لُوں
تیرے دریدہ پیراہن کے
اِک اِک چاک کو ٹانکوں
اور جب تجھ کو پیاس لگے
یا بھُوک لگے تو
سچے لفظوں کی سب سے اچھی بھیڑوں کا
خالص تازہ دُودھ پلاؤں
اور پھر تجھ کو
اپنی نَے کی روتی ہوئی آنکھوں کے
سِسکتے گیت سُناؤں
تاکہ تو صدیوں کا جاگا تھکا ہُوا
اس کھُلی فضا کے میدانوں میں
کچھ لمحوں کو سو جائے......آرام کرے
مالک
تو میری باتوں پہ
کتنی محبت سے ہنستا ہے
لیکن میرے عصر کے مُوسیٰ

برہم ہیں

○
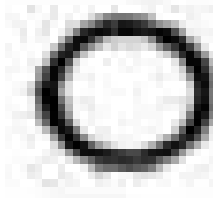
مکین خوش تھے کہ جب بند تھے مکانوں میں
کھلے کِواڑ تو تالے پڑے زبانوں میں

درخت ماؤں کی مانند اِنتظار میں ہیں
طیُور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

ہوا کی زد پہ بھی دو اِک چراغ روشن ہیں
بلا کے حوصلے دیکھے ہیں سخت جانوں میں

مجھے ہلاک کیا اعتماد نے میرے
کہ میکبتھ تھے سبھی میرے میزبانوں میں

کل آئینے نے بڑے دُکھ کی بات مجھ سے کہی
فرازؔ تو بھی ہے گزرے گئے زمانوں میں

○

عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیرنگ بھرا ہے
اب دیوانے کا دامن بھی سنگ بھرا ہے

اب یہ کھُلا ہے کتنی پُرانی دُشمنیاں تھیں
یاروں میں ہر ایک کا خنجر زنگ بھرا ہے

میرے بدل جانے پر تُم کو حیرت کیوں ہے
مَیں نے یہ بہُروپ تمہارے سنگ بھرا ہے

قتل گہوں کا رستہ اوروں سے کیا پوچھیں
لہُو کے چھینٹوں سے اِک اِک فرسنگ بھرا ہے

بولتی آنکھوں کی چُپ بھی قاتل ہے لیکن
اُس کے سکُوتِ چشم میں جو آہنگ بھرا ہے

کچھ تو فرازؔ اپنے قصّے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی رنگ بھرا ہے

○
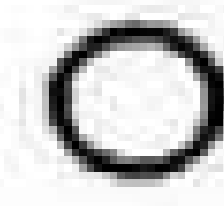
اب کے ہم پر کیسا سال پڑا لوگو
شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

ہر چہرہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہُوا
اب کے دِلوں میں ایسا بال پڑا لوگو

جب بھی دیارِ خندہ دلاں سے گزرے ہیں
اس سے آگے شہرِ ملال پڑا لوگو

آئے رُت اور جائے رُت کی بات نہیں
اب تو عُمروں کا جنجال پڑا لوگو

تلخ نوائی کا مجرم تھا صرف فرازؔ
پھر کیوں سارے باغ پہ جال پڑا لوگو

○

جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سائے تم ہو

میرا پندار بڑھا ہے اسی معیار کے ساتھ
جس رعونت سے مجھے دار پہ لائے تم ہو

اس خجالت کے تبسم سے عیاں ہیں یارو
آستینوں میں وہ خنجر کہ چھپائے تم ہو

دوست کا لطف تو احسان ہے جب ہو جائے
مہرباں پھر بھی بڑی دیر میں آئے تم ہو

دست بستہ و کمربستہ و لب بستہ سہی
اس پہ بھی خوش ہو کہ دربار میں آئے تم ہو

ہائے وہ صبحِ تمنا کہ نہ دیکھو گے فرازؔ
ہائے اُن شمعوں کی قسمت کہ جلائے تم ہو

○
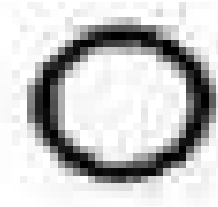
اِک بوند تھی لہو کی سرِ دار تو گرِی
یہ بھی بہت ہے خوف کی دیوار تو گرِی

کچھ مغبچوں کی جرأتِ رِندانہ کے نِثار
اَب کے خطیبِ شہر کی دستار تو گرِی

کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کہرام تو مچا
یوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار تو گرِی

ایک بدنُما صبح
کے بارے میں......کچھ نظمیں

جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بدنُما منظر
اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

دِل کا قصّہ یا افسانہ دار کا ہے
ہر محفل میں ذِکر اُسی دِلدار کا ہے

○
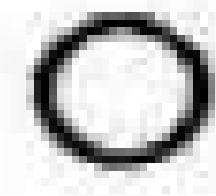
سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے

ہر کوئی تصویر نما
دُور خلا میں تکتا ہے

گلیوں میں بارود کی بو
یا پھر خون مہکتا ہے

سب کے بازو یخ بستہ
سب کا جسم دہکتا ہے

ایک سفر وہ ہے جس میں
پاؤں نہیں دِل تھکتا ہے

تیرا بچھڑنا جانِ غزل
شہرِ غزل کا مقطع ہے

جلّاد

تو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون
تو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے
ایسے بھی ہوتے ہونگے جن سے سُولی بھی شرماتی ہو
ایسے بھی جن سے دار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمّامہ ہے کوئی یا پرچم ہے سچائی کا
تو کیا جانے کِس کے منارۂ سر پہ کمند افگندہ ہے
وہ منصُور کا حرفِ انا ہو یا عیسیٰ کی شمعِ دُعا
تجھ کو کیا نخچیر ترا کوئی مولا ہے یا بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے
سب کو خبر ہے بے گُنہی کا اکثر جو انجام ہُوا
میزانیں، کن ہاتھوں میں تھیں جُنبشِ ابرو، کس کی تھی
کس پر اہلِ عدالت گرچہ کس پر لُطف اکرام ہُوا

محفل محفل مقتل مقتل سب بسمل جلاّد ہے کون
کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے کوئی اشارہ جانے ہے
نام ہے، کس کا دام ہے، کس کا اور یہاں صیّاد ہے کون
''جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے''

چلو اُس شہر کا ماتم کریں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے تھے
وہ رُت چاک دامانی کی تھی
یا خون رونے کی
ہوائے مہرباں کی راہ تکنے کا زمانہ تھا
کہ فصلِ لالہ رلعلیں کی حسرت میں
بدن انگار ہونے کا
سبھی موسم ہمیں پیارے رہے اس شہر کے
جو بدمقدّر تھا
کہ جس کی ساری دیواریں فصیلیں تھیں
کوئی روزن نہ رکھتی تھیں
وہ جس کی دُوددکش پہنائیاں
آنکھیں جلاتی تھیں
مگر روشن نہ رکھتی تھیں

ڈری سہمی ہُوئی خلقت کی لاشیں
اس لئے گلیوں میں پھرتی تھیں
کہ وہ مدفن نہ رکھتی تھیں
مگر پھر بھی ہمیں اِس شہر سے

کتنی محبت تھی

محبت ہے
کہ یہ شہرِ سحر نا آشنا
جِس کا مقدّر رات تھی یا صبحِ کاذب تھی
گلی کوچوں میں
بازاروں میں
دہلیزوں پہ بیٹھے منتظر لوگو
تمہیں بھی صبحِ صادق کا تصوّر

خواب پیارا تھا

ہمیں بھی تھا
چلو تاروں کا قتلِ عام بھی ہم کو گوارا تھا
ہمیں بھی اور تمہیں بھی
جن سیہ راتوں نے مارا تھا
یہی سُنتے رہے ہم تُم
انہیں کے دامنوں میں صبحِ صادق کا ستارا تھا

مگر اس مرتبہ
جس جھٹپٹے کو
روشنی کا اوّلیں زینہ سمجھ بیٹھے
اُسی کی آخری منزل پہ
اب سُورج کی نیلی لاش رکھی ہے
(کسی آسیب نے شب خون مارا تھا)
مگر اب سب کے چہرے اس قدر فق
اور بازو اس قدر شل ہیں

کہ جیسے کور چشماں گورکن
مصلوب سُورج کی بجائے
شہر کو دفنا کے آئے ہیں
چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے رہے
اور ہم جسے خود اپنے ہاتھوں سے
کفن پہنا کے آئے ہیں
جسے دفنا کے آئے ہیں

حرف کی شہادت

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سُولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہُو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پورے اُتر چکے
اب قرض چکائیں

اس کی کھڑاؤں وہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی

چادر کا حقدار وہی ہے
جس نے کیل لگائی تھی

اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آؤ اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بتلائیں

مُردوں کو زندہ کرنے کا
معجزہ بھی دکھلائیں

لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟

○
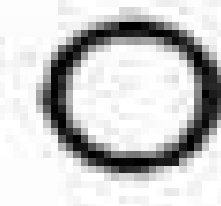
جب یار نے رختِ سفر باندھا کب ضبط کا یارا اُس دِن تھا
ہر دَرد نے دِل کو سہلایا کیا حال ہمارا اُس دِن تھا

جب خواب ہُوئیں اُس کی آنکھیں جب دُھند ہُوا اُس کا چہرہ
ہر اشک ستارہ اُس شب تھا ہر زخم انگارہ اُس دِن تھا

سب یاروں کے ہوتے سوتے ہم کِس سے گلے مِل کے روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اُس دِن تھا

جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے ہر یاد نے دِل پر دستک دی
جب لب پہ تمہارا نام نہ تھا ہر دُکھ نے پُکارا اُس دِن تھا

اک تُم ہی فرازؔ نہ تھے تنہا اب کے تو بُلاوا جب آیا
اِک بھیڑ لگی تھی مقتل میں ہر دَرد کا مارا اُس دِن تھا

○
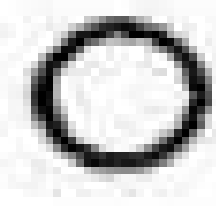
لباسِ دار نے منصب نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا مسیحا بنا دیا ہے اُسے

مگر سکُوتِ فلک بھی زمین جیسا تھا
دُعائے نیم شبی نے بھی کیا دیا ہے اُسے

سفر طویل نہ درپیش ہو مُسافر کو
جو نِصف شب سے بھی پہلے جگا دیا ہے اُسے

وہ سب حروف کہ بے شکل تھے سلامت ہیں
جو لفظ چہرہ نما تھا مِٹا دیا ہے اُسے

کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اُسے

فغاں کہ اہلِ ہوس کی رقابتوں نے فرازؔ
جو شخص جانِ جہاں تھا گنوا دیا ہے اُسے

○
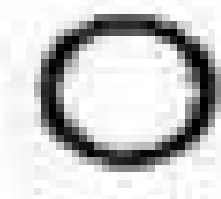
رت جگے ہوں کہ بھرپور نیندیں مسلسل اُسے دیکھنا
وہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل اُسے دیکھنا

اِس کڑی دُھوپ میں دِل تپکتے ہیں اور بام پر وہ نہیں
کل نئے موسموں میں جب آئیں گے بادل اُسے دیکھنا

وہ جو خُوشبو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہوا گنگنائے گی ناچے گا جنگل اُسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے اور فضاؤں میں ہے اور دُعاؤں میں ہے
کوئی پھیلائے دامن کہ لہرائے آنچل اُسے دیکھنا

شاعری میں بھی اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش مکمل اُسے دیکھنا

یہ بھی کیا سوچنا ہے کہ ہر وقت ناداں اُسے سوچنا
یہ بھی کیا دیکھنا ہے کہ ہر سمت پاگل اُسے دیکھنا

شامِ وعدہ سہی دُکھ زیادہ سہی پھر بھی دیکھو فرازؔ
آج شب اُس کی فُرقت میں کہہ لو غزل کل اُسے دیکھنا

○
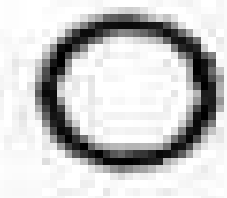
جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
یہ شہر کیا ہے یہاں کیا سخن کہا جائے

بضد ہے تیشۂ خُونیں لئے ہُوئے کوئی شخص
کہ گورکن کو بھی اب کوہکن کہا جائے

اگر ہجُوم صداؤں کے دیکھنا چاہو
تو شرط یہ ہے کہ پہلا سخن کہا جائے

چراغ بجُھتے ہی رہتے ہیں پر جواب کے ہوا
اسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

عجیب رسم ہے جو صدرِ انجمن ہو فرازؔ
وہ چاہتا ہے اُسے انجمن کہا جائے

○
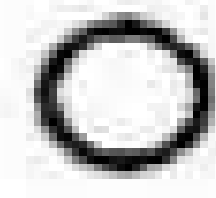
گرفتہ دِل عندلیب گھائل گُلاب دیکھے
محبتوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے

وہ دِن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اِک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے

یہ صبحِ کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

وہ چشمِ محروم کتنی محروم ہے کہ جِس نے
نہ خواب دیکھے نہ رتجگوں کے عذاب دیکھے

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ مَیں نے دہلیزِ قاتلاں پر گُلاب دیکھے

یہ ساعتِ دید اور وحشت بڑھا گئی ہے
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماہتاب دیکھے

مجھے تو ہم مکتبی کے دِن یاد آ گئے ہیں
کہ میں اُسے پڑھ رہا ہُوں اور وہ کتاب دیکھے

دُشمن کا قصیدہ

ہم کہ تلوار کے دُشمن تھے
کہ تلوار عدو تھی اپنی
اب مدح خواں ہیں
کہ تلوار کا کردار بھی تھا

اور حریف اپنا
کوئی یارِ جگر دار بھی تھا
اور وہ یارِ جگر دار طرحدار بھی تھا
نہ کہ بارود کی نالی
نہ کہ فولاد کا خول
نہ کہ بزدل کا مؤقف
نہ کہ کم ظرف کا بول
کہ ہمیشہ رہی تلوار
کسی حرفِ صفا کی مانند

سچ کے پرچم کی طرح
دِل کی صدا کی مانند
نہ کہ مُلاّ کی قبا اور ریا کی مانند
نہ منافق کی دُعا کی مانند

○
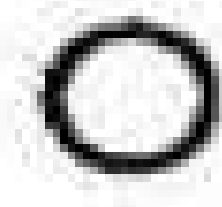
وفا کے بھیس میں کوئی رقیبِ شہر بھی ہے
حذر کہ شہر کا قاتل طبیبِ شہر بھی ہے

وہی سپاہِ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیبِ شہر بھی ہے

اُدھر کی آگ اِدھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں
ہوا بھی تیز ہے جنگل قریبِ شہر بھی ہے

اب اُس کے ہجر میں روتے ہیں اس کے گھائل بھی
خبر نہ تھی کہ وہ ظالم حبیبِ شہر بھی ہے

یہ راز نعرۂ منصور ہی سے ہم پہ کھُلا
کہ چوبِ منبرِ مسجد صلیبِ شہر بھی ہے

کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فرازؔ
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی ہے

ہواؤں کی بشارت

تمام ماؤں کے ہونٹ پتھر ہیں
اور آنکھوں میں زخم ہیں
اور دِل تپکتے ہیں
رات کہتی ہے
"ان کے بیٹوں کو
شب گئے
چند لشکری
ساتھ لے گئے تھے
تو اب تلک اُن کی واپسی کی خبر نہیں ہے"
نہ واپسی کا گمان رکھنا
ہوائیں سہمے ہُوئے چراغوں سے کہہ گئی تھیں
کہ آنے والی رُتوں کے آغاز تک
تمہارے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے
یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی

اور اُن کے آنسو جمے رہیں گے
اور اُن کی آہیں تھمی رہیں گی
نہ جی سکیں گی
نہ مر سکیں گی

مت قتل کرو آوازوں کو

تُم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دِل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اِس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تُم کِس کا لہُو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

جب قتل ہُوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کِس پر سنگ اُٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

○
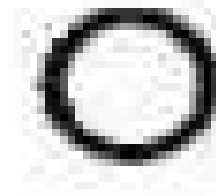
عجب شہر تھے اور عجب لوگ تھے
سِتم صُورتیں تھیں غضب لوگ تھے

فقیر اس گلی کے گداگر بنے
سراپا طلب بے طلب لوگ تھے

وُہ کافر اکیلا کھنچا دار پر
نمازِ جنازہ میں سب لوگ تھے

انہیں راستوں پر کلاہیں گریں
انہیں راہگزاروں میں جب لوگ تھے

نہ مقتل نہ میلا تماشا کوئی
مگر جا بجا بے سبب لوگ تھے

سبھی سر بہ سجدہ تھے دربار میں
ہم ایسے کہاں بے ادب لوگ تھے

فرازؔ اپنی بربادیوں کا سبب
نہ اب لوگ ہیں اور نہ جب لوگ تھے

○
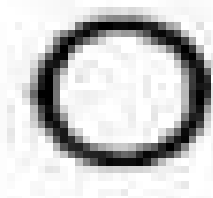
یہ کس عذاب سے خائف مرا قبیلہ ہے
کہ خون مل کے بھی چہروں کا رنگ پیلا ہے

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہوئیں اَب کے
کہ میرے سارے گلابوں کا رنگ نیلا ہے

ہو کس طرح سے محبت کی گفتگو کہ ابھی
مرے لہو سے ترا فرش و سقف گیلا ہے

گداگرانِ سخن کو نوید ہو کہ یہاں
سُبک سری ہی فقط رزق کا وسیلہ ہے

فرازؔ اسی لئے ہم زندگی پہ مرتے ہیں
کہ یہ بھی زندگی کرنے کا ایک حیلہ ہے

○
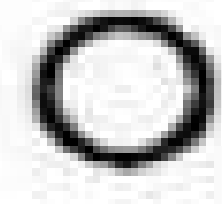
جنہیں زعمِ کمانداری بہت ہے
انہیں پر خوف بھی طاری بہت ہے

کچھ آنکھیں بھی ہیں بینائی سے عاری
کچھ آئینہ بھی زنگاری بہت ہے

نہ جانے کب لٹے گا شہرِ مقتل
سُنا ہے اَب کے تیاری بہت ہے

کچھ اب کے ٹوٹنا چاہا تھا خود بھی
کچھ اب کے وار بھی کاری بہت ہے

یہاں پیہم قبیلے قتل ہونگے
یہاں شوقِ عزاداری بہت ہے

شہر آشوب

اپنی بود و باش نہ پوچھو
ہم سب بے توقیر ہُوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہُوئے تم ہُوئے میرؔ ہُوئے

سہمی سہمی دیواروں میں
سایوں جیسے رہتے ہیں
اس گھر میں آسیب بسا ہے
عامل کامل کہتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
اِک شب جب شب خون پڑا
گلیوں میں بارود کی بُو تھی
کلیوں پر سب خون پڑا

اب کے غیر نہیں تھا کوئی
گھر والے دُشمن نکلے
جِن کو برسوں دُودھ پلایا
ان ناگوں کے پھن نکلے

رکھوالوں کی نیّت بدلی
گھر کے مالک بن بیٹھے
جو غاصب تھے محسن کُش تھے
صُوفی سالک بن بیٹھے

جو آواز جہاں سے اُٹھی
اس پر تیر تبر برسے
ایسے ہونٹ سلے لوگوں کے
سرگوشی کو بھی ترسے

گلی گلی میں بندی خانے
چوکی چوک میں مقتل ہیں
جلّادوں سے بھی بڑھ چڑھ کر
منصف وحشی پاگل ہیں

کتنے بے گنہوں کے گلے پر
روز کمندیں پڑتی ہیں
بُوڑھے بچے گھروں سے غائب
بیبیاں جیل میں سڑتی ہیں

اس کے ناخن کھینچ لیئے ہیں
اس کے بدن کو داغ دیا
گھر گھر قبریں در در لاشیں
بُجھا ہر ایک چراغ دِیا

ماؤں کے ہونٹوں پر ہیں نوحے
اور بہنیں کُرلاتی ہیں
رات کی تاریکی میں ہوائیں
کیسے سندیسے لاتی ہیں

قاتل اور درباری اس کے
اپنی ہٹ پر قائم ہیں
ہم سب چور لُٹیرے ڈاکو
ہم سب کے سب مجرم ہیں

ہمیں میں کوئی صُبح سویرے
کھیت میں مُردہ پایا گیا
ہمیں سا دہشت گرد تھا کوئی
چُھپ کے جسے دفنایا گیا

سارا شہر ہے مُردہ خانہ
کون اس بھید کو جانے گا
ہم سارے لاوارث لاشیں
کون ہمیں پہچانے گا

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اُس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہُوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہُوئے

تمام صُوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نِشستہ راہ میں ہیں

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثناگر تھے
وہ آسمانِ ہُنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجُوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تُمہارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تُم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اُسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کِسی خُورشید کو شہید کرے
تو صُبح اِک نیا سُورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کا
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکّھا تپاکِ جاں سے لِکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عُمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

نابینا شہر میں آئینہ

منصور جاوید کے نام

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے وہ شہر ہمارا کیسا ہے
سب دوست ہمیں پیارے ہیں مگر وہ جان سے پیارا کیسا ہے

شب بزمِ حریفاں سجتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے

جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وا درِ زنداں رہتا تھا
اب مفتیٔ دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے

میخانے کا پندار گیا پیمانے کا معیار کہاں
کل تلخیٔ مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے

وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے

ملکوں ملکوں گھومے ہیں، بہت جاگے ہیں، بہت روئے ہیں، بہت
اب تم کو بتائیں کیا یارو دنیا کا نظارا کیسا ہے

یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارہ کیسا ہے

کیا کوئے نگاراں میں اَب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
اہلِ دِل نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے

کیا اَب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہَوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اَب وقت کا دھارا کیسا ہے

قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی
وہ بھی تو خبر رکھتا ہو گا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے

ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہُوا ہر درد کا مارا کیسا ہے

کہتے ہیں کہ گھر اَب زنداں ہیں سنتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے

پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت دیکھو
جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے دِل پارا پارا کیسا ہے

اے دیس سے آنے والے مگر تم نے تو نہ اتنا بھی پوچھا
وہ کوی جسے بن باس ملا وہ درد کا مارا کیسا ہے

ترتیب

ابیات

بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

مرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صُبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مَدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظُلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دِل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تُو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مُفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو مُعتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خُدا کے نام کو بیچیں مگر خُدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خُدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبُو ہے لباس
کہ میرے دِل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صُلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہُوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہُوں قبا و کلاہ والوں سے

○
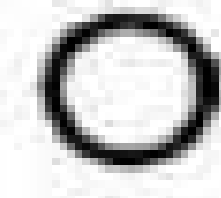
نہ کوئی تازہ رفاقت نہ یارِ دیرینہ
وہ قحطِ عشق کہ دشوار ہو گیا جینا

مرے چراغ تو سورج کے ہم نَسب نِکلے
غلط تھا اب کے تری آندھیوں کا تخمینہ

یہ زخم کھائیو سر پر بپاسِ دستِ سبُو
وہ سنگِ محتسب آیا بچائیو مینا

تمہیں بھی ہجر کا دُکھ ہے نہ قُرب کی خواہش
سنو کہ بھول چکے ہم بھی عہدِ پارینہ

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

چلو کہ بادہ گساروں کو سنگسار کریں
چلو کہ ٹھہرا ہے کارِ ثواب خوں پینا

اُس ایک شخص کی سج دھج غضب کی تھی کہ فرازؔ
میں دیکھتا تھا، اسے دیکھتا تھا آئینہ

○
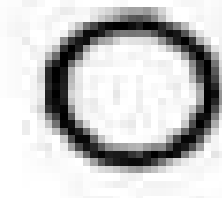
گئی رتوں میں تو شام و سحر نہ تھے ایسے
کہ ہم اُداس بہت تھے مگر نہ تھے ایسے

یہاں بھی پھول سے چہرے دکھائی دیتے تھے
یہ اب جو ہیں یہی دیوار و دَر نہ تھے ایسے

ملے تو خیر نہ ملنے پہ رنجشیں کیسی
کہ اُس سے اپنے مراسم تھے پر نہ تھے ایسے

رفاقتوں سے مَرا ہُوں مسافتوں سے نہیں
سفر وہی تھے مگر ہم سفر نہ تھے ایسے

ہمیں تھے جو ترے آنے تلک جلے ورنہ
سبھی چراغ سرِ رہگذر نہ تھے ایسے

دلِ تباہ تجھے اور کیا تسلی دیں
ترے نصیب ترے چارہ گر نہ تھے ایسے

فراز خوش ہو کہ احسان اس ستمگر کے
جو تجھ پہ ہیں وہ کسی اور پر نہ تھے ایسے

○
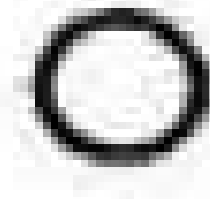
اب کیا سوچیں کیا حالات تھے کس کارن یہ زہر پیا ہے
ہم نے اُس کے شہر کو چھوڑا اور آنکھوں کو موند لیا ہے

اپنا یہ شیوہ تو نہیں تھا اپنے غم اوروں کو سونپیں
خود تو جاگتے یا سوتے ہیں اُس کو کیوں بے خواب کیا ہے

خلقت کے آوازے بھی تھے بند اُس کے دروازے بھی تھے
پھر بھی اس کوچے سے گذرے پھر بھی اس کا نام لیا ہے

ہجر کی رُت جاں لیوا تھی پر غلط سبھی اندازے نکلے
تازہ رفاقت کے موسم تک میں بھی جیا ہوں وہ بھی جیا ہے

ایک فرازؔ تمہیں تنہا ہو جو اَب تک دُکھ کے رَسیا ہو
ورنہ اکثر دِل والوں نے درد کا رستہ چھوڑ دیا ہے

○

اَب تو اس طرح مری آنکھوں میں خواب آتے ہیں
جس طرح آئینے چہروں کو ترس جاتے ہیں

احتیاط اہلِ محبت کہ اِسی شہر میں لوگ
گل بدست آتے ہیں اور پابہ رسن جاتے ہیں

جیسے تجدیدِ تعلّق کی بھی رُت ہو کوئی
زخم بھرتے ہیں تو احباب بھی آ جاتے ہیں

ساقیا تُو نے تو میخانے کا یہ حال کیا
بادہ کش محتسبِ شہر کے گُن گاتے ہیں

طعنۂ نشّہ نہ دو سب کو کہ کچھ سوختہ جاں
شدّتِ تشنہ لبی سے بھی بہک جاتے ہیں

ہر کڑی رات کے بعد ایسی قیامت گذری
صُبح کا ذکر بھی آئے تو لَرز جاتے ہیں

سفید چھڑیاں

جنم کا اندھا

جو سوچ اور سچ کے راستوں پر

کبھی کبھی کوئی خواب دیکھے

تو خواب میں بھی

عذاب دیکھے

یہ شاہراہِ حیات جس پر

ہزار ہا قافلے رواں ہیں

سبھی کی آنکھیں

ہر ایک کا دِل

سبھی کے رستے

سبھی کی منزل

اِسی ہجومِ کشاں کشاں میں

تمام چہروں کی داستاں میں

نہ نام میرا

نہ ذات میری

مرا قبیلہ

سفید چھڑیاں

○
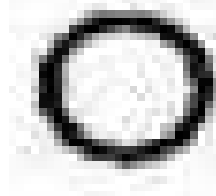
جان کی پروا پھر کس کو ہو جب قاتل ہو یاروں سا
باتیں ہوں دلداروں جیسی لہجہ ہو غم خواروں سا

کس نے کہا تھا برکھا رُت میں یُوں بے دھیان انجان پھرو
بوند پڑے سے اور بھی جیسے بھڑکے جسم انگاروں سا

آتے جاتے سارے موسم اس سے نسبت رکھتے ہیں
اس کا ہجر خزاؤں جیسا اُس کا قُرب بہاروں سا

اب کے ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے دِلوں پر تیر چلیں
اب کے گلابوں کا موسم بھی وار کرے تلواروں سا

برسوں بعد فرازؔ کو دیکھا اُس کا حال احوال نہ پوچھ
شعر وہی دِل والوں جیسے شغل وہی بنجاروں سا

○
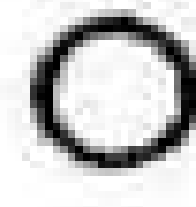
شعلہ تھا جَل بُجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چُکا ہُوں صدائیں مجھے نہ دو

جو زہر پی چکا ہُوں تمہی نے مجھے دیا
اب تم تو زندگی کی دُعائیں مجھے نہ دو

یہ بھی بڑا کرم ہے سلامت ہے جسم ابھی
اے خسروانِ شہر قبائیں مجھے نہ دو

ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آ سکوں
ہر بار دُور جا کے صدائیں مجھے نہ دو

کب مجھ کو اعترافِ محبت نہ تھا فرازؔ
کب میں نے یہ کہا ہے سزائیں مجھے نہ دو

○

صنم تراش پر آدابِ کافرانہ سمجھ
ہر ایک سنگِ سرِ راہ کو خدا نہ سمجھ

میں تجھ کو مانگ رہا ہوں قبول کر کہ نہ کر
یہ بات تیری مری ہے اسے دُعا نہ سمجھ

پلٹ کے آئے گا وہ بھی گئی رُتوں کی طرح
جو تجھ سے رُوٹھ گیا ہے اسے جُدا نہ سمجھ

رہِ وفا میں کوئی آخری مقام نہیں
شکستِ دل کو محبت کی انتہا نہ سمجھ

ہر ایک صاحبِ منزل کو بامُراد نہ جان
ہر ایک راہ نشیں کو شکستہ پا نہ سمجھ

فرازؔ آج کی دنیا مرے وجود میں ہے
مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

طاہرہ کے لیے

ایک نظم

سوچ کے پھیلے صحراؤں میں
آگ سے دِن اور برف سی راتیں
کاٹ کے بھی جب ہاتھ نہ آئیں
لفظ بھی آہو لگتے ہیں،

جب دِل دَرد کے ویرانوں میں
ریزہ ریزہ چن کر لائے
اُن سے کوئی یاد جگائے
لفظ بھی آنسو لگتے ہیں،

جب میرے کھوئے خوابوں کو
میری کویتا ڈھونڈ کے لائے
گیت بنائے اور تُو گائے
لفظ بھی جَادو لگتے ہیں

ناسپاس

روبرو ہیں مرے سب میرے تراشے ہُوئے بُت
میرے شہکار مرے نقش پُرانے سارے
کون جانے کہ یہ کن خوابوں کی تعبیریں ہیں
یُوں تو اظہارِ غمِ جاں کے بہانے سارے

کوئی گوتم، کوئی عیسےٰ، کوئی مریم، کوئی جون،
دَرد کی آگ لئے حُسن کی تقدیس لئے
خود نمائی پہ ہیں مغرور سبھی کے پیکر
کاوشِ تیشۂ آذر کو فراموش کئے

○
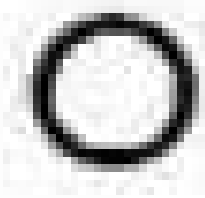
میں کس کا بخت تھا مری تقدیر کون تھا
تُو خواب تھا تو خواب کی تعبیر کون تھا

میں بے گلیم لائقِ دشنام تھا مگر
اہلِ قبا میں صاحبِ توقیر کون تھا

اَب قاتلوں کا نام و نشاں پوچھتے ہو کیا
ایسی محبتوں سے بغلگیر کون تھا

میں زخم زخم اُس سے گلے مِل کے کیوں ہُوا
وہ دوست تھا تو صورتِ شمشیر کون تھا

میزاں بدست کون لرزتا رہا فرازؔ
منصف تھا کون صاحبِ تقصیر کون تھا

○
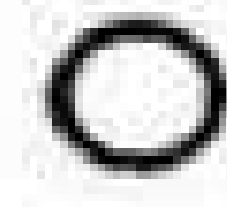
اِس کا سوچا بھی نہ تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری

آ گلے تجھ کو لگا لوں مرے پیارے دشمن
اِک مری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

میں تو صحرا کی تپش، تشنہ لبی بھول گیا
جو مرے ہم نفسوں پر لبِ دریا گزری

آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

میری تنہا سفری میرا مقدّر تھی فرازؔ
ورنہ اس شہرِ تمنّا سے تو دنیا گزری

○
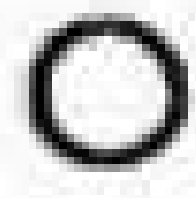
جس کی جانب سے زمانہ ہُوا نامہ نہ پیام
یہ غزل بھی ہے اُسی زود فراموش کے نام

اس کی قُربت کے سمے اس کی محبت کے نشے
اتنے شیریں بھی نہ تھے جتنی ہے یادِ ایام

حرفِ دلبر کوئی قاصد کہ بفیضِ واعظ
شہرِ شیریں سخناں بن گیا شہرِ دُشنام

کل تو اس ہجر کی لذّت کو بھی ترسے گا یہ دل
اور رُک رُک کے ذرا ساعتِ آسودہ خرام

سو حوالوں سے تجھے یاد کروں جانِ فرازؔ
جانِ جاں، جانِ جہاں، جانِ سخن، جانِ کلام

جاؤ!

جاؤ کہ مجھے یقیں نہیں ہے
تم اَب کے گئے تو آ سکو گے
دہلیز سے اِک قدم اُتر کر
وہ راہ گزار منتظر ہے
جِس پر جو کوئی چلا گیا ہے
قدموں کے نشاں بچھا گیا ہے
فرقت کے دیے جلا گیا ہے

آئی بینک

میں تو اس کربِ نظارا سے تڑپ اُٹھا ہوں
کتنے ایسے ہیں جنہیں حسرتِ بینائی ہے
جن کی قسمت میں کبھی دولتِ دیدار نہیں
جن کی قسمت میں تماشا نہ تماشائی ہے
جو ترستے ہیں کہ کرنوں کو برستا دیکھیں
جو یہ کہتے ہیں کہ منزل نہیں رستا دیکھیں
اُن سے کہہ دو کہ وہ آئیں مری آنکھیں لے لیں

اس سے پہلے کہ مرا جسم فنا ہو جائے
اس سے پہلے کہ یہ خاکستر جاں بھی نہ رہے
اس سے پہلے کہ کوئی حشر بپا ہو جائے
خواب ہونے سے بچا لے کوئی میری آنکھیں
اپنے چہرے پہ لگا لے کوئی میری آنکھیں

کون سہہ پائے گا لیکن مری آنکھوں کے عذاب
کس کو یہ حوصلہ ہو گا کہ ہمیشہ دیکھے،
اپنی پلکوں کی صلیبوں سے اُترتے ہوئے خواب
جن کی کرچوں کی چبھن رُوح میں بس جاتی ہے
زندگی، زندگی بھر کے لیے گُرلاتی ہے

○

تیرے چرچے ہیں جفا سے تیری
لوگ مر جائیں بلا سے تیری

کوئی نسبت کبھی اے جانِ سخن
کسی محرومِ نوا سے تیری

غمِ جاں ہو کہ غمِ دُنیا ہو
یاد دیتی ہے دلاسے تیری

اے مرے ابرِ گریزاں کب تک
راہ تکتے رہیں پیاسے تیری

تیرے مقتل بھی ہمی سے آباد
ہم بھی زندہ ہیں دعا سے تیری

تُو بھی نادم ہے زمانے سے فرازؔ
وہ بھی ناخوش ہیں وفا سے تیری

O
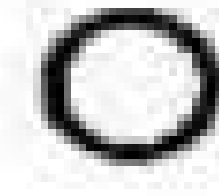
میں تو ہر طرح کے اسبابِ ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اَب کے سلامت دیکھوں

وہ جو قاتل تھے وہ عیسا نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انہیں اہلِ عدالت دیکھوں

وہ جو بے ظرف تھے اب صاحبِ میخانہ ہُوئے
اب بمشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں

گردنیں ٹوٹی ہُوئی، سَر ہیں خمیدہ جِن کے
اُن کو سرگشتۂ پندارِ امامت دیکھوں

قیمتِ بے ہنراں نیلم و مرجاں ٹھہری
قسمتِ دیدہ وراں سنگِ ملامت دیکھوں

کذب کی ریگِ رواں یوں ہے کہ اُس کے آگے
خشک ہوتا ہُوا دریائے صداقت دیکھوں

جانے کب دشنہ کو پیوستِ رگِ جاں کر دیں
ہر گھڑی میں جنہیں مصروفِ عبادت دیکھوں

○

پھرے گا تو بھی یونہی کوبکو ہماری طرح
دریدہ دامن و آشفتہ مُو ہماری طرح

کبھی تو سنگ سے پھُوٹے گی آبجوغم کی
کبھی تو ٹوٹ کے روئے گا تُو ہماری طرح

پلٹ کے تجھ کو بھی آنا ہے اس طرف لیکن
لُٹا کے قافلۂ رنگ و بُو ہماری طرح

یہ کیا کہ اہلِ ہوس بھی سجائے پھرتے ہیں
دلوں پہ داغ جبیں پر لہو ہماری طرح

وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو ہُو بہُو ہماری طرح

ہمی فرازؔ سزاوارِ سنگ کیوں ٹھہرے
کہ اور بھی تو ہیں دیوانہ خُو ہماری طرح

سرحدیں

کِس سے ڈرتے ہو کہ سب لوگ تمہاری ہی طرح
ایک سے ہیں وہی آنکھیں وہی چہرے وہی دِل
کس پہ شک کرتے ہو جتنے بھی مسافر ہیں یہاں
ایک ہی سب کا قبیلہ وہی پیکر وہی گِل

ہم تو وہ تھے کہ محبت تھا وطیرہ جن کا
پیار سے مِلتا تو دُشمن کے بھی ہو جاتے تھے
اس توقع پہ کہ شاید کوئی مہماں آ جائے
گھر کے دروازے کھُلے چھوڑ کے سو جاتے تھے

ہم تو آئے تھے کہ دیکھیں گے تمہارے قریے
وہ دَر و بام کہ تاریخ کے صُورت گر ہیں
وہ ارینے وہ مساجد وہ کلیسا وہ محل
اور وہ لوگ جو ہر نقش سے افضل تر ہیں

رُوم کے بُت ہوں کہ پیرس کی ہو مونا لیزا
کیٹس کی قبر ہو یا تربتِ فردوسی ہو
قرطبہ ہو کہ اجنتا کہ موہنجو داڑو
دیدۂ شوق نہ محرومِ نظر بوسی ہو

کس نے دُنیا کو بھی دَولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کئے ہیں یہ اثاثے سَارے
کس نے دیوار تفاوت کی اُٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے سارے

خیر تم شوق سے دیکھو مرا سب رختِ سفر
میں تو پاگل ہوں مری بات پہ مت کان دھرو
یہ کتابیں ہیں یہ تحفے ہیں یہ کپڑے میرے
مہر کو ثبت کرو اور مجھے راہداری دو

جب کی بات

میں نے کہا تھا
دل کے سفر میں
یوں تو بہت سی منزلیں ہیں
لیکن
جاناں
تم سے آگے کوئی نہیں
آج مگر مجبورِ سفر ہوں

○
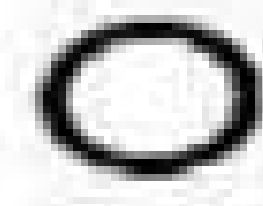
یہ فاصلہ جو پڑا ہے مرے گماں میں نہ تھا
کہ اب کی بار زمانہ بھی درمیاں میں نہ تھا

کوئی بھی نظمِ چمن ہو یہ ہم نے دیکھا ہے
سحر کا نغمہ سرا شام آشیاں میں نہ تھا

کہ جس کے ہاتھ میں پتھر کماں ہو تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا مرے شہرِ مہرباں میں نہ تھا

دہکتی دُھوپ میں خلقت تھی گوش بر آواز
بجز خطیب مگر کوئی سائباں میں نہ تھا

دُعائیں میں نے ہی مانگی تھیں رُت بدلنے کی
فرازؔ میرا نشیمن ہی گلستاں میں نہ تھا

○
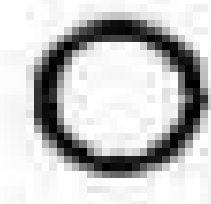
اس قدر مسلسل تھیں شِدّتیں جُدائی کی
آج پہلی بار اس سے میں نے بے وفائی کی

ورنہ اب تلک یُوں تھا خواہشوں کی بارش میں
یا تو ٹوٹ کر رویا یا غزل سَرائی کی

تج دیا تھا کل جن کو ہم نے تیری چاہت میں
آج اُن سے مجبوراً تازہ آشنائی کی

ہو چلا تھا جب مجھ کو اختلاف اپنے سے
تُو نے کس گھڑی ظالم میری ہمنوائی کی

ترک کر چکے قاصد کوئے نامراداں کو
کون اَب خبر لاوے شہرِ آشنائی کی

طنز و طعنہ و تہمت سب ہنر ہیں ناصح کے
آپ سے کوئی پوچھے ہم نے کیا بُرائی کی

پھر قفس میں شور اُٹھا قیدیوں کا اور صیّاد
دیکھنا اُڑا دے گا پھر خبر رہائی کی

دُکھ ہوا جب اُس دَر پر کل فرازؔ کو دیکھا
لاکھ عیب تھے اُس میں خُو نہ تھی گدائی کی

نئی مُسافت کا عہد نامہ

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا

جو میرے دیوار و در سے ٹپکا

تو شاہراہوں تک آ گیا تھا

جہاں کسی کو گماں نہیں تھا

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا

مرے مقدر میں آبرو

کی تمام لمبی مسافتیں تھیں

مرے سفر میں

حسینؑ کے سر، مسیح کے جسم

کی سبھی دردناکیاں تھیں، اذیتیں تھیں

مگر مرا درد بے وقر تھا

مگر مرا دشت بے شجر تھا

یہ بات برسوں کی ہے ..... تو ہو

پر وہ ساعتیں اب بھی نوحہ گر ہیں

جہاں کہیں بھی ہجوم ہوتا
تو سب مری سمت دیکھتے
اور طنز کرتے
کہ اس کو دیکھو
یہ کون پیکر ہے
جس کا چہرہ نہیں
میں اُن سے کہتا
کہ مَیں تمھی میں سے ہوں
یہ دیکھو
یہ میری مٹی یہ میری دنیا یہ خواب میرے
وہ مجھ سے کہتے
کہ تیری مٹی کو تیری دنیا کو تیرے خوابوں کو کون دیکھے
کہ تیری آنکھیں نہیں
میں اُن سے کہتا کہ
میرے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں صداقتوں کی، رفاقتوں کی
وہ مجھ سے کہتے
بدن تو دیوار کا بھی ہوتا ہے
ہاتھ اشجار کے بھی ہوتے ہیں
جن کی شاخوں کی نوک پر

صرف ایک پتا لرزتا رہتا ہے
پر وہ دیوار اور وہ اشجار ہم نہیں ہیں
میں ان سے کہتا
کہ مجھ کو دیکھو
نہ میری گردن میں طوق ہے
اور نہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
مگر وہ کہتے
بہت سے محکوم بے رسن ہیں
کہ دست و پا کی کشادگی کا عذاب
حیواں بھی جھیلتے ہیں
پر اُن کے ماتھوں کی لوح پر
کوئی نام کندہ
نہ اُن کے چہروں پہ
عہد نامہ کوئی رقم ہے
یہ عہد نامہ
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہے ثبات بھی ہے
میں نسلِ آدم کے اس قبیلے کا فرد تھا
پر کوئی مجھے جانتا نہیں تھا

میں اپنے ایثار کے فسانے انہیں سناتا
مگر کوئی مانتا نہیں تھا
ہم ایک جیسے تھے
پر گروہِ الم کشاں میں
کوئی بھی اک دوسرے کو پہچانتا نہیں تھا
کہ سب کے چہرے تھے سب کے ماتھے تھے
اور ماتھوں پہ
عہد نامے لکھے ہوئے تھے
محبتوں کے صداقتوں کے
سفر کی ساری رفاقتوں کے
بیافرا کی پہاڑیوں
ویت نام کے جنگلوں
بلا کی قیامتوں کے
تمام پیکر تمام چہرے تھے
آئینے ان علامتوں کے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہیں، ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں
میں سر بریدہ پلٹ کے آیا
تو ساتھ سارے نشان لایا

اَنا کے

پندار کے

وفا کے

مرا لہو ندیوں کی صورت بہا تو قلزم بنا گیا ہے

مرا لہو پھیل کر

مری خوش نہاد مٹی کی سرحدوں کو بچا گیا ہے

وہ میرے چہرے پہ ایسی آنکھیں لگا گیا ہے

جو دوسروں سے عظیم تر ہیں

جو سب کی نظروں میں معتبر ہیں

وہ زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں

جو ذات بھی کائنات بھی ہیں

○
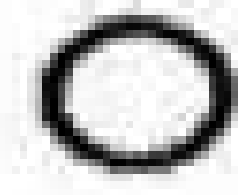
میں چُپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف

میں مر گیا وہیں کہ صفِ قاتلاں سے جب
خنجر بدست تو بھی رواں تھا مری طرف

اب پھر رہا ہُوں جسم کے ٹکڑے لیے ہوئے
شاید ہجومِ چارہ گراں تھا مری طرف

مجھ کو مری شکست کا کوئی جواز دو!
کہتے ہیں روشنی کا نشاں تھا مری طرف

یہ اور بات تو نے زمانے کی بات کی
رُوئے سخن تو اے مری جاں تھا مری طرف

میں لشکرِ الم کے مقابل ہوں سرخرو
اس معرکے میں دل سا جواں تھا مری طرف

میں نے ستم گروں کو پکارا ہے خود فرازؔ
ورنہ کسی کا دھیان کہاں تھا مری طرف

○
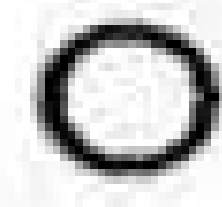
جو غیر تھے وہ اسی بات پر ہمارے ہوئے

کہ ہم سے دوست بہت بے خبر ہمارے ہوئے

کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی

بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہُوئے

اب اِک ہجومِ شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے

جنہیں کوئی نہ مِلا ہم سفر ہمارے ہُوئے

کِسی نے غم تو کِسی نے مزاجِ غم بخشا

سب اپنی اپنی جگہ چارہ گر ہمارے ہُوئے

بُجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو

اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہُوئے

وہ اعتماد کہاں سے فرازؔ لائیں گے

کِسی کو چھوڑ کے وہ اَب اگر ہمارے ہُوئے

○
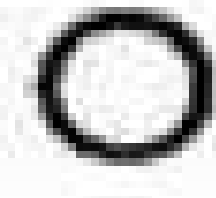
رات اور چاند میں جب سرگوشی ہوتی ہے
یاد سے دل کی ہم آغوشی ہوتی ہے

اپنا گھر چھوڑا یا اُس کا دَر چھوڑا
اس کے بعد تو خانہ بدوشی ہوتی ہے

بوجھ وفا کا ہم نے اُٹھایا یا تم نے
ہم سفروں میں یہ ہمدوشی ہوتی ہے

بستی والے ایسے خوفزدہ کب تھے
اب تو خود سے بھی سرگوشی ہوتی ہے

آدھی رات کو زنداں کا دَر کھلتا ہے
اُس کے بعد طویل خموشی ہوتی ہے

حرف فروشوں کا میلا لگتا ہے فرازؔ
جب دربار میں بردہ فروشی ہوتی ہے
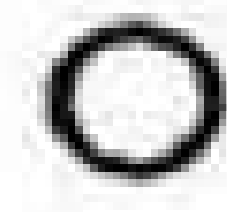
○

یہ میں بھی کیا ہوں، اُسے بھول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اُسی کا رہا

وہ بُت کہ دشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو در اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دل نے سخن معتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فرازؔ
اسی لئے کفِ قاتل پہ سَر اُسی کا رہا

ہم جیسے

حُسین تجھ پہ کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تو عظیم ہے بے ننگ و نام ہم جیسے

برنگِ ماہ ہے بالائے بام تجھ جیسا!
تو فرشِ راہ کئی زیرِ بام ہم جیسے

وہ اپنی ذات کی پہچان کو ترستے ہیں
جو خاص تیری طرح ہیں نہ عام ہم جیسے

یہ بے گلیم جو ہر کربلا کی زینت ہیں
یہ سب ندیم یہ سب تشنہ کام ہم جیسے

بہت سے دوست سَرِ دار تھے جو ہم پہنچے
سبھی رفیق نہ تھے سُست گام ہم جیسے

خطیبِ شہر کا مذہب ہے بیعتِ سُلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

تُو سر بریدہ ہُوا شہرِ ناسپاساں میں
زباں بریدہ ہُوئے ہیں تمام ہم جیسے

پہن کے خرقۂ خوں بھی کشیدہ سر ہیں فرازؔ
بغاوتوں کے علَم تھے مدام ہم جیسے

ایک شعر

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

○
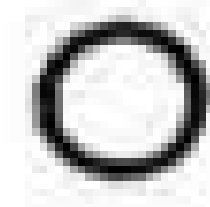
دِل منافق تھا شبِ ہجر میں سویا کیسا
اور جب تجھ سے مِلا ٹوٹ کے رویا کیسا

زندگی میں بھی غزل ہی کا قرینہ رکھا
خواب در خواب ترے غم کو پرویا کیسا

اب تو چہروں پہ بھی کتبوں کا گماں ہوتا ہے
آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں لبِ گویا کیسا

دیکھ اَب قُرب کا موسم بھی نہ سرسبز لگے
ہجر ہی ہجر مراسم میں سمویا کیسا

ایک آنسو تھا کہ دریائے ندامت تھا فرازؔ
دل سے بیباک شناور کو ڈبویا کیسا

واپسی

اُس نے کہا

سُن

عہد نبھانے کی خاطر مت آنا

عہد نبھانے والے اکثر

مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں

تم جاؤ

اور دریا دریا پیاس بجھاؤ

جن آنکھوں میں ڈوبو

جس دِل میں بھی اُترو

میری طلب آواز نہ دے گی

لیکن جب میری چاہت

اور میری خواہش کی لَو

اتنی تیز اور اِتنی

اُونچی ہو جائے

جب دِل رو دے

تب لَوٹ آنا

○
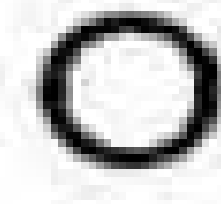
اے خُدا آج اُسے سَب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

سانحے وہ تھے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
زخم یہ ہیں تو مرے دِل کو بھی پتّھر کر دے

صرف آنسو ہی اگر دستِ کرم دیتا ہے
میری اُجڑی ہُوئی آنکھوں کو سمندر کر دے

مجھ کو ساقی سے گلہ ہو نہ تنگ بخشی کا
زہر بھی دے تو مرے جام کو بھر بھر کر دے

شوق اندیشوں سے پاگل ہُوا جاتا ہے فرازؔ
کاش یہ خانہ خرابی مجھے بے در کر دے

○
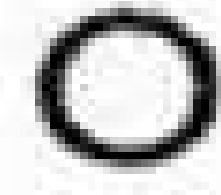
اپنی طرح ہی کوئی پریشانیوں میں تھا
اے شہرِ درد جو بھی ترے بانیوں میں تھا

میں بھی پھرا ہوں کشتیِ عمرِ رواں لیے
وینس کا سارا شہر کھلے پانیوں میں تھا

کیا میرے زخم دیکھتی دنیا کہ ہر کوئی
مصروف اپنی چاک گریبانیوں میں تھا

اے دل ترے سکوں سے تری رونقیں گئیں
دریا کا سارا حسن ہی طغیانیوں میں تھا

صیّاد و گلفروش ہی خوش بخت ہیں فرازؔ
جو بھی چمن پرست تھا زندانیوں میں تھا

○
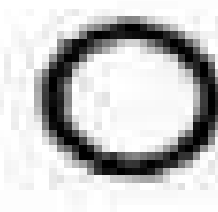
اُس منظرِ سادہ میں کئی جال بندھے تھے
جب اُس کا گریبان کھُلا بال بندھے تھے

اے زُود فراموش کہاں تو ہے کہ تجھ سے
میرے تو شب و روز و مہ و سال بندھے تھے

وہ رشکِ غزالاں تھا مگر دام میں اس کے
ہم جیسے کئی صیدِ زبوں حال بندھے تھے

دیکھے کوئی ناصح کی جو حالت ہے کہ ہم تو
اس گیسوئے پیچاں میں بہرحال بندھے تھے

صیّاد کو پھر بھی مری پرواز کا ڈر تھا
میں گرچہ قفس میں تھا پر و بال بندھے تھے

یُوں دل تہ و بالا کبھی ہوتے نہیں دیکھے
اِک شخص کے پاؤں سے تو بھونچال بندھے تھے

وقت آیا تو میں مقتلِ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے

○
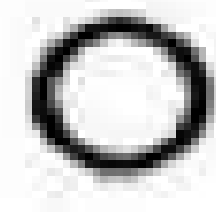
یوں تو کہنے کو بہت لوگ شناسا میرے
کہاں لے جاؤں تجھے اے دلِ تنہا میرے

وہی محدود سا حلقہ ہے شناسائی کا
یہی احباب مرے ہیں یہی اعدا میرے

میں تہہِ کاسہ و لَب تشنہ رہوں گا کب تک
تیرے ہوتے ہوئے اے صاحبِ دریا میرے

مجھ کو اس ابرِ بہاری سے ہے کب کی نسبت
پر مقدّر میں وہی پیاس ہے صحرا میرے

دیدہ و دِل تو ترے ساتھ ہیں اے جانِ فرازؔ
اپنے ہمراہ مگر خواب نہ لے جا میرے

کاریز[1]

فضیلہ!
مجھے یاد کب تھیں
وہ باتیں جو میں نے کہی تھیں
مگر آج جب ٹیپ کے ایک فیتے سے
تیری اُداس اور مہجور آواز کی آنچ آئی
(جو تیری پشیمانیوں اور حرماں نصیبی کی غماز ہے)
تو مجھ کو وہ شب
اور اس شب کی سب گفتگو یاد آئی
مجھے اپنے لہجے کی تلخی کا دُکھ ہے
مگر میری مشکل کہ موضوع ایسا تھا
"کرب اپنے مجبور لوگوں کا"
"اندوہ اپنی زمیں کا"
تجھے کیا خبر

---

[1] بلوچستان کے زمین دوز چشمے

آنے والے دنوں کے تصور سے
میں کانپ اُٹھتا ہوں
سوچیں جو تلوار کی کاٹ رکھتی ہیں
اب یہ ہمارا مقدر رہیں گی
میں شیشے کی دیوار سے
سامنے کے پہاڑوں کو جب دیکھتا ہوں
تو لگتا ہے جیسے
ترے قریۂ بے اماں کے
کبیدہ جبیں کوہساروں کے چہرے
جو بارُود کے بادلوں سے اَٹے
خونِ خلقت سے تر
تجھ سے مایوس ہو کر
نئی سرحدوں کی طرف دیکھتے ہیں
فضیلہ!
اگر میری آنکھوں پہ شک ہے
تو پھر اِن ہواؤں کے لہجے کو پہچان
اور سُن
کہ ان کا کہا معتبر ہے
ہواؤں نے تم سے کہا تھا

کہ اِن بے نوا کوہساروں کی بے آسرا چوٹیوں پر

سدا برف تھی

اور ہمیشہ رہے گی

مگر جب بھی ندّی کوئی

کلۂ کوہ سے دامنِ کوہ کی

آرزو میں روانہ ہوئی تو

اسے خشک کھیتوں نے

بنجر زمینوں نے

محروم سینوں نے

کِن حسرتوں سے پکارا

فضیلہ!

تجھے کیا خبر

تو کہ گھائل ہواؤں کے

غمناک لہجوں کی پروردہ

مہجور ندی تھی

جو اک مقدس سفر پر چلی تھی

مگر جس نے منزل بدل دی

نہانے کے تالاب

اگرچہ بہت خوشنما ہیں

مگر تیرے مسکن نہیں تھے
وہ تُو جس کو کاریز بننا تھا
کاریز بنتی
تو بہتر نہیں تھا؟

ناتمام مسافتیں

دیکھو ذرا ادھر کہ چلے تھے جہاں سے ہم
کچھ پھول کچھ چراغ ابھی واہموں میں ہیں
بے اعتمادیوں کا دھواں بھی سہی مگر
کچھ گیت بھی تو شہر کی خاموشیوں میں ہیں
اِک سوگوار شامِ خزاں بھی سہی مگر
بکھرے ہُوئے گلاب ابھی راستوں میں ہیں

جب ہم ہوئے تھے شوق کی راہوں پہ گامزن
رہزن نہیں ملے تھے کہ مقتل نہ آئے تھے
صحرائے غَم سے تابہ ہوائے گُلِ مُراد
کن کن قیامتوں نے نہ فِتنے اٹھائے تھے
قول و قرار و وعدہ و پیماں سے بے خبر
یہ خواب یہ گلاب ہمیں نے سجائے تھے

اک پل رکو یہیں سے بدلتے ہیں راستے
ٹھہرو ذرا کہ موڑ جدائی کا آ گیا
اب سامنے کی اور ہواؤں کا شہر ہے
اب تک تو اس طرف جو گیا سو چلا گیا
شمعیں تو کیا یہاں دل و دیدہ بھی بُجھ گئے
یہ دشت کتنے راہ نوردوں کو کھا گیا

ٹھہرو ذرا کہ مرگِ تمنّا سے پیشتر
اپنی رفاقتوں کو پلٹ کر بھی دیکھ لیں
گزری مسافتوں پہ بھی ڈالیں ذرا نظر
قربت کی ساعتوں کا مقدر بھی دیکھ لیں
شاید کہ مِل سکیں نہ نئے موسموں میں ہم
جاتی رُتوں کے آخری منظر بھی دیکھ لیں

○

اے تو کہ روز و شب کو مہ و آفتاب دے
برسوں کی جاگتی ہُوئی آنکھوں کو خواب دے

میں وہ کہ نقش گر ترے ارض و سما کا ہُوں
تو وہ کہ مجھ کو دونوں جہاں کے عذاب دے

میں نے تو تن بَدن کا لہُو نذر کر دِیا
اے شہر یار تُو بھی تو اپنا حساب دے

وہ سنگ ہو کہ پھُول، ودیعت ہے یار کی
لازم نہیں گلاب کے بدلے گلاب دے

اہلِ ہنر کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے
اَب کون پتھروں کو نگینوں کی آب دے

اب جو بھی حال کوئے ستمگر میں ہو فرازؔ
اب جو بھی بَددعا دلِ خانہ خراب دے

○
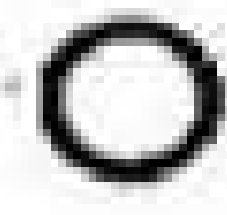
نہ جانے ایسی بھی کیا بات تھی سخن میں مرے
ہزار تیر ترازو رہے بدن میں مرے

یہ کیسا دَرد کا سیلاب جی سے گزرا ہے
یہ کس نے آگ لگا دی ہے پیرہن میں مرے

ترے وصال کے نشّے ترے فراق کے دُکھ
تمام ذائقے محفوظ ہیں بدن میں مرے

دلِ فریب زدہ پھر نئے فریب میں ہے
کہ تذکرے ہیں بہت تیری انجمن میں مرے

نہیں کہ زیست ہی اپنی قبائے مفلس تھی
فرازؔ سینکڑوں پیوند ہیں کفن میں مرے

○
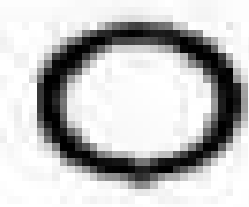
چلو عذاب سہیں دوستی کے یُونہی سہی
کہ وہ کسی کا ہوا ہم کسی کے یونہی سہی

ہمی ہدف، ہمی بسمل، ہمی پہ طعنہ زنی
ستم اُسی کے، گلے بھی اُسی کے یونہی سہی

جگر فگار کرو دِل کو تار تار کرو
یہی صلے ہیں اگر آگہی کے یونہی سہی

میں کب تلک ترے سفاک سچ کا زہر پیوں
وفا کے بول سُنا جھوٹ ہی کے یونہی سہی

مگر وہ لوگ تھے شاداب موسموں کے فرازؔ
مگر وہ خواب تھے نتھیا گلی کے یونہی سہی

اِتنے چُپ کیوں ہو!

اتنے چُپ کیوں ہو رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
دَرد سے چُور ہُوئے ہو کہ قرار آیا ہے
بھر گیا ہجر کا ہر زخم کہ جی ہار چلے
بجھ گیا شوق کہ پیغامِ نگار آیا ہے
نامرادی کی تھکن ہے کہ خمارِ شبِ وصل
جاں سُلگتی ہے کہ چہروں پہ نکھار آیا ہے

کتنی اُجڑی ہُوئی رُت ہے کہ سکوں ہے نہ جنوں
اتنی بے فیض ہُوئی بادِ بہاری کیسے
نہ کہیں نوحۂ جاں ہے نہ کہیں نغمۂ دِل
کچھ تو بولو کہ شبِ درد گزاری کیسے
سَر بہ زانو ہو تو کیوں چاک گریباں والو
بازیٔ راہِ طلب جیت کے ہاری کیسے

○

خود کو ترے معیار سے گھٹ کر نہیں دیکھا
جو چھوڑ گیا اس کو پلٹ کر نہیں دیکھا

میری طرح تُو نے شبِ ہجراں نہیں کاٹی
میری طرح اس تیغ پہ کٹ کر نہیں دیکھا

تو دشنۂ نفرت ہی کو لہراتا رہا ہے
تو نے کبھی دُشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا

تھے کوچۂ جاناں سے پَرے بھی کئی منظر
دِل نے کبھی اس راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

اب یاد نہیں مجھ کو فرازؔ اپنا بھی پیکر
جس روز سے بکھرا ہوں سمٹ کر نہیں دیکھا

○

ہر کوئی تیری داستاں انجمن انجمن کہے
اَب کے ترے فراق میں ہم نے عجب سخن کہے

دونوں کو زعمِ عشق ہے، لیکن اس اختلاف سے
میں اُسے جسم و جاں کہوں تو اُسے پیرہن کہے

وقت پہ اپنے آپ کو سَب نے گلے لگا لیا
یُوں تو نگارِ شہر کو ہر کوئی جانِ مَن کہے

ضبط کے موسموں میں بھی دونوں شریکِ حال تھے
فصلِ سپردگی ہے اب کچھ تو ترا بدن کہے

خلعتِ شہر یار کو سب نے قبول کر لیا
میں بھی اُسے کفن کہوں تو بھی اسے کفن کہے

گفتۂ یار پر فرازؔ کس طرح حرف گیر ہُوں
ہم نے بھی اُس سے بارہا جھوٹ ضرورتاً کہے

اے مرے یار کی قاتل

(مصطفٰے زیدی کی موت پر)

اے مرے یار کی قاتل تجھے دیکھوں تو کہوں
کس طرح دستِ حنائی سے جھلکتا ہے لہو
کس طرح زہر عطا کرتے ہیں بلّور سے ہاتھ
کس طرح روح کو ڈستی ہے بدن کی خوشبو

مونا لیزاؤں سے معصوم و دِل آرا چہرے
قلو پطراؤں سے جسموں پہ سجا رکھے ہیں
جاں گسل زہر نگینوں میں چھپا رکھے ہیں
جس کو چاہا اسے مَرنے کا جنوں بخش دِیا
بوسۂ مرگ عطا کر کے سکوں بخش دیا

یوں تو عشّاق کی منزل ہے یہی دشتِ فنا
"قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا"

کہاں سے لائیں

نہ یُوں کہ آغازِ فصلِ گل میں
خموشیاں کوئی گیت گائیں

نہ یُوں کہ مہجور جنگلوں میں
اُداس جگنو دیے جلائیں

نہ یُوں کہ خندہ دلی سے رو دیں
نہ یوں کہ رو رو کے مُسکرائیں

نہ کوئی منظر کہ آشنا ہو
تو ہمدمی کا فریب کھائیں

نہ کوئی اپنا جو غیر سا ہو
کہ جس کو تیرے سخن سنائیں

یہ زندگی کِس طرح کٹے گی
وہ یادِ جاناں کہاں سے لائیں

یہ شامِ دل کس طرح کٹے گی
کوئی خلش اب کہاں سے لائیں

○
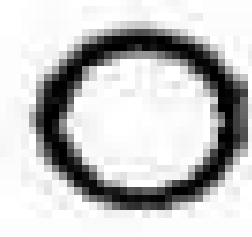
بلا سے ہم حصارِ سنگ پہنیں
یہ سناٹے مگر آہنگ پہنیں

یہ کیا کہتے ہو اے بے چہرہ لوگو
کہ آئینے لباسِ زنگ پہنیں

بہار آنے تلک پیڑوں کی صورت
چلو ہم بھی خزاں کے رنگ پہنیں

ردائے زخم ہو یا چادرِ گل
جو پہنیں ہم سبھی کے سنگ پہنیں

فرازؔ اس شہر میں طوق و سلاسل
سبھی یارانِ خوش آہنگ پہنیں

○

یہ وقت بھی آنا تھا ہمی غم طلبوں پر
اَب تجھ سے بچھڑنے کی دُعائیں ہیں لبوں پر

چرچے تری معصوم نگاہی کے بہت تھے
اِلزام تو آنا تھا ہمی بے اَدبوں پر

پیراہنِ گل زینتِ شمشاد قداں ہے
یہ خلعتِ زیبا نہ سجا کم نسبوں پر

میں بندۂ گمنام، تہی کاسہ و بے دَر
الطاف ترے خواجہ و سلطاں لقبوں پر

کب اِتنے تسلسل سے ترا نام لیا تھا
شاید کہ مِری جان، مری جاں ہے لبوں پر

دیوارِ گریہ

وہ کیسا شعبدہ گر تھا
جو مصنوعی ستاروں
اور نقلی سورجوں کی
اِک جھلک دکھلا کے
میرے سادہ دِل لوگوں
کی آنکھوں کے دیے
ہونٹوں کے جگنو
لے گیا
اور اب یہ عالم ہے
کہ میرے شہر کا
ہر اِک مکاں
اک غار کی مانند
محرومِ نوا ہے
اور ہنستا بولتا ہر شخص
اِک دیوارِ گریہ ہے

○

دشتِ نامرادی میں ساتھ کون تھا کِس کے
مرثیے سناتی ہے شہر کی ہوا کِس کے

ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سُناتا ہے یارِ بے وفا کِس کے

عہدِ ہجر میں یارو سَب کے حوصلے معلُوم
دِل پہ ہاتھ تھا کس کا لب پہ تھی دُعا کِس کے

کل صلیب گر جو تھا کل صلیب پر جو تھا
آج نام لیوا ہیں لوگ جابجا کِس کے

اَب فرازؔ تجھ پر بھی اعتبار کیا کیجے
اِنتظار تھا کس کا ساتھ چل پڑا کِس کے

○
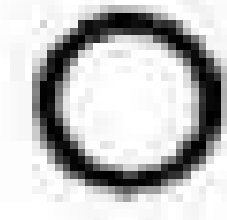
چراغ شامِ وَفا میں جلے نہ تھے ایسے
کہ دِل زدوں میں کبھی من چلے نہ تھے ایسے

ہجوم ایسا کہ مقتل میں جا نہیں ملتی
یہ جاں نثار سروں سے ٹلے نہ تھے ایسے

جو اہلِ دل تھے وہ جاں سے گزر گئے کہ نہیں
فراقِ یار ترے مرحلے نہ تھے ایسے

جہاں کی وضع کو دیکھو تو ہم سے پیار کرو
چلو یہ مان لیا ہم بھلے نہ تھے ایسے

فراز اَب کے عجب آگ سی وجود میں ہے
کہ دل میں زخم تو تھے آبلے نہ تھے ایسے

○
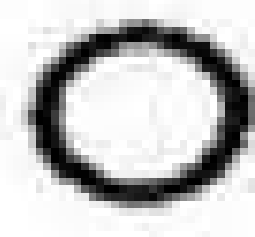
مرا ہی رنگ پریدہ ہر اک نظر میں رہا
وگرنہ درد کا موسم تو شہر بھر میں رہا

کِسی کے گھر سے نکلتے ہی مِل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

بہت سے لوگ تھے گھل مل کے سب سے باتیں کیں
وہ جس کو میں نے نہ دیکھا مری نظر میں رہا

کچھ اس طرح سے گزاری ہے زِندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

وداعِ یار کا منظر فرازؔ یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سُورج مری نظر میں رہا

میں زندہ ہُوں

میں ابھی زندہ ہُوں
تم نے سنگباری کی
مرے پیکر کو دیواروں کے قالب میں چنا
ناگوں سے ڈسوایا
صلیبوں پر چڑھایا
زہر پلوایا
جلایا
پھر بھی میں سچ کی طرح پائندہ ہوں
میں زندہ ہُوں
میرا چہرہ، میری آنکھیں، میرے بازو
میرے لب
زندہ ہیں سب
میں شہابِ شب
ہزاروں بار ٹوٹا

اور بکھرا

پھر بھی میں رخشندہ ہُوں

میری طاقت میرے بالوں میں

نہ میرے ناخنوں میں تھی نہاں

میں حصاروں میں چُھپا تھا

اور نہ تیغوں کی پناہوں میں چلا

میری طاقت میری قوت

حرف تھا

سلسبیلِ حرف سے میں نے پیا

آبِ بقا

حرف جو سچائیوں کی ابتدا اور انتہا

وجدان کی شمعِ نوا

سَب کا خدا

تم نے کالے سورجوں کو

اپنے ہاتھوں پر دھرا

مصنوعی مہتابوں کو

ماتھوں پر چُنا

کافور کی شمعوں سے طاقِ ذات کو

روشن کیا

تم نے چاہا تھا

کہ خال و خد تمہارے بھی

کہیں چمکیں

تمہیں بھی لوگ پہچانیں

تمہیں بھی دیوتا مانیں

مگر تم شکل سے عاری تھے

صُورت گر بھی کیا کرتے

تمہارے جسم بے توقیر و بے جاں

اور تمہارے تاج طاقوں پر دھرے ہیں

اور تمہارے پیرہن

تابُوت کا استر بنے

خاکستری ڈھانچوں کو ڈھانپے

اَب عجائب گھر کے تہ خانوں میں سڑتے ہیں

تمہارے استخواں نو واردوں کی چاپ سے

یوں کانپ اُٹھتے ہیں

کہ جیسے صبحِ محشر کا بلاوا ہو

سُنو اے کجکلا ہو

اے خداوند و سنو

اب تم فقط ماضی ہو

میں آئندہ ہُوں

میں نہ اپنے دوش سے نادم نہ اپنے حال سے شرمندہ ہُوں

میں زندہ ہوں

تابندہ ہُوں

رقصندہ ہوں

پائندہ ہُوں

O
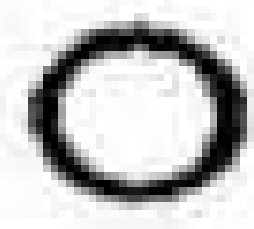
جن کے نغموں کو ہیں پیکان عزیز
اُن پرندوں کو کہاں جان عزیز

وہ مری چاک قبائیں دیکھیں
ہے جنہیں خلعتِ سلطان عزیز

اب تو ناموسِ جنوں کے بدلے
وحشیوں کو ہیں گریبان عزیز

اُن کی دہلیز پہ سائل ہیں جنہیں
درد مندوں سے ہیں دربان عزیز

فیصلہ تیرفگن چاہتا ہے
جان پیاری ہے کہ پیکان عزیز

حرفِ ناصح سے زیادہ ہم کو
اَبروئے یار کے فرمان عزیز

خوں بہا دو کہ نہ دو جان ہے نذر
اب ہمیں نفع نہ نقصان عزیز

کشتیٔ نوح کو مژدہ ہو کہ اب
شہر والوں کو ہے طوفان عزیز

یوں تو ہیں اور صحیفے بھی فرازؔ
ہم کو غالب کا ہے دیوان عزیز

○
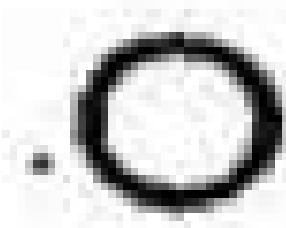
نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلّق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کارواں نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہم سفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تُو ہو تو سو خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں
کاش اب کے مری آنکھوں میں مرادل نہ رہے

لوگ کس طرح سے آئینہ صفت جیتے ہیں
میں تو مر جاؤں اگر کوئی مقابل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فرازؔ
کہ وہ اٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

○

اک خواب زندگی کے سبھی خواب لے گیا
اس خواب کو بھی نیند کا سیلاب آ گیا

آیا تو ساتھ ہجر کی راتیں لیے ہُوئے
رخصت ہُوا تو انجم و مہتاب لے گیا

رہرو بھی خود، رفیق بھی خود، راہزن بھی خود
اک میرِ قافلہ سبھی القاب لے گیا

کیا پیرِ میکدہ ہے کہ مسند کی حرص میں
میخانۂ وفا کے سب آداب لے گیا

دیکھا یہ سانحہ بھی کہ کشتی کو ناخدا
جب ڈوبنے لگا تو تہہِ آب لے گیا

اے مستِ خوابِ ناز قیامت گزر گئی
''مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا''

سب اپنے اپنے خواب لیے اس کے در پہ تھے
میں بھی فرازؔ دیدۂ بے خواب لے گیا

○
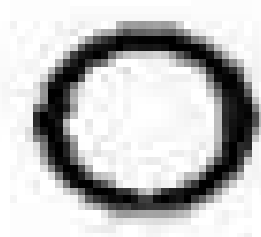
یہ شہر سحر زدہ ہے صدا کسی کی نہیں
یہاں خود اپنے لیے بھی دعا کسی کی نہیں

خزاں میں چاک گریباں تھا میں، بہار میں تُو
مگر یہ فصلِ ستم آشنا کسی کی نہیں

سب اپنے اپنے فسانے سناتے جاتے ہیں
نگاہِ یار مگر ہم نوا کسی کی نہیں

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بُجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

فراؔز اپنی جگر کاویوں پہ ناز نہ کر
کہ یہ متاعِ ہنر بھی سدا کسی کی نہیں

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں

فقیرانہ روش رکھتے تھے

لیکن اس قدر نادار بھی کب تھے

کہ اپنے خواب بیچیں

ہم اپنے زخم آنکھوں میں لیے پھرتے تھے

لیکن رُوکشِ بازار ہم کب تھے

ہمارے ہاتھ خالی تھے

مگر ایسا نہیں پھر بھی

کہ ہم اپنی دریدہ دامنی

الفاظ کے جگنو

لیے گلیوں میں آوازہ لگاتے

"خواب لے لو خواب"

لوگو

اتنے کم پندار ہم کب تھے

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں

کہ جن کو دیکھنے کی آرزو میں

ہم نے آنکھیں تک گنوا دی تھیں

کہ جن کی عاشقی میں

اور ہوا خواہی میں

ہر ترغیب کی شمعیں بجھا دی تھیں

چلو ہم بے نوا

محرومِ سقف و بام و در ٹھہرے

چلو ہم بد مقدّر بے ہنر ٹھہرے

پر اپنے آسماں کی داستانیں

اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں

خریدارو!

تم اپنے کاغذی انبار لائے ہو

ہوس کی منڈیوں سے درہم و دینار لائے ہو

تم ایسے دام تو ہر بار لائے ہو

مگر تم پر ہم اپنے حرف کے طاؤس

اپنے خون کے سرخاب کیوں بیچیں

ہمارے خواب بے وقعت سہی

تعبیر سے عاری سہی

پر دِل زدوں کے خواب ہی تو ہیں

نہ یہ خوابِ زلیخا ہیں
کہ اپنی خواہشوں کے یوسفوں پر تہمتیں دھرتے
نہ یہ خوابِ عزیزِ مصر ہیں
تعبیر جن کی اس کے زندانی بیاں کرتے
نہ یہ اُن آمروں کے خواب
جو بے آسرا خلقِ خُدا کو دار پر لائیں
نہ یہ غارت گروں کے خواب
جو اوروں کے خوابوں کو تہہِ شمشیر کر جائیں
ہمارے خواب تو اہلِ صفا کے خواب ہیں
حرف و نوا کے خواب ہیں
مہجور دروازوں کے خواب
محصور آوازوں کے خواب
اور ہم یہ دولتِ نایاب کیوں بیچیں
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں؟

○

زندگی کی اَب نئی رسمیں بنا دی جائیں گی
جسم ڈھ جائیں گے دیواریں اٹھا دی جائیں گی

اب مکانوں میں مکیں ہوں گے نہ آوازوں کے پھول
صرف دیواروں پہ تصویریں لگا دی جائیں گی

ایک لمحے کے لیے صدیوں کا خوں ہو جائے گا
ایک خواہش کے لیے عمریں گنوا دی جائیں گی

لفظ تڑپیں گے مگر اذنِ سخن چھن جائے گا
روشنی ہو گی مگر آنکھیں بجھا دی جائیں گی

خود کو ڈھونڈو گے بسانِ نقشِ پائے رفتگاں
بستیوں کی بستیاں صحرا بنا دی جائیں گی

کل کا سُورج حشر در آغوش نکلے گا فراؔز
چاند جیسی صورتیں ایندھن بنا دی جائیں گی

لَبِ گویا

اک شاعرِ درویش و قدح خوار خدا مَست
میں کون، جو لکھوں، تری عظمت کے قصیدے

جبریل کے پر ہوں تو وہاں تک نہ پہنچ پاؤں
آواز جہاں سے ترا سازِ ابدی دے

تو وہ ہے کہ الہام ترے حرف کو ترسے
میں وہ کہ مجھے طعن مری بے ہُنری دے

تو جبرِ شہی میں بھی علمدارِ جُنوں تھا
میں نالہ بہ دل ہوں کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

دہلیز نشیں ہُوں میں ترے کاخِ سخن کا
میں کون، مگر تو شرفِ ہم سخنی دے

دے اِذن کہ میں تجھ کو بتاؤں کہ ترے بعد
جو حال ہُوا ہے ترے خوابوں کے چمن کا

اغیار کے ہر دار کو ہم جھیل گئے تھے
ہر چند کہ چرچا تھا بہت دار ورسن کا

تو برشِ شمشیرِ حریفاں سے تھا بسمل
ہم کو ہے گلہ دشنۂ اربابِ وطن کا

"ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"
شیوہ ہے وہی گردشِ افلاکِ کہن کا

ناوک ہی رہا قسمتِ ہر دیدۂ بینا
نیزہ ہی مقدّر رہا بے باک دہن کا

اے ہاتفِ اسرارِ بشر سُن کے ترے بعد
کس طرح ترے درس کی توہین ہُوئی ہے

معنوں سے تہی کر کے ترے حرفِ خودی کو
شعروں سے فقط وعظ کی تزئین ہوئی ہے

تھی فقر و توکل کی مغنّی تری ہستی
یاں کِذب و تصوّف ہی کی تلقین ہوئی ہے

جو مشقِ ستم مشغلۂ اہلِ جفا تھا
وہ رسمِ ستم شہر کا آئین ہُوئی ہے

دربار سے وہ رشتہ رہا مفتیِ دیں کا
منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہُوئی ہے

ہیں اَب بھی وہی بندۂ مزدور کے اوقات
گو دولتِ اربابِ امارت ہوئی دہ چند

ہے اوج پہ سرمایہ پرستی کا نصیبہ
دریوزہ گرِ نانِ شبینہ ہے ہنر مند

پیغامِ مساوات کہ دُنیا کے لیے تھا
واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند

مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہیں لیکن
منعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند

شاہد ہیں منگورہ کی چٹانیں کہ ہے بڑھ کر
خونِ رگِ انساں سے زمرد کا گلوبند

یہ مہتر و نواب و خوانین و موالی
ہر جا پہ قدامت کے صنم اب بھی وہی ہیں

ہے رزقِ زمیں آج بھی دہقاں کا پسینہ
اندازِ قدح خوارئ جم اب بھی وہی ہیں

اِک تو ہی نہ تھا جس پہ لگی کفر کی تہمت
ہم جیسے شہیدانِ ستم اب بھی وہی ہیں

اب بھی ہیں وہی اہلِ ہوس صاحبِ محفل
ہم دل زدگانِ شبِ غم اب بھی وہی ہیں

یہ فتویٰ فروش و تہی آغوش و عبا پوش
پیرانِ و فقیہانِ حرم اب بھی وہی ہیں

جو حرفِ جنوں تو نے سکھایا وہ کہوں گا
اے حق کی علامت، مجھے توفیقِ نوا دے

دے بازوئے فرہاد کو وہ تابِ جسارت
جو طرۂ دستارِ رقیباں کو جھکا دے

اب قافلۂ شوق نئی دھن سے رواں ہے
اب پیشِ نظر ہے، نئی منزل نئے جادے

اب کجکلہی سر بگریباں نظر آئے
اب چاک ہوں ذرّوں سے ستاروں کے لبادے

ہر عہد کا نخچیر رہا ہے لبِ گویا
یہ عہد بھی منصور کو سولی پہ چڑھا دے

بیروت ۔ ۱

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے، کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں

جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں

یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغِ قاتلاں سے
کٹی ہوئی فصل کی طرح
جا بجا پڑے ہیں
یہ کون ماں ہے
جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے

یہ کون بابا ہے
جس کی آواز شورِ محشر میں دَب گئی ہے
یہ کون معصوم ہے
کہ جن کو
سیاہ آندھی دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کوئی جانتا نہیں
انہیں کوئی جاننا نہ چاہے
یہ کس قبیلے کے سربکف جانثار ہیں
جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے
کوئی بھی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحاں ہے
کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے
نہ کوئی بچہ نہ کوئی بابا نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چُپ
بادشاہ چُپ ہیں
حرم کے سب پاسبان
عالم پناہ چُپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لا الہٰ چُپ ہیں

بیروت۔۲

میرے بچّوں کے جسموں پر
زخموں کے پیراہن ہیں
ممتاؤں کی خالی گودیاں
بن کتبوں کے مدفن ہیں

جتنے بھی ساونت جواں تھے
پیہم کٹتے جاتے ہیں
میرے باغ کے جتنے پھول تھے
پل پل گھٹتے جاتے ہیں

لہو لہان ہیں گلیاں کوچے
آنگن خون سے جل تھل ہیں
سب دہلیزوں پر لاشیں ہیں
سب چوراہے مقتل ہیں

کچھ خیمے کچھ زندہ سائے
اب میدان میں باقی ہیں
چند علَم کچھ گیت ابھی تک
اس طوفان میں باقی ہیں

تیل کے چشموں کے سوداگر
اَن داتا خوش بیٹھے ہیں
محل سرا کی حَرم سرا میں
خواجہ سَرا خوش بیٹھے ہیں

آدھی رات میں اذان

یہ کِس کے لہو کی جھالریں ہیں
پھر کس نے یہ کربلا سنوارا

یہ کون ہیں جن کے آسماں پر
سُورج ہے نہ چاند ہے نہ تارا

جنگل میں لگی ہو آگ جیسے
یوں شہر بھڑک رہا ہے سارا

O
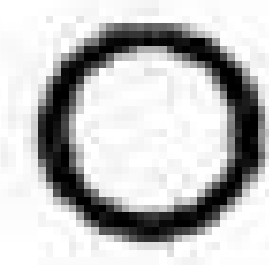
اماں مانگو نہ اُن سے جاں فگاراں ہم نہ کہتے تھے
غنیمِ شہر ہیں چابک سواراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں نے تو فقط ملبوس چھینے تھے درختوں سے
صلیبیں بھی تراشے گی بہاراں ہم نہ کہتے تھے

ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہرِ نگاراں ہم نہ کہتے تھے

جہاں میلہ لگا ہے ناصحوں کا، غمگساروں کا
وہی ہے کوچۂ بے اعتباراں ہم نہ کہتے تھے

بنے گی اس طرح تصویرِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

فرازؔ اہلِ ریا نے شہر دشمن ہم کو ٹھہرایا
بس اس کارن کہ مدحِ شہر یاراں ہم نہ کہتے تھے

خون فروش

اے خدا ہسپتالوں میں بھی
اب مرے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے
کسی کو بھی میرے لہو کی ضرورت نہیں ہے

میں اپنے بدن میں
(کئی خون کی بوتلیں بیچ کر بھی)
ابھی تک لہو کے کٹورے لیے
صبحدم
اس توقع پہ گھر سے نکلتا ہوں
شاید......
مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہوں
اُسی گھر میں
جس میں مرے خون کے لوتھڑے
جرعۂ شیر اور پارۂ نان کی آرزو میں

مرا راستہ دیکھتے ہیں

میں ہر روز

ہر وارڈ کو

ملتجی جسم سے دیکھتا ہوں

مگر ڈاکٹر مجھ سے کہتے ہیں

مردُود

اب تیرے خوناب میں

زندگی کی حرارت نہیں ہے

خُدایا

میں کیسے بتاؤں انہیں

خوں فروشی ضرورت ہے میری

تجارت نہیں ہے

○

سبھی نہیں تھے زمانے سے ہارنے والے
پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے

ہمیں شناخت تو کر اے نگارِ صُبحِ وصال
ہمی تو ہیں شبِ ہجراں گزارنے والے

جو ہم نہیں تھے تو وہ کون تھے خداوندا
فلک کا بوجھ زمیں پر اتارنے والے

تو اتنی تنگ نگاہی سے اپنی چال نہ چل
ہم اہلِ دل ہیں کھُلے دِل سے ہارنے والے

یہ بے گلیم کہ جن کی سپاہ ہے نہ کلاہ
یہی تو لوگ ہیں میدان مارنے والے

○

دِل کِس کے لیے کراہتا ہے
وہ نار تو اَب بیاہتا ہے

بدنام ہمی ہُوئے ہیں وَرنہ
ہر کوئی اسے سراہتا ہے

ہم بھی تو قرار و قول بھُولے
کون اپنا کہا نباہتا ہے

اب یاد نہ آ کہ کچھ دنوں سے
دل اور کسی کو چاہتا ہے

دِل ہے کہ فؔراز آخرِ شب
ہمسایہ کوئی کراہتا ہے

○

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
بادل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

اب دوش پہ سر نہیں تو جیسے
اک بوجھ سا دل سے ہٹ گیا ہے

جس سیل کا رُخ مری طرف تھا
اب تیری طرف پلٹ گیا ہے

یہ خلوتِ جاں میں کون آیا
ہر چیز الٹ پلٹ گیا ہے

کیا مالِ غنیم تھا مرا شہر
کیوں لشکریوں میں بٹ گیا ہے

اب دِل میں فرازؔ کون آئے
دنیا سے یہ شہر کٹ گیا ہے

○

دکھ کی دو اِک برساتوں سے کب یہ دِل پایاب بھرا
وہ تو کوئی دریا لے آیا دریا بھی سیلاب بھرا

سوچا تھا غم کو غم کاٹے زہر کا زہر بنے تریاق
اب دل آبلہ آبلہ ہے اور شیشۂ جاں زہراب بھرا

تم آ جاتے تو اس رُت کی عُمر بھی لمبی ہو جاتی
ابھی تھا دیواروں پر سبزہ ابھی تھا صحن گلاب بھرا

جانے ہجر کی رات کہ وصل کی رات گزار کے آئے ہو
آنکھیں نیندوں نیند بھری ہیں جسم ہے خوابوں خواب بھرا

اب آنکھیں اشکوں سے تہی ہیں اور دل لہو سے خالی ہے
لمحہ لمحہ ٹپکا ہے تو عُمر کا یہ تالاب بھرا

برسوں گزرے ہم نے فرازؔ کو تنہا تنہا دیکھا تھا
اب بھی وہی تنہائی ہے گو شہر تو ہے احباب بھرا

نذرِ میر

بہت سیرِ گُل اے صبا کر چلے
یہاں تک کہ دل کو قبا کر چلے

وہ تیری گلی تھی کہ کوئے عدو
جدھر بھی گئے سَر اُٹھا کر چلے

جو احوال اپنا ہُوا سو ہُوا
عبث دوستوں کو خفا کر چلے

رہے دائم آباد محفل تری
ہمارا تھا کیا ہم تو آ کر چلے

نوا سنج ہے اب قفس کا قفس
یہاں تک تو ہم بے نوا کر چلے

○

کون تھے وہ جن کا شیوہ تھا جھوٹے باب نہ لکھنا
اَوروں کے دُکھ لکھتے رہنا اپنے عذاب نہ لکھنا

اُس نے لکھا ہے ایک نہ اِک دن یہ مکتوب چھپیں گے
اس لیے نیت جیسی بھی ہو حرف خراب نہ لکھنا

جس کو آنکھ نے دَریا جانا دِل نے سمندر سمجھا
پیاس کے مارے مر جاؤ پر اُس کو سراب نہ لکھنا

ایسی کٹھور طبیعت والے کبھی کبھی مِلتے ہیں
ہم نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں اس نے جواب نہ لکھنا

دِل کی بیاض پہ یاروں دلداروں کے نام تو لکھو
لیکن کیا کھویا کیا پایا اس کا حساب نہ لکھنا

ہُوا سو ہُوا

بھُول جائیں تو آج بہتر ہے
سِلسلے قرب کے جدائی کے
بجُھ چکیں خواہشوں کی قندیلیں
لُٹ چکے شہر آشنائی کے

رائیگاں ساعتوں سے کیا لینا
زخم ہوں پھُول ہوں ستارے ہوں
موسموں کا حساب کیا رکھنا
جس نے جیسے بھی دن گزارے ہوں

زندگی سے شکائتیں کیسی
اب نہیں ہیں اگر گلے تھے کبھی
بھول جائیں کہ جو ہُوا سو ہُوا
بھول جائیں کہ ہم ملے تھے کبھی

اکثر اوقات چاہنے پر بھی
فاصلوں میں کمی نہیں ہوتی
بعض اوقات جانے والوں کی
واپسی سے خوشی نہیں ہوتی

○

جہاں کے شور سے گھبرا گئے کیا؟
تم اپنے گھر کو واپس آ گئے کیا؟

یہاں کچھ آشنا سی بستیاں تھیں
جزیروں کو سمندر کھا گئے کیا؟

نہ تھی اتنی کڑی تازہ مسافت
پرانے ہم سفر یاد آ گئے کیا؟

مری گردن میں باہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اُکتا گئے کیا؟

نہیں آیا مرا جانِ بہاراں
درختوں پر شگوفے آ گئے کیا؟

جہاں میلہ لگا ہے قاتلوں کا
فرازؔ اس شہر میں تنہا گئے کیا؟

○

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ

یہ حرف و لفظ ہیں دُنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

خیال ان کا بھی آیا کبھی تجھے جاناں
جو تجھ سے دُور بہت دُور جی رہے تھے الگ

ہمی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو دُنیا سے سوچتے تھے الگ

اکیلے پن کی اذیت کا اب گلہ کیسا
فرازؔ خود ہی تو اوروں سے ہو گئے تھے الگ

جلاوطنی میں

جاتے سال کی آخری شب ہے
چھل چراغ کی روشنیوں سے
بادۂ گلگوں کی رنگت سے
جگر جگر کرتے پیمانے
جیسے جاتے سال کی گھڑیاں
جیسے دیے سے ہوا کی چاہت
جیسے دید کی آخری ساعت
جیسے بھولتی یاد کی کڑیاں

خواب اگر جھوٹے ہوتے ہیں
کب سچّی تعبیریں ہوں گی
ہاتھوں میں گلدستے لیکن
پاؤں میں زنجیریں ہوں گی

آؤ آخری رات ہے سال کی
دل کہتا ہے بزمِ وصال کی
سب شمعیں ساری خوشبوئیں
تن من میں رس بس جانے دو
یہ جو لہو سے اَبر اٹھا ہے
آج کی رات برس جانے دو
لیکن باہر جھانک کے دیکھو

جیسے آج کی رات ستارے
چُپ بیٹھے آکاش کنارے
جاگ رہے ہیں سوچ رہے ہیں
جاتے سال کی آخری شب ہے
کل کا سورج کیسے ہو گا

پس انداز موسم

احمد ندیم قاسمی
کے نام

کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

ترتیب

○

قربِ جاناں کا نہ میخانے کا موسم آیا
پھر سے بے صرفہ اجڑ جانے کا موسم آیا

کنجِ غربت میں کبھی گوشۂ زنداں میں تھے ہم
جانِ جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا

اب لہو رونے کی خواہش نہ لہو ہونے کی
دلِ زندہ ترے مر جانے کا موسم آیا

کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

کوئی زنجیر، کوئی حرفِ خرد لے آیا
فصلِ گل آئی کہ دیوانے کا موسم آیا

سیلِ خوں شہر کی گلیوں میں در آیا ہے فرازؔ
اور تُو خوش ہے کہ گھر جانے کا موسم آیا

○

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا
قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

تھا جنہیں زعم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے
میں کہ صحرا نظر آتا تھا سمندر نکلا

میں نے اس جانِ بہاراں کو بہت یاد کیا
جب کوئی پھول مری شاخِ ہنر پر نکلا

شہر والوں کی محبت کا میں قائل ہوں مگر
میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا

تو یہیں ہار گیا ہے مرے بزدل دشمن
مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا

میں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فرازؔ
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا

○

وہی عشق جو تھا کبھی جنوں اسے روزگار بنا دیا
کہیں زخم بیچ کے آ گئے کہیں شعر کوئی سنا دیا

وہی ہم کہ جن کو عزیز تھی دُرِ آبرو کی چمک دمک
یہی ہم کہ روزِ سیاہ میں زرِ داغِ دل بھی لٹا دیا

کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا

کبھی خود کو ٹوٹتے پھوٹتے بھی جو دیکھتے تو حزیں نہ تھے
مگر آج خود پہ نظر پڑی تو شکستِ جاں نے ہلا دیا

کوئی نامہ دلبرِ شہر کا کہ غزل گری کا بہانہ ہو
وہی حرفِ دل جسے مدتوں سے ہم اہلِ دل نے بھلا دیا

○

گیسوئے شام میں ایک ستارہ ایک خیال
دل میں لیے پھرتے ہیں تمہارا ایک خیال

بامِ فلک پر سورج چاند ستارے تھے
ہم نے بیاضِ دل پہ اتارا ایک خیال

کبھی تو ان کو بھی دیکھو، جن لوگوں نے
عمر گنوائی اور سنوارا ایک خیال

یادِ کے شہر کے شور سے کالے کوسوں دور
دشتِ فراموشی سے پکارا ایک خیال

یوں بھی ہُوا ہے دل کے مقابل دنیا تھی
پھر بھی نہ ہارا پھر بھی نہ ہارا ایک خیال

مجھ پر ضرب پڑی، تو خلقت نے دیکھا
میری بجائے پارا پارا ایک خیال

ایک مسافت ایک اداسی ایک فراز
ایک تمنّا، ایک شرارا، ایک خیال

○

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
بادل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

اب دوش پہ سر نہیں تو گویا
اک بوجھ سا دل سے ہٹ گیا ہے

یہ خلوتِ جاں میں کون آیا
ہر چیز الٹ پلٹ گیا ہے

کیا مالِ غنیم تھا مرا شہر
کیوں لشکریوں میں بٹ گیا ہے

اب دل میں فراز کون آئے
دنیا سے یہ شہر کٹ گیا ہے

○

گئے دنوں میں محبت مزاج اس کا تھا
مگر کچھ اور ہی انداز آج اس کا تھا

وہ شہر یار جب اقلیمِ حرف میں آیا
تو میرا دست نگر تخت و تاج اس کا تھا

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اس نے بے وفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اس کا تھا

ہمیں بھی دکھ ہے دلِ زندہ دل کے مرنے کا
کسی کے پاس مگر کب علاج اس کا تھا

لہو لہان تھا میں اور عدل کی میزان
جھکی تھی جانبِ قاتل کہ راج اس کا تھا

تجھے گلہ ہے کہ دنیا نے پھیر لیں آنکھیں
فرازؔ یہ تو سدا سے رواج اس کا تھا

بن باس کی ایک شام......

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام جو ہے مہجوری کی
یہ شام اپنوں سے دوری کی

اس شام افق کے ہونٹوں پر
جو لالی ہے زہریلی ہے
اس شام نے میری آنکھوں سے
صہبائے طرب سب پی لی ہے
یہ شام غضب تنہائی کی

پت جھڑ کی ہوا برفیلی ہے
اس شام کی رنگت پیلی ہے
اس شام فقط آواز تری
کچھ ایسے سنائی دیتی ہے
آواز دکھائی دیتی ہے

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام بھی تیرے نام کی ہے

وہ شکل وہ لالے کی سی کیاری نہیں بھولے
اگبور[1] میں جو شام گزاری نہیں بھولے

صورت تھی کہ ہم جیسے صنم ساز بھی گم تھے
مورت تھی کہ ہم جیسے پجاری نہیں بھولے

اب اس کا تغافل بھی گوارا کہ ابھی تک
ہم ترکِ ملاقات کی خواری نہیں بھولے

یاروں کی خطاؤں پہ نظر ہم نے نہ رکھی
اور یار کوئی بھول ہماری نہیں بھولے

خلعت کے لیے حرف کا سودا نہیں کرتے
کچھ لوگ ابھی وضع ہماری نہیں بھولے

---

[1] نائیجیریا کا ایک شہر

دانے کی ہوس لا نہ سکی دام میں مجھ کو
یہ میری خطا میرے شکاری نہیں بھولے

ہم اپنے تئیں لاکھ زِخود رفتہ ہوں لیکن
یوں ہے کہ کوئی بات تمہاری نہیں بھولے

اک لُعبتِ ہندی نے فرازؔ اب کے لکھا ہے
رادھا کو کبھی کرشن مراری نہیں بھولے

مرثیہ

وہ زخمِ انتظار کی لذّت بھی لے گیا
اب نامہ بر کی راہ نہ دیکھا کریں گے ہم

وہ کس طرح ملا تھا جدا کیسے ہو گیا
سوچا تھا یہ سوال نہ سوچا کریں گے ہم

اے زندگی جب اس سے وفا کر سکی نہ تو
پھر تُو بتا کہ تجھ سے وفا کیا کریں گے ہم

○

جہاں کے شور سے گھبرا گئے کیا
مسافر گھر کو واپس آ گئے کیا

نہ تھی اتنی کڑی تازہ مسافت
پرانے ہم سفر یاد آ گئے کیا

یہاں کچھ آشنا سی بستیاں تھیں
جزیروں کو سمندر کھا گئے کیا

مری گردن میں باہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اکتا گئے کیا

نہیں آیا مرا جانِ بہاراں
درختوں پر شگوفے آ گئے کیا

جہاں میلہ لگا ہے قاتلوں کا
فرازؔ اس شہر میں تنہا گئے کیا

○

جب ملاقات بے ارادہ تھی
اس میں آسودگی زیادہ تھی

نہ توقع نہ انتظار نہ رنج
صبحِ ہجراں نہ شامِ وعدہ تھی

نہ تکلّف نہ احتیاط نہ زعم
دوستی کی زبان سادہ تھی

جب بھی چاہا کہ گنگناؤں اسے
شاعری پیش پا فتادہ تھی

لعل سے لب چراغ سی آنکھیں
ناک ستواں جبیں کشادہ تھی

حدّتِ جاں سے رنگ تانبا سا
ساغر افروز موجِ بادہ تھی

زلف کو ہمسری کا دعویٰ تھا
پھر بھی خوش قامتی زیادہ تھی

کچھ تو پیکر میں تھی بلا کی تراش
کچھ وہ کافر تنک لبادہ تھی

اپسرا تھی نہ حور تھی نہ پری
دلبری میں مگر زیادہ تھی

جتنی بے مہر، مہرباں اتنی
جتنی دشوار، اتنی سادہ تھی

اک زمانہ جسے کہے قاتل
میرے شانے پہ سر نہادہ تھی

یہ غزل دین اُس غزال کی ہے
جس میں ہم سے وفا زیادہ تھی

وہ بھی کیا دن تھے جب فرازؔ اس سے
عشق کم عاشقی زیادہ تھی

○

یہ دل جو تجھ کو بظاہر بُھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے

گزر سکے تو گزر جا شبِ فراق، کہ ہم
تھکے ہوئے بھی ہیں برسوں کا رتجگا بھی ہے

دلا ملال نہ رکھ اس سے تُو کہ وہ ظالم
ندیم سارے جہاں کا سہی ترا بھی ہے

وہی ہوائیں جو کل لے گئی تھیں میری گلیم
انہی کی زد پہ ترا طُرّہ و قبا بھی ہے

غنیم کو مگر اس کا نہیں ہے اندازہ
جو بے سپر تنِ تنہا ہے قافلہ بھی ہے

فراز شہرِ غزل میں قدم سلوک سے رکھ
کہ اس میں میر سا، غالب سا خوش نوا بھی ہے

''نائیجیریا''

○

شگفتِ گُل کی صدا میں رنگِ چمن میں آؤ
کوئی بھی رت ہو بہار کے پیرہن میں آؤ

کوئی سفر ہو تمہی کو منزل سمجھ کے جاؤں
کوئی مسافت ہو تم مری ہی لگن میں آؤ

کبھی تو ایسا بھی ہو کہ لوگوں کی بات سن کر
مری طرف تم رقابتوں کی جلن میں آؤ

وہ جس غرور اور ناز سے تم چلے گئے تھے
کبھی اسی تمکنت، اسی بانکپن میں آؤ

یہ کیوں ہمیشہ مری طلب ہی تمہیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

ہزار مفلس سہی مگر ہیں سخی بلا کے
کبھی تو تم اہلِ درد کی انجمن میں آؤ

ہم اہلِ دل ہیں ہماری اقلیم حرف کی ہے
کبھی تو جانِ سخن، دیارِ سخن میں آؤ

کبھی کبھی دوریوں سے کوئی پکارتا ہے
فراز جانی، فراز پیارے، وطن میں آؤ

(لندن)

○

اس در پہ ٹھکانہ کبھی اس راہ میں ڈیرا
ہم خانہ بدوشوں کا یہی شام سویرا

بے مہریٔ دنیا کا گلہ ہے ترے لب پر
اب کیسے بتاؤں تجھے میں بھی نہیں تیرا

وہ چار قدم ہے یہ کرن ہم سفری کی
پھر آگے وہی شہرِ جدائی کا اندھیرا

ہیں بھی جو تنک خُو تو زمانے کے لیے ہیں
اے جاں کبھی ہم نے ترا فرماں نہیں پھیرا

اک مُشتِ غُبار اور کفِ موجِ ہوا پر
چاہا تو سمیٹا ہے نہ چاہا تو بکھیرا

مل جائے جو غربت میں فرازؔ اب وہی ہمدم
ہو جائے جہاں شام وہیں رین بسیرا

(نیویارک)

○
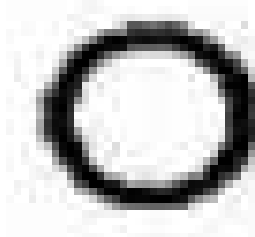
تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
ترے گلاب سے چہرے پہ زر اُداسی کا

مرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اُداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یارِ مہرباں میرے
کہ تُو علاج نہیں میری ہر اُداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا مرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اُداسی کا

نہ جانے آج کہاں کھو گیا ستارۂ شام
وہ میرا دوست مرا ہم سفر اُداسی کا

فرازؔ دیدۂ پُر آب میں نہ ڈھونڈ اُسے
کہ دل کی تہہ میں کہیں ہے گھر اُداسی کا

○

جان سے عشق اور جہاں سے گریز
دوستوں نے کیا کہاں سے گریز

ابتدا کی ترے قصیدے سے
اب یہ مشکل، کروں کہاں سے گریز

میں وہاں ہوں جہاں جہاں تم ہو
تم کرو گے کہاں کہاں سے گریز

کر گیا میرے تیرے قصّے میں
داستاں گو، یہاں وہاں سے گریز

جنگ ہاری نہ تھی ابھی کہ فرازؔ
کر گئے دوست درمیاں سے گریز

○
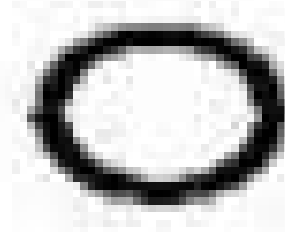
غیرتِ عشق سلامت تھی انا زندہ تھی
وہ بھی دن تھے کہ رہ و رسمِ وفا زندہ تھی

قیس کو دوش نہ دو رکھیو نہ فرہاد کو نام
انہی لوگوں سے محبت کی ادا زندہ تھی

شہرِ بیمار کے ہر کوچہ و بام و در پر
ہم بھی مرتے تھے کہ جب خلقِ خدا زندہ تھی

بجھ گئیں شمعیں تو دم توڑ گئے جھونکے بھی
جس طرح زہرِ رقابت سے ہوا زندہ تھی

یادِ ایّام کے صحرائے محبت میں فرازؔ
جرسِ قافلۂ دل کی صدا زندہ تھی

○

وہ دشمنِ جاں، جان سے پیارا بھی کبھی تھا
اب کس سے کہیں کوئی ہمارا بھی کبھی تھا

اترا ہے رگ و پے میں تو دل کٹ سا گیا ہے
یہ زہرِ جدائی کہ گوارا بھی کبھی تھا

ہر دوست جہاں ابرِ گریزاں کی طرح ہے
یہ شہر یہی شہر ہمارا بھی کبھی تھا

تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

اب اگلے زمانے کے ملیں لوگ تو پوچھیں
جو حال ہمارا ہے، تمہارا بھی کبھی تھا

ہر بزم میں ہم نے اسے افسردہ ہی دیکھا
کہتے ہیں فرازؔ انجمن آرا بھی کبھی تھا

○

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ

یہ حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

خیال ان کا بھی آیا کبھی تمہیں جاناں
جو تم سے دُور بہت دُور جی رہے تھے الگ

ہمی نہیں ہیں، ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو اوروں سے سوچتے تھے الگ

اکیلے پن کی اذیّت کا اب گلہ کیسا
فرؔاز خود ہی تو اپنوں سے ہو گئے تھے الگ

○
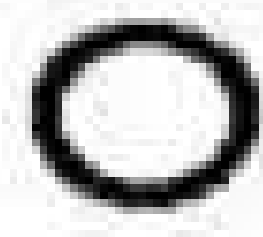
ہم بھی شاعر تھے کبھی جانِ سخن یاد نہیں
تجھ کو بھولے ہیں تو دلداریٔ فن یاد نہیں

دل سے کل محوِ تکلّم تھے تو معلوم ہوا
کوئی کاکل، کوئی لب، کوئی دہن یاد نہیں

عقل کے شہر میں آیا ہے تو یوں گم ہے جنوں
لبِ گویا کو بھی بے ساختہ پن یاد نہیں

اوّل اوّل تو نہ تھے واقفِ آدابِ قفس
اور اب رسم و رہِ اہلِ چمن یاد نہیں

ہر کوئی ناوک و ترکش کی دکاں پوچھتا ہے
کسی گاہک کو مگر اپنا بدن یاد نہیں

وقت کس دشتِ فراموشی میں لے آیا ہے
اب ترا نام بھی خاکم بدہن یاد نہیں

یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فرازؔ
ہم کو بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہیں

○
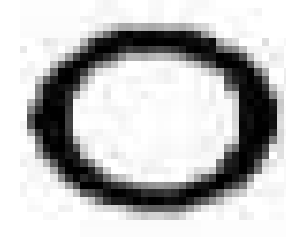
وحشت تھی مگر چاک لبادہ بھی نہیں تھا
یوں زخم نمائی کا ارادہ بھی نہیں تھا

خلعت کے لیے قیمتِ جاں یوں بھی بہت تھی
پھر اتنا دلآویز لبادہ بھی نہیں تھا

ہم مرحبا کہتے ترے ہر تیرِ ستم پر
سچ یہ ہے کہ دل اتنا کشادہ بھی نہیں تھا

ہم خون میں نہلائے گئے تیری گلی میں
اور تُو کہ سرِ بام ستادہ بھی نہیں تھا

یارو کوئی تدبیر کرو تم کہ وہ ہم سے
ناخوش تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں تھا

آخر کو تو گُل ہو گئے سورج سے مسافر
اور میں تو چراغِ سرِ جادہ بھی نہیں تھا

پاگل ہو فرازؔ آج جو رہ دیکھ رہے ہو
جب اس سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں تھا

○

ردائے زخم ہر گل پیرہن پہنے ہوئے ہے
جسے دیکھو وہی چپ کا کفن پہنے ہوئے ہے

وہی سچ بولنے والا ہمارا دوست دیکھو
گلے میں طوق پاؤں میں رسن پہنے ہوئے ہے

اندھیری اور اکیلی رات اور دل اور یادیں
یہ جنگل جگنوؤں کا پیرہن پہنے ہوئے ہے

رہا ہو بھی چکے سب ہم قفس کب کے مگر دل
یہ وحشی اب بھی زنجیرِ کہن پہنے ہوئے ہے

سنا ہے ایک ایسا طائفہ ہے اہلِ دل کا
جو دیوانہ نہیں دیوانہ پن پہنے ہوئے ہے

فرازؔ اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

○

قربت نہیں تو شدّتِ ہجراں ضرور ہو
جاناں سے کوئی سلسلۂ جاں ضرور ہو

ہم ایسے وحشیوں کی تواضع کے واسطے
ہر گھر میں اک ذرا سا بیاباں ضرور ہو

نوواردانِ مدرسۂ عشق کے لیے
درسِ وفا کا قاعدہ آساں ضرور ہو

تو ملتفت اگر ہے تو ہر درد کی دوا
یہ کیا ضرور ہے کہ مری جاں ضرور ہو

جیسا بھی تیرا حال ہے اے دل ترے لیے
لازم نہیں کہ وہ بھی پریشاں ضرور ہو

آؤ جب اس کی بزم میں سازِ سخن لیے
مضرابِ غم کی زد پہ رگِ جاں ضرور ہو

قربت بہت عزیز ہے اس کی مگر فرازؔ
جی چاہتا ہے صحبتِ یاراں ضرور ہو

جس طرح کوئی کہے......

اور ترے شہر سے جب رختِ سفر باندھ لیا
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کیا کرتے
چاند کجلائی ہوئی شام کی دہلیز پہ تھا
اس گھڑی بھی ترے مجبورِ سفر کیا کرتے
دل ٹھہر جانے کو کہتا تھا مگر کیا کرتے

"ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا"
جس طرح یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
کچھ اسی طرح کی کیفیتِ جاں آج بھی ہے
جس طرح کوئی قیامت ہو گزر جانے کو
جس طرح کوئی کہے پھر سے پلٹ آنے کو

(واشنگٹن)

شہر نامہ

(اوجڑی کیمپ کے حوالے سے)

وہ عجیب صبحِ بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی
مری بستیاں تھیں دُھواں دُھواں
مرے گھر میں آگ بھری رہی

مرے راستے تھے لہو لہو
مرا قریہ قریہ فگار تھا
یہ کفِ ہوا پہ زمین تھی
وہ فلک کہ مشتِ غبار تھا

کئی آبشار سے جسم تھے
کہ جو قطرہ قطرہ پگھل گئے
کئی خوش جمال طلسم تھے
جنہیں گرد باد نگل گئے

کوئی خواب نوکِ سناں پہ تھا
کوئی آرزو تہِ سنگ تھی
کوئی پھول آبلہ آبلہ
کوئی شاخ مرقدِ رنگ تھی

کئی لاپتہ میری لعبتیں
جو کسی طرف کی نہ ہو سکیں
جو نہ آنے والوں کے ساتھ تھیں
جو نہ جانے والوں کو رو سکیں

کہیں تارِ ساز سے کٹ گئی
کسی مطربہ کی رگِ گلو
مئے آتشیں میں وہ زہر تھا
کہ تڑخ گئے قدح و سبو

کوئی نَے نواز تھا دم بخود
کہ نفس سے حدّتِ جاں گئی
کوئی سر بہ زانو تھا باربد
کہ صدائے دوست کہاں گئی

کہیں نغمگی میں وہ بَین تھے
کہ سماعتوں نے سُنے نہیں
کہیں گونجتے تھے وہ مرثیے
کہ انیسؔ نے بھی کہے نہیں

یہ جو سنگ ریزوں کے ڈھیر ہیں
یہاں موتیوں کی دکان تھی
یہ جو سائبان دھوئیں کے ہیں
یہاں بادلوں کی اڑان تھی

جہاں روشنی ہے کھنڈر کھنڈر
یہاں قمقموں سے جوان تھے
جہاں چیونٹیاں ہوئیں خیمہ زن
یہاں جگنوؤں کے مکان تھے

کہیں آبگینہ خیال کا
کہ جو کربِ ضبط سے چور تھا
کہیں آئینہ کسی یاد کا
کہ جو عکسِ یار سے دور تھا

مرے بسملوں کی قناعتیں
جو بڑھائیں ظلم کے حوصلے
مرے آہوؤں کا چکیدہ خوں
جو شکاریوں کو سراغ دے

مری عدل گاہوں کی مصلحت
مرے قاتلوں کی وکیل ہے
مرے خانقاہوں کی منزلت
مری بزدلی کی دلیل ہے

مرے اہلِ حرف و سخن سرا
جو گداگروں میں بدل گئے
مرے ہم صفیر تھے حیلہ جُو
کسی اور سمت نکل گئے

کئی فاختاؤں کی چال میں
مجھے کرگسوں کا چلن لگا
کئی چاند بھی تھے سیاہ رو
کئی سُورجوں کو گہن لگا

کوئی تاجرِ حسب و نسب
کوئی دیں فروشِ قدیم ہے
یہاں کفش بر بھی امام ہیں
یہاں نعت خواں بھی کلیم ہے

کوئی فکر مند کلاہ کا
کوئی دعویٰ دار قبا کا ہے
وہی اہلِ دل بھی ہیں زیب تن
جو لباس اہلِ ریا کا ہے

مرے پاسباں، مرے نقب زن
مرا مُلک مِلکِ یتیم ہے
مرا دیس میرِ سپاہ کا
مرا شہر مالِ غنیم ہے

جو روش ہے صاحبِ تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے
یہاں کوتوال بھی دُزدِ شب
یہاں شیخِ دیں بھی فریق ہے

یہاں سب کے نرخ جدا جدا
اسے مول لو اسے تول دو
جو طلب کرے کوئی خوں بہا
تو دہن خزانے کا کھول دو

وہ جو سرکشی کا ہو مرتکب
اسے قمچیوں سے زبوں کرو
جہاں خلقِ شہر ہو مشتعل
اسے گولیوں سے نگوں کرو

مگر ایسے ایسے غنی بھی تھے
اسی قحط زارِ دمشق میں
جنہیں کوئے یار عزیز تھا
جو کھڑے تھے مقتلِ عشق میں

کوئی بانکپن میں تھا کوہکن
تو جنوں میں قیس سا تھا کوئی
جو صراحیاں لیے جسم کی
مئے نابِ خوں سے بھری ہوئی

تھے صدا بلب کہ پیو پیو
یہ سبیل اہلِ صفا کی ہے
یہ نشید نوشِ بدن کرو
یہ کشید تاکِ وفا کی ہے

کوئی تشنہ لب ہی نہ تھا یہاں
جو پکارتا کہ اِدھر اِدھر
سبھی مفت بر تھے تماش بیں
کوئی بزم میں کوئی بام پر

سبھی بے حسی کے خمار میں
سبھی اپنے حال میں مست تھے
سبھی رہروانِ رہِ عدم
مگر اپنے زعم میں ہست تھے

سو لہو کے جام انڈیل کر
مرے جانفروش چلے گئے
وہ سکوت تھا سرِ میکدہ
کہ وہ خم بدوش چلے گئے

کوئی محبسوں میں رسن بہ پا
کوئی مقتلوں میں دریدہ تن
نہ کسی کے ہاتھ میں شاخِ نَے
نہ کسی کے لب پہ گُلِ سخن

اسی عرصۂ شبِ تار میں
یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

یہاں روزِ حشر بپا ہوئے
پہ کوئی بھی روزِ جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

کر گئے کوچ کہاں

اتنی مدّت دِل آوارہ کہاں تھا کہ تجھے
اپنے ہی گھر کے در و بام بھلا بیٹھے ہیں
یاد یاروں نے تو کب حرفِ محبت رکھا
غیر بھی طعنہ و دشنام بھلا بیٹھے ہیں

تو سمجھتا تھا کہ یہ در بدری کا عالم
دور دیسوں کی عنایت تھا سو اب ختم ہوا
تو نے جانا تھا کہ آشفتہ سَری کا موسم
دشتِ غربت کی ودیعت تھا سو اب ختم ہوا

اب جو تو شہرِ نگاراں میں قدم رکھے گا
ہر طرف کھلتے چلے جائیں گے چہروں کے گلاب
دوست احباب ترے نام کے ٹکرائیں گے جام
غیر اغیار چُکائیں گے رقابت کے حساب

جب بھی گائے گی کوئی غیرتِ ناہید غزل
سب کو آئے گا نظر شعلۂ آواز میں تُو
جب بھی ساقی نے صراحی کو دیا اِذنِ خرام
بزم کی بزم پکارے گی کہ آغاز میں تُو

مائیں رکھیں گی ترے نام پہ اولاد کا نام
باپ بیٹوں کے لیے تیری بیاضیں لیں گے
جن پہ قدغن ہے وہ اشعار پڑھے گی خلقت
اور دُکھتے ہوئے دل تجھ کو سلامی دیں گے

لوگ الفت کے کھلونے لیے بچّوں کی طرح
کل کے روٹھے ہوئے یاروں کو منا لائیں گے
لفظ کو بیچنے والے نئے بازاروں میں
غیرتِ حرف کو لاتے ہوئے شرمائیں گے

لیکن ایسا نہیں ایسا نہیں اے دل اے دل
یہ ترا دیس یہ تیرے در و دیوار نہیں
اتنے یوسف تو نہ تھے مصر کے بازار میں بھی
جنس اس درجہ ہے وافر کہ خریدار نہیں

سر کسی کا بھی دکھائی نہیں دیتا ہے یہاں
جسم ہی جسم ہیں دستاریں ہی دستاریں ہیں
تو کسی قریۂ زنداں میں ہے شاید کہ جہاں
طوق ہی طوق ہیں دیواریں ہی دیواریں ہیں

اب نہ طفلاں کو خبر ہے کسی دیوانے کی
اور نہ آواز کہ "او چاک گریباں والے"
نہ کسی ہاتھ میں پتھر نہ کسی ہاتھ میں پھول
کر گئے کوچ کہاں کوچۂ جاناں والے

ابھی ہم خوبصورت ہیں

(احمد شمیم کی یاد میں)

ہمارے جسم اوراقِ خزانی ہو گئے ہیں
اور ردائے زخم سے آراستہ ہیں
پھر بھی دیکھو تو
ہماری خوشنمائی پر کوئی حرف
اور کشیدہ قامتی میں خم نہیں آیا
ہمارے ہونٹ زہریلی رُتوں سے کاسنی ہیں
اور چہرے رتجگوں کی شعلگی سے
آبنوسی ہو چکے ہیں
اور زخمی خواب
نادیدہ جزیروں کی زمیں پر
اس طرح بکھرے پڑے ہیں
جس طرح طوفاں زدہ کشتی کے ٹکڑوں کو
سمندر ساحلوں پر پھینک دیتا ہے

لہو کی بارشیں
یا خودکشی کی خواہشیں تھیں
اس اذیت کے سفر میں
کون سا موسم نہیں آیا
مگر آنکھوں میں نم
لہجے میں سم
ہونٹوں پہ کوئی نغمۂ ماتم نہیں آیا
ابھی تک دل ہمارے
خندۂ طفلاں کی صورت بے کدورت ہیں
ابھی ہم خوبصورت ہیں

زمانے ہو گئے
ہم کوئے جاناں چھوڑ آئے تھے
مگر اب بھی
بہت سے آشنا نا آشنا ہمدم
اور ان کی یاد کے مانوس قاصد
اور ان کی چاہتوں کے ہجر نامے
دور دیسوں سے ہماری اور آتے ہیں
گلابی موسموں کی دھوپ

جب نورُستہ سبزے پر قدم رکھتی ہوئی
معمورۂ تن میں در آتی ہے
تو برفانی بدن میں
جوئے خوں آہستگی سے گنگناتی ہے
اُداسی کا پرندہ
چپ کے جنگل میں
سرِ شاخِ نہالِ غم چہکتا ہے
کوئی بھولا ہوا بسرا ہوا دکھ
آبلہ بن کر چٹکتا ہے
تو یوں لگتا ہے
جیسے حرف اپنے
زندہ آوازوں کی صورت ہیں
ابھی ہم خوبصورت ہیں

ہماری خوشنمائی حرفِ حق کی رونمائی ہے
اسی خاطر تو ہم آشفتہ جاں
عشّاق کی یادوں میں رہتے ہیں
کہ جو اُن پر گزرتی ہے وہ کہتے ہیں
ہماری حرف سازی

اب بھی محبوبِ جہاں ہے
شاعری شوریدگانِ عشق کے وردِ زباں ہے
اور گلابوں کی طرح شاداب چہرے
لعل و مرجاں کی طرح لب
صندلیں ہاتھوں سے
چاہت اور عقیدت کی بیاضوں پر
ہمارے نام لکھتے ہیں
سبھی دردآشنا
ایثار مشرب
ہم نفس اہلِ قفس
جب مقتلوں کی سمت جاتے ہیں
ہمارے بیت گاتے ہیں
ابھی تک ناز کرتے ہیں
سب اہلِ قافلہ
اپنے حدی خوانوں پر آشفتہ کلاموں پر
ابھی ہم دستخط کرتے ہیں اپنے قتل ناموں پر
ابھی ہم آسمانوں کی امانت
اور زمینوں کی ضرورت ہیں
ابھی ہم خوبصورت ہیں

وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے

تمہاری پوروں کا لمس اب تک
مری کفِ دست پر ہے
اور میں یہ سوچتا ہوں
وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے
وہ کہہ گئے تھے
کہ اب کے جو ہاتھ تیرے ہاتھوں کو چھو گئے ہیں
تمام ہونٹوں کے سارے لفظوں سے معتبر ہیں
وہ کہہ گئے تھے
تمہاری پوریں
جو میرے ہاتھوں کو چھو رہی تھیں
وہی تو قسمت تراش ہیں
اور اپنی قسمت کو
سارے لوگوں کی قسمتوں سے بلند جانو
ہماری مانو

تو اَب کسی اور ہاتھ کو ہاتھ مت لگانا

میں اس سمے سے

تمام ہاتھوں

وہ ہاتھ بھی

جن میں پھول

شاخوں سے بڑھ کے لطفِ نمو اٹھائیں

وہ ہاتھ بھی جو سدا کے محروم تھے

اور ان کی ہتھیلیاں زخم زخم تھیں

اور وہ ہاتھ بھی جو چراغ جیسے تھے

اور رستے میں سنگ فرسنگ کی طرح جا بجا گڑے تھے

وہ ہاتھ بھی

جن کے ناخنوں کے نشان

معصوم گردنوں پر مثالِ طوقِ ستم پڑے تھے

تمام نامہرباں اور مہربان ہاتھوں سے

دست کش یوں رہا ہوں جیسے

یہ مٹھیاں میں نے کھول دیں تو

وہ ساری سچائیوں کے موتی

مسرّتوں کے تمام جگنو

جو بے یقینی کے جنگلوں میں

یقین کا راستہ بناتے ہیں
روشنی کی لکیر کا قافلہ بناتے ہیں
میرے ہاتھوں سے روٹھ جائیں گے
پھر نہ تازہ ہوا چلے گی
نہ کوئی شمعِ صدا جلے گی
میں ضبط اور انتظار کے اس حصار میں مدتوں رہا ہوں
مگر جب اک شام
اور وہ پت جھڑ کی آخری شام تھی
ہوا اپنا آخری گیت گا رہی تھی
مرے بدن میں مرا لہو خشک ہو رہا تھا
تو مٹھیاں میں نے کھول دیں
اور میں نے دیکھا
کہ میرے ہاتھوں میں
کوئی جگنو
نہ کوئی موتی
ہتھیلیوں پر فقط مری نامراد آنکھیں دھری ہوئی تھیں
اور ان میں
قسمت کی سب لکیریں مری ہوئی تھیں

اے میرے وطن کے خوش نواؤ!

(واشنگٹن میں پاکستانی شعراء کی آمد کے موقع پر لکھی گئی)

اک عمر کے بعد تم ملے ہو
اے میرے وطن کے خوش نواؤ
ہر ہجر کا دن تھا حشر کا دن
دوزخ تھے فراق کے الاؤ
روؤں کہ ہنسوں سمجھ نہ آئے
ہاتھوں میں ہیں پھول دل میں گھاؤ

تم آئے تو ساتھ ہی تمہارے
بچھڑے ہوئے یار یاد آئے
اک زخم پہ تم نے ہاتھ رکھا
اور مجھ کو ہزار یاد آئے
وہ سارے رفیق پابجولاں
سب کشتۂ دار یاد آئے

ہم سب کا ہے ایک ہی قبیلہ
اک دشت کے سارے ہم سفر ہیں
کچھ وہ ہیں جو دوسروں کی خاطر
آشفتہ نصیب و دربدر ہیں
کچھ وہ ہیں جو خلعت و قبا سے
ایوانِ شہی میں معتبر ہیں

سقراط و مسیح کے فسانے
تم بھی تو بہت سنا رہے تھے
منصور و حسین سے عقیدت
تم بھی تو بہت جتا رہے تھے
کہتے تھے صداقتیں اَمر ہیں
اَوروں کو یہی بتا رہے تھے

اور اب جو ہیں جا بجا صلیبیں
تم بانسریاں بجا رہے ہو
اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدحِ یزید گا رہے ہو
جب سچ تہہِ تیغ ہو رہا ہے
تم سچ سے نظر چُرا رہے ہو

جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں
کیا راز اس اجتناب میں ہے
تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے
یہ بے حسی کس حساب میں ہے
تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو
جب خلقِ خدا عذاب میں ہے

سوچو تو تمہیں ملا بھی کیا ہے
اِک لقمۂ تر قلم کی قیمت
غیرت کی فروخت کرنے والو
اک کاسۂ زر قلم کی قیمت
پندار کے تاجرو بتاؤ
دربان کا در قلم کی قیمت

ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں
غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو
تھامے ہوئے مصلحت کی میزان
ہر شعر کا وزن تولتے ہو
ایسے میں سکوت، چشم پوشی
ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو

اک عمر سے عدل و صدق کی لاش
غاصب کی صلیب پر جڑی ہے
اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

ہے سب کو عزیز کوئے جاناں
اس راہ میں سب جئے مرے ہیں
خود میری بیاضِ شعر میں بھی
بربادیٔ دل کے مرثیے ہیں
میں نے بھی کیا ہے ٹوٹ کر عشق
اور ایک نہیں کئی کیے ہیں

لیکن غمِ عاشقی نہیں ہے
ایسا جو سبک سری سکھائے
یہ غم تو وہ خوش مآل غم ہے
جو کوہ سے جُوئے شیر لائے
تیشے کا ہنر جنوں کو بخشے
جو قیس کو کوہکن بنائے

اے حیلہ گرانِ شہرِ شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں دربدر میں
بیچا نہ غرورِ نَے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سبک ہنر میں

تم بھی کبھی ہمنوا تھے میرے
پھر آج تمہیں یہ کیا ہُوا ہے
مٹی کے وقار کو نہ بیچو
یہ عہدِ ستم، جہاد کا ہے
دریوزہ گری کے مقبروں سے
زنداں کی فصیل خوشنما ہے

کب ایک ہی رُت رہی ہمیشہ
یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی
جب حرف کہے گا قم بہ اِذنی
مرتی ہوئی خاک جی اٹھے گی
لیلائے وطن کے پیرہن میں
بارود کی بُو نہیں رہے گی

پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے
پھر مدحِ رخ و دہن کہیں گے
ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع
جاناں کے لیے سخن کہیں گے
افسانۂ یار و قصۂ دل
پھر انجمن انجمن کہیں گے

اے میرے سارے لوگو!

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی

پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارُود کی بُو پھیلی ہے
پھر سے "تُو کون ہے میں کون ہوں" آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میانِ من و تُو پھیلی ہے

مری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اترا
آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے
میرے سینے میں سدا اپنا ہی خنجر اترا

پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئیں عام وہی اہلِ ریا کی باتیں
نعرۂ حُبِّ وطن مالِ تجارت کی طرح
جنسِ ارزاں کی طرح دینِ خدا کی باتیں

اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی
صبحِ وحشت کی طرح شامِ غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمانِ وفا ٹوٹے تھے
شیشۂ دل کی طرح آئینۂ جاں کی طرح

پھر کہاں احمریں ہونٹوں پہ دعاؤں کے دیے
پھر کہاں شبنمیں چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں پہ جل بجھ گیا انگارِ حنا

دل نشیں آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخِ بازو کے لیے زلف کا بادل رویا
مثلِ پیراہنِ گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اغیار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دو نیم
نوکِ دشنہ سے کھچی تھی مری دھرتی پہ لکیر

آج ایسا نہیں، ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہو گی
میرے دل گیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو

نامۂ جاناں

مدتوں بعد ملا نامۂ جاناں لیکن
نہ کوئی دل کی حکایت نہ کوئی پیار کی بات
نہ کسی حرف میں محرومیٔ جاں کا قصّہ
نہ کسی لفظ میں بھولے ہوئے اقرار کی بات
نہ کسی سطر پہ بھیگے ہوئے کاجل کی لکیر
نہ کہیں ذکر جدائی کا نہ دیدار کی بات

بس وہی ایک ہی مضموں، کہ مرے شہر کے لوگ
کیسے سہمے ہوئے رہتے ہیں گھروں میں اپنے
اتنی بے نام خموشی ہے کہ دیوانے بھی
کوئی سودا نہیں رکھتے ہیں سروں میں اپنے
اب قفس ہی کو نشیمن کا بدل جان لیا
اب کہاں طاقتِ پرواز پروں میں اپنے

وہ جو دو چار سُبو کش تھے کہ جن کے دم سے
گردشِ جام بھی تھی رونقِ میخانہ بھی تھی
وہ جو دو چار نواگر تھے کہ جن کے ہوتے
حرمتِ نغمہ بھی تھی جرأتِ رندانہ بھی تھی.
کوئی مقتل کوئی زنداں کوئی پردیس گیا
چند ہی تھے کہ روش جن کی جداگانہ بھی تھی

اب تو بس بردہ فروشی ہے جدھر بھی جاؤ
اب تو ہر کوچہ و کُو مصر کا بازار لگے
سرِ دربار ستادہ ہیں بیاضیں لے کر
وہ جو کچھ دوست کبھی صاحبِ کردار لگے
غیرتِ عشق کہ کل مالِ تجارت میں نہ تھی
آج دیکھو تو ہیں انبار کے انبار لگے

ایسا آسیب زدہ شہر کہ دیکھا نہ سنا
ایسی دہشت ہے کہ پتھر ہوئے سب کے بازو
در و دیوارِ خرابات وہی ہیں لیکن
نہ کہیں قلقلِ مینا ہے نہ گل بانگِ سبو
بے دلی شیوۂ اربابِ محبت ٹھہرا
اب کوئی آئے کہ جائے "تتنا ہُو یا ہُو"

○

چاک پیراہنِ گل کو صبا جانتی ہے
مستیِ شوق کہاں بندِ قبا جانتی ہے

ہم تو بدنام محبت تھے سو رُسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہگذر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

ہوس انعام سمجھتی ہے کرم کو تیرے
اور محبت ہے کہ احساں کو سزا جانتی ہے

یوسف نہ تھے مگر سرِ بازار آ گئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آ گئے

ہم کج ادا چراغ کہ جب بھی ہوا چلی
طاقوں کو چھوڑ کر سرِ دیوار آ گئے

پھر اس طرح ہُوا مجھے مقتل میں چھوڑ کر
سب چارہ ساز جانبِ دربار آ گئے

اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آ گئے

آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آ گئے

سورج کی دوستی پہ جنہیں ناز تھا فرازؔ
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے

مسندِ پیرِ مغاں

اُڑا کے بادِ فنا لے گئی ہے شہر کا شہر
نہ بام و در رہے باقی نہ جسم و جاں میرے
کسے کسے میں پکاروں، کسے کسے روؤں
تڑپ رہے ہیں شناسا کہاں کہاں میرے

کسی کا کاسۂ سر ہے فضا میں سرگرداں
کوئی نگارِ دل آرا دو نیم ہو کے گرا
تڑخ گیا ہے کسی کا بدن صراحی سا
کسی کا شیشۂ جاں دستِ ناتواں سے گرا

دلوں پہ برق گری سنگِ محتسب کی طرح
نہ کوئی رند نہ رطلِ گراں سلامت ہے
بساطِ میکدہ ویراں ہوئی تو غم کیسا
خوشا کہ مسندِ پیرِ مغاں سلامت ہے

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

دل دھڑکتا نہیں تپکتا ہے
کل جو خواہش تھی آبلہ ہے مجھے

ہم سفر چاہیے، ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

کوہکن ہو کہ قیس ہو کہ فرازؔ
سب میں اک شخص ہی ملا ہے مجھے

آشنا کوئی سرِ شہرِ ستمگر نہ ملا
اب کے آئے تو کسی ہاتھ میں پتھر نہ ملا

سارے دشمن مری گلیوں کی کمیں گاہ میں تھے
کوئی لشکر بھی مجھے شہر کے باہر نہ ملا

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدّر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

نظم میخانہ کچھ ایسا ہی رہا ہے کہ ہمیں
کبھی ساقی کبھی مینا کبھی ساغر نہ ملا

ہم ہی محروم تھے ایسے کہ فقط تُو ہی نہیں
ہم جسے ڈھونڈنے نکلے وہی اکثر نہ ملا

دیکھ پندار اُن آشفتہ سروں کا کہ جنہیں
بختِ منصور ملا، تختِ سکندر نہ ملا

اب جو تجدیدِ رفاقت ہے تو پھر ٹوٹ کے مل
دل ہے آئینہ تو پھر ہاتھ جھجک کر نہ ملا

لاکھ بے مہر سہی دوست تو رکھتے ہو فرازؔ
ان کو دیکھو کہ جنہیں کوئی ستمگر نہ ملا

آشنا کوئی سرِ شہرِ ستمگر نہ ملا
اب کے آئے تو کسی ہاتھ میں پتھر نہ ملا

سارے دشمن مری گلیوں کی کمیں گاہ میں تھے
کوئی لشکر بھی مجھے شہر کے باہر نہ ملا

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدّر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

نظمِ میخانہ کچھ ایسا ہی رہا ہے کہ ہمیں
کبھی ساقی کبھی مینا کبھی ساغر نہ ملا

ہم ہی محروم تھے ایسے کہ فقط تُو ہی نہیں
ہم جسے ڈھونڈنے نکلے وہی اکثر نہ ملا

دیکھ پندار اُن آشفتہ سروں کا کہ جنہیں
بختِ منصور ملا، تختِ سکندر نہ ملا

اب جو تجدیدِ رفاقت ہے تو پھر ٹوٹ کے مل
دل ہے آئینہ تو پھر ہاتھ جھجک کر نہ ملا

لاکھ بے مہر سہی دوست تو رکھتے ہو فرازؔ
ان کو دیکھو کہ جنہیں کوئی ستمگر نہ ملا

شہر میں اب کوئی دیوانہ رہا ہو کہ نہ ہو
مرگِ انبوہ تو ہے جشن بپا ہو کہ نہ ہو

شورِ مستاں تو بہت ہے مگر اس فصل میں بھی
ہاتھ اٹھیں یا نہ اٹھیں چاک قبا ہو کہ نہ ہو

یادِ یاراں بہت آتی ہے مگر سوچتے ہیں
اب وطن میں کوئی اپنا بھی رہا ہو کہ نہ ہو

دل کو سوجھا تو ہے مضموں تری خوش قامتی کا
ہم سے کوتاہ بیانوں سے ادا ہو کہ نہ ہو

شکر کر اے دلِ احسان فراموش کہ تُو
درخورِ رنجشِ بے جا بھی رہا ہو کہ نہ ہو

آخری تیر شکاری کا مری گھات میں ہے
پھر مرے بعد کوئی نغمہ سرا ہو کہ نہ ہو

حیران ہوں خود کو دیکھ کر میں
ایسا تو نہیں تھا عمر بھر میں

وہ زندہ دلی کہاں گئی ہے
ہنستا تھا جب اپنے حال پر میں

آدابِ جنونِ عاشقی سے
ایسا بھی نہیں تھا بے خبر میں

واسوخت کبھی نہ میں نے لکھی
رویا بھی کبھی جو ٹوٹ کر میں

صیّاد پرست جو بھی سمجھیں
زنداں کو سمجھ سکا نہ گھر میں

تھا میرا گریز بھی تصادم
تھا دامِ عدو سے باخبر میں

یہ میرا چلن نہ تھا کہ رہتا
لب دوختہ و فتادہ سر میں

شُعلے کی طرح فصیلِ شب سے
نکلا ہوں حصار توڑ کر میں

سقراط نہ تھا پہ سچ کی خاطر
پیتا رہا زہر، بیشتر میں

منصور و مسیح گو نہیں تھا
ہر عہد میں تھا صلیب پر میں

گوتم کی طرح رِشی نہیں تھا
لیکن نکلا ہوں تج کے گھر میں

جب شہر دوکانِ شیشہ گر تھا
سب سنگ بدست تھے، مگر میں

اے شام کے آخری پرندے
میں بھی ترے ساتھ ہوں ٹھہر میں

تو بھی ہے مری طرح اکیلا
تنہا سفروں کا ہم سفر میں

ٹوٹا ہوا تیر تیرے دل میں
اور اپنے لہو میں تربتر میں

تُو میری طرح ہے بے نشیمن
اور تیری طرح ہوں بے شجر میں

O

بے نیازانہ ہمیشہ کی طرح ملتا ہے
اہلِ دل سے بھی وہ دنیا کی طرح ملتا ہے

کوچۂ یار میں حیراں ہوں کہ کس کو دیکھوں
ہر کوئی نقشِ کفِ پا کی طرح ملتا ہے

ہم وہاں ہیں کہ جہاں چشم کشائی کا صلہ
آنکھ کو زخمِ تماشا کی طرح ملتا ہے

ہر ستمگر کے محبت بھرے لہجے پہ نہ جا
کبھی صحرا بھی تو دریا کی طرح ملتا ہے

اب ہمیں خواہشِ درماں جو نہیں ہے تو فراز
جو بھی ملتا ہے مسیحا کی طرح ملتا ہے

ناخوش ہیں کبھی بُت، کبھی ناراض حرم ہے
ہم دل زدگاں کا نہ خدا ہے نہ صنم ہے

جو لکھ نہیں سکتا صفِ مژگاں پہ رقم ہے
"گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"

انصاف کہاں اب تو فقط فیصلہ ہو گا
میں پا بہ سلاسل، کفِ دشمن میں قلم ہے

ترکش کا گماں ہوتا ہے بسمل کے بدن پر
تیر اتنے لگے جسم کماں کی طرح خم ہے

یہ کیسی رفاقت ہے نہ ملنا نہ بچھڑنا
یہ کیسی وفا ہے کہ نہ تریاق نہ سم ہے

کیا مرگِ محبت کا ہُوا رنج تجھے بھی
اے زُود فراموش تری آنکھ بھی نم ہے

جھیلے ہیں جو دُکھ تُو نے فراز اپنی جگہ ہیں
پر تم پہ جو گزری ہے وہ اوروں سے تو کم ہے

قربت بھی نہیں دل سے اُتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحتِ جاں ہے مگر اس دربدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذّیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل، شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسہ بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فرازؔ اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

جہاں بھی جانا تو آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اُداس کر لانا

میں برف رُتوں میں چلا تو اس نے کہا
پلٹ کے آنا تو کشتی میں دُھوپ بھر لانا

بھلی لگی ہمیں خوش قامتی کسی کی، مگر
نصیب میں کہاں اس سرو کا ثمر لانا

پیام کیسا، مگر ہو سکے تو اے قاصد
کبھی کوئی خبرِ یارِ بے خبر لانا

فراز اب کے جب آؤ دیارِ جاناں میں
بجائے تحفۂ دل، ارمغانِ سر لانا

سپردگی شاخِ گُل کی، وحشت غزال کی ہو
جو اس طرح ہو تو دوستی پھر کمال کی ہو

ہجومِ اہلِ طلب ستادہ تھا جب وہ گزرا
مگر کسی نے جو عرضِ غم کی مجال کی ہو

کوئی تو ایسا ہو جس پر اس کا گمان گزرے
کہیں کہیں تو مشابہت خدّ وخال کی ہو

وہ چند سانسوں کے واسطے کیوں اَنا کو بیچے
کہ عمر بھر جس نے زندگی پائمال کی ہو

مری زمیں پستیوں سے مجھ کو پکارتی ہے
کوئی بشارت مرے خدا اب زوال کی ہو

ہے کون اپنی طرح کہ جس نے غمِ جہاں کے
ستم بھی جھیلے ہوں عاشقی بھی کمال کی ہو

غزل کہی تو لہو بدن سے نچڑ گیا ہے
کہ جیسے صحرائے مرگ، وادی خیال کی ہو

فرازؔ زندہ ہوں اب تلک میں تو شدتوں سے
کہ مر نہ جاؤں جو زندگی اعتدال کی ہو

اوّل اوّل کی دوستی ہے ابھی
اک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

میں بھی شہرِ وفا میں نو وارد
وہ بھی رُک رُک کے چل رہی ہے ابھی

میں بھی ایسا کہاں کا زود شناس
وہ بھی لگتا ہے سوچتی ہے ابھی

دل کی وارفتگی ہے اپنی جگہ
پھر بھی کچھ احتیاط سی ہے ابھی

گرچہ پہلا سا اجتناب نہیں
پھر بھی کم کم سپردگی ہے ابھی

کیسا موسم ہے کچھ نہیں کُھلتا
بوندا باندی بھی دھوپ بھی ہے ابھی

خود کلامی میں کب یہ نشّہ تھا
جس طرح رُوبرو کوئی ہے ابھی

قربتیں لاکھ خوبصورت ہوں
دُوریوں میں بھی دلکشی ہے ابھی

فصلِ گُل میں بہار پہلا گلاب
کِس کی زُلفوں میں ٹانکتی ہے ابھی

صبح نارنج کے شگوفوں کی
کس کو سوغات بھیجتی ہے ابھی

رات کس ماہ وش کی چاہت میں
شبنمستاں سجا رہی ہے ابھی

میں بھی کس وادیٔ خیال میں تھا
برف سی دل پہ گر رہی ہے ابھی

میں تو سمجھا تھا بھر چکے سبھی زخم
داغ شاید کوئی کوئی ہے ابھی

دُور دیسوں سے کالے کوسوں سے
کوئی آواز آ رہی ہے ابھی

زندگی کُوئے نامرادی سے
کس کو مُڑ مُڑ کے دیکھتی ہے ابھی

اس قدر کھچ گئی ہے جاں کی کماں
ایسا لگتا ہے ٹوٹتی ہے ابھی

ایسا لگتا ہے خلوتِ جاں میں
وہ جو اک شخص تھا وہی ہے ابھی

مدّتیں ہو گئیں فرازؔ مگر
وہ جو دیوانگی کہ تھی ہے ابھی

جب سب کے دلوں میں گھر کرے تُو
پھر کیوں ہمیں در بدر کرے تُو

یہ حال ہے شام سے تو اے دل
مشکل ہے کہ اب سحر کرے تُو

آنکھوں میں نشان تک نہ چھوڑے
خوابوں کی طرح سفر کرے تُو

اِتنا بھی گریز اہلِ دل سے
کوئی نہ کرے مگر کرے تُو

خوشبو ہو کہ نغمہ ہو کہ تارا
ہر ایک کو نامہ بر کرے تُو

جب تُو نہیں اس کا آشنا تک
کیوں ظلم فرازؔ پر کرے تُو

اندھیرا ہے تو تہمت شام پر نئیں
وہ میرا آتشیں رُخ بام پر نئیں

بہت سے ہمنوایانِ چمن نے
نظر دانے پہ رکھی دام پر نئیں

ہمیشہ سے وفا کارِ زیاں ہے
مگر اپنی نظر انجام پر نئیں

کبھی ایسی نہ تھی لیلائے فرقت
کوئی تارا قبائے شام پر نئیں

ہماری تشنگی کا حال دیکھو
نظر ساقی پہ ہے، لب جام پر نئیں

محبت زندگی بھر کا سفر ہے
کوئی منزل یہاں دو گام پر نئیں

یہ دل مائل ہے اک سادہ ادا پر
کسی مہوش، کسی گلفام پر نہیں

خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ دیکھیں
یہ بستی اب ہمارے نام پر نہیں

دوکانِ مے فروشاں میں مقدّم
شکستِ دل، شکستِ جام پر نہیں

بیادِ فیض

قلم بدست ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دنیا کا تذکرہ لکھوں

لکھوں کہ تُو نے محبت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں

جہاں یزید بہت ہوں، حسینؓ اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمیں کو بھی کربلا لکھوں

ترے بغیر ہے ہر نقش "نقشِ فریادی"
تو پھول "دستِ صبا" پر ہے آبلہ لکھوں

مثالِ "دستِ تہہِ سنگ" تھی وفا ان کی
سو کس طرح انہیں یارانِ باصفا لکھوں

حدیثِ کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو قصۂ تعزیرِ ناروا لکھوں

جگہ جگہ ہیں "صلیبیں مرے دریچے میں"
سو اسمِ عیسیٰ و منصور جا بجا لکھوں

گرفتہ دل ہے بہت "شامِ شہریاراں" آج
کہاں ہے تُو کہ تجھے حال دلبرا لکھوں

کہاں گیا ہے "مرے دل مرے مسافر" تُو
کہ میں تجھے رہ و منزل کا ماجرا لکھوں

تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے "نسخہ ہائے وفا"
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
خدا نکردہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

ساقیا تُو نے تو میخانے کا یہ حال کیا
رند اب محتسبِ شہر کے گُن گاتے ہیں

طعنۂ نشّہ نہ دو سب کو کہ کچھ سوختہ جاں
شدّتِ تشنہ لبی سے بھی بہک جاتے ہیں

جیسے تجدید تعلّق کی بھی رُت ہو کوئی
زخم بھرتے ہیں تو غمخوار بھی آ جاتے ہیں

احتیاط اہلِ محبت کہ اسی شہر میں لوگ
گُل بدست آتے ہیں اور پابہ رسن جاتے ہیں

سنگ دل ہے وہ تو کیوں اس کا گلہ میں نے کیا
جبکہ خود پتھر کو بُت، بُت کو خدا میں نے کیا

کیسے نامانوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا

وہ مری پہلی محبت وہ مری پہلی شکست
پھر تو پیمانِ وفا سو مرتبہ میں نے کیا

ہوں سزاوارِ سزا کیوں جب مقدّر میں مرے
جو بھی اس جانِ جہاں نے لکھ دیا میں نے کیا

وہ ٹھہرتا کیا کہ گزرا تک نہیں جس کے لیے
گھر تو گھر ہر راستہ آراستہ میں نے کیا

مجھ پہ اپنا جرم ثابت ہو نہ ہو لیکن فرازؔ
لوگ کہتے ہیں کہ اس کو بے وفا میں نے کیا

پردیس میں جاتے سال کی آخری رات

جاتے سال کی آخری شب ہے
چہل چراغ کی روشنیوں سے
بادۂ گلگوں کی رنگت سے
جگر جگر کرتے پیمانے
جیسے جاتے سال کی گھڑیاں
پون سے دیپ کی آخری قُربت
جیسے دید کی آخری ساعت
جلتی بجُھتی سی پھلجھڑیاں
آؤ آخری رات ہے سال کی

دل کہتا ہے شوق وصال کی

سب شمعیں ساری خوشبوئیں

تن من میں رس بس جانے دو

دیکھو آج کی رات ستارے

گُم صُم ہیں آکاش کنارے

جاگ رہے ہیں سوچ رہے ہیں

جاتے سال کی آخری شب ہے

کل کا سورج کیسا ہو گا

گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چُپ رہا ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے

یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب، آشنا کے ہوتے ہوئے

وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے

نہ چاہنے پہ بھی تجھ کو خدا سے مانگ لیا
یہ حال ہے دِل بے مدّعا کے ہوتے ہوئے

نہ کر کسی پہ بھروسا کہ کشتیاں ڈوبیں
خدا کے ہوتے ہوئے ناخدا کے ہوتے ہوئے

مگر یہ اہلِ ریا کس قدر برہنہ ہیں
گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے

کِسے خبر ہے کہ کاسہ بدست پھرتے ہیں
بہت سے لوگ سروں پر ہُما کے ہوتے ہوئے

فراؔز ایسے بھی لمحے کبھی کبھی آئے
کہ دل گرفتہ رہا دلرُبا کے ہوتے ہوئے

شام اور قریۂ ملال کی شام
تارا تارا ہوئی خیال کی شام

پھر وہی دردِ انتظار کی آگ
پھر وہی وعدۂ وصال کی شام

یادِ یارانِ زود رنج کے زخم
پُرششِ حال و اندمال کی شام

تُو نہ دیکھے مرے جنوں کا زوال
میں نہ دیکھوں ترے جمال کی شام

ایک تیمار دار کیا آیا
مہک اُٹھی ہے ہسپتال کی شام

اے خدا کوئی صبحِ آسودہ
اے خدا کوئی اعتدال کی شام

بھولتی ہی نہیں فراؔز مجھے
اس کے آنے کے احتمال کی شام

ابو جہاد

ابو جہاد مرا دل لہو لہو ہے مگر
معاف کر کہ ترے دشمنوں کے ساتھ ہیں ہم
ترا جنوں ترا ایثار محترم لیکن
جو سچ کہوں تو ترے قاتلوں کے ساتھ ہیں ہم

ہمی تو ہیں وہ ستمگر کہ مصلحت جن کی
دراز دستیِ قاتل کا دل بڑھاتی ہے
ہم اس قبیلۂ عشاق سے نہیں کہ جنہیں
ندیمِ دوست سے خوشبوئے دوست آتی ہے

جو تیرے دل میں تپکتا تھا آبلے کی طرح
وہی تو دُکھ ہے جو چھالا مری زبان کا ہے
ہم اک سناں کے ہدف ایک تیر کے بسمل
اگر ہے فرق تو بس ہاتھ یا کمان کا ہے

تُو دشتِ بے وطنی میں لہو لہان ہوا
ہم اپنے گھر میں ہی سینہ فگار پھرتے ہیں
غلام گردشِ زنداں سے صحنِ مقتل تک
ابھی رسن بہ گلو میرے یار پھرتے ہیں

وہ جس نے خون اچھالا ترے شہیدوں کا
اُسی کی تیغ ہمارے سروں پہ چمکی ہے
وہی تو ایک ہے جلّاد جس کے ہاتھوں نے
ہر اک چراغ سے چہرے کی لو قلم کی ہے

ابو جہاد ہمارا جہاد ایک سا ہے
وہ سرزمین تری ہو کہ سرزمیں میری
رہِ وفا میں ترا خوں بہے کہ میرا لہو
دریدہ ہو ترا دامن کہ آستیں میری

چلیں گے ساتھ رفاقت کے پرچموں کے لیے
جہاں جہاں سے بھی ساتھی ہمیں پکاریں گے
اگر ہے دشنہ و خنجر زبان قاتل کی
تو ہم بھی حرفِ وفا کی زرہ سنواریں گے

لگی ہے آگ پر کوئی بھی گھر نئیں
ابھی تک جلنے والوں کو خبر نئیں

عجب نقشہ ہے شہرِ بے اماں کا
کسی کا سر کسی کے دوش پر نئیں

یہ بیگانہ روی ہے ہمرہوں میں
مسافر کو مسافر کی خبر نئیں

ہوا کی سلطنت میں کیا بھروسا
چراغِ جاں اُدھر ہے اور اِدھر نئیں

پرندوں کو رہائی مل چکی ہے
اگر ہو جرأتِ پرواز، پر نئیں

کوئی احسان چشمِ یار پر نئیں
ہم اس کے ہیں مگر اس کو خبر نئیں

عجب نشّہ ہے مستانہ روی میں
خیالِ منزل و زادِ سفر نئیں

محبت اپنا اپنا تجربہ ہے
یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نئیں

بہت سے خوبصورت لوگ دیکھے
مگر ایسا ہے تجھ کو دیکھ کر نئیں

فرازؔ اس کی گلی سے پھر نہ آیا
وہ دیوانہ سہی پر در بدر نئیں

نہ سہہ سکا جب مسافتوں کے عذاب سارے
تو کر گئے کُوچ میری آنکھوں سے خواب سارے

بیاضِ دل پر غزل کی صورت رقم کیے ہیں
ترے کرم بھی، ترے ستم بھی، حساب سارے

بہار آئی ہے تم بھی آؤ ادھر سے گزرو
کہ دیکھنا چاہتے ہیں تم کو گلاب سارے

یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے اُلجھ پڑے ہم
یہ واقعہ ہے کہ پی رہے تھے شراب سارے

بھلا ہُوا ہم گناہگاروں نے ضد نہیں کی
سمیٹ کر لے گیا ہے ناصح ثواب سارے

فرازؔ کس نے مرے مقدّر میں لکھ دیے ہیں
بس ایک دریا کی دوستی میں سراب سارے

اماں مانگو نہ ان سے دِلفگاراں ہم نہ کہتے تھے
غنیمِ شہر میں چابک سواراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں نے تو فقط ملبوس چھینے تھے درختوں سے
صلیبیں بھی تراشے گی بہاراں ہم نہ کہتے تھے

ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہرِ نگاراں ہم نہ کہتے تھے

جہاں میلہ لگا ہے ناصحوں کا غمگساروں کا
وہی ہے کوچۂ بے اعتباراں ہم نہ کہتے تھے

پسِ زنداں کوئی ہو گا سرِ مقتل کوئی ہو گا
بنے گی اس طرح تصویرِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

فرازؔ اہلِ ہوس نے شہر دشمن ہم کو ٹھہرایا
خطا یہ تھی کہ مدحِ شہر یاراں ہم نہ کہتے تھے

کل رات ہم سخن کوئی بُت تھا خدا کہ میں
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دل نے کہا کہ میں

تھا کون جو گرہ پہ گرہ ڈالتا رہا
اب یہ بتا کہ عقدہ کشا تُو ہوا کہ میں

جب سارا شہر برف کے پیراہنوں میں تھا
ان موسموں میں لوگ تھے شُعلہ قبا کہ میں

جب دوست اپنے اپنے چراغوں کے غم میں تھے
تب آندھیوں کی زد پہ کوئی اور تھا کہ میں

جب فصلِ گُل میں فکرِ رفو اہلِ دل کو تھی
اس رُت میں بھی دریدہ جگر تُو رہا کہ میں

کل جب رُکے گا بازوئے قاتل تو دیکھنا
اے اہلِ شہر تم تھے شہیدِ وفا کہ میں

کل جب تھمے گی خون کی بارش تو سوچنا
تم تھے عدو کی صف میں سرِ کربلا کہ میں

پیشہ ور گواہوں کی اور بھی مثالیں تھیں
مجھ کو قتل کرنے میں منصفوں کی چالیں تھیں

آدھی رات بستی میں نقب زن جب آئے تھے
جھانجھریں تھیں پاؤں میں ہاتھ میں کدالیں تھیں

سادہ دل تماشائی پھر فریب کھا بیٹھے
بھیڑیوں کے جسموں پر ہرنیوں کی کھالیں تھیں

کچھ درخت ایسے تھے فصلِ گُل میں بھی جن پر
زرد زرد پتّے تھے خشک چھالیں تھیں

اپنا دار پر کھنچنا کیوں لگا عجب سب کو
کشتگانِ شب کی تو اَن گنت مثالیں تھیں

خونِ بے گناہاں کو جب بھی بیچ کر آئے
دوستوں کے شانوں پر زرنگار شالیں تھیں

بہت سیرِ گُل اے صبا کر چلے
یہاں تک کہ دل کو قبا کر چلے

وہ تیری گلی تھی کہ شہرِ عدو
جدھر بھی گئے سر اٹھا کر چلے

جو احوال اپنا ہُوا سو ہُوا
عبث دوستوں کو خفا کر چلے

یہ محفل تری، اہلِ محفل ترے
ہمارا تھا کیا ہم تو آ کر چلے

یہ کیا آج چارہ گروں کو ہُوا
دوا کی بجائے دُعا کر چلے

نوا سنج سارا قفس ہے فرازؔ
یہاں تک تو ہم بے نوا کر چلے

جو حرفِ حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا

ہمی کو اہلِ جہاں سے تھا اختلاف، سو ہے
ہمی نے اہلِ جہاں کا ستم سہا سو سہا

جسے جسے نہیں چاہا اُسے اُسے چاہا
جہاں جہاں بھی مرا دل نہیں رہا سو رہا

نہ دوسروں سے ندامت نہ خود سے شرمندہ
کہ جو کیا سو کیا اور جو کہا سو کہا

یہ دیکھ تجھ سے وفا کی کہ بے وفائی کی
چلو میں اور کہیں مبتلا رہا سو رہا

ترے نصیب اگر جا لگے کنارے سے
وگرنہ سیلِ زمانہ میں جو بہا سو بہا

شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فرازؔ
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

ہچ ہائیکر

میں کہ دو روز کا مہمان ترے شہر میں تھا
اب چلا ہوں تو کوئی فیصلہ کر بھی نہ سکوں
زندگی کی یہ گھڑی ٹوٹتا پل ہو جیسے
کہ ٹھہر بھی نہ سکوں اور گزر بھی نہ سکوں

مہرباں ہیں تری آنکھیں مگر اے مونسِ جاں
ان سے ہر زخمِ تمنّا تو نہیں بھر سکتا
ایسی بے نام مسافت ہو تو منزل کیسی
کوئی بستی ہو بسیرا ہی نہیں کر سکتا

ایک مُدّت ہوئی لیلائے وطن سے بچھڑے
اب بھی رِستے ہیں مگر زخم پرانے میرے
جب سے صرصر مرے گلشن میں چلی ہے تب سے
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

آج اس شہر کل اُس شہر کا رستہ لینا
"ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے"
یہ سفر اتنا مسلسل ہے کہ تھک ہار کے بھی
"بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے"

تو بھی ایسا ہی دل آرام شجر ہے جس نے
مجھ کو اس دشتِ قیامت سے بچائے رکھا
ایک آشفتہ سر و آبلہ پا کی خاطر
کبھی زلفوں کبھی پلکوں کو بچھائے رکھا

دکھ تو ہر وقت تعاقب میں رہا کرتے ہیں
یوں پناہوں میں کہاں تک کوئی رہ سکتا ہے
کب تلک ریت کی دیوار سنبھالے کوئی
وہ تھکن ہے کہ مرا جسم بھی ڈھ سکتا ہے

اجنبی شہر نئے لوگ پرائی گلیاں
زندگی ایسے قرائن میں کٹے گی کیسے
تیری چاہت بھی مقدّس تری قربت بھی بہشت
دیس پردیس کی تفریق گھٹے گی کیسے

ناگزیر آج ہُوا جیسے بچھڑنا اپنا
کل کسی روز ملاقات بھی امکان میں ہے
میں یہ پیراہنِ جاں کیسے بدل سکتا ہوں
کہ ترا ہاتھ مرے دل کے گریبان میں ہے

سب آوازیں میری ہیں

یوسف جمال کے نام

گریزد از صفِ ما، ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد، از قبیلۂ ما نیست

ترتیب

حرفِ سادہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب فیض صاحب علامہ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ فیض صاحب سے بے پناہ عقیدت کے باوجود کسی حد تک میں بے تکلف بھی تھا ایک روز میں نے ان سے عرض کیا کہ ''آپ ان تراجم میں اپنا وقت کیوں صرف کر رہے ہیں۔ یہ کام تو دوسرے لوگ بھی انجام دے سکتے ہیں' آپ کے بے شمار مداح اور عقیدت مند آپ کی تازہ تخلیقات کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ اگر کوئی کہیں سے آپ کا نیا شعر یا مصرع سن لے تو بطور سوغات دوسرے شہروں اور دوستوں تک پہنچانے کے لیے بے قرار رہتا ہے'' فیض صاحب نے ہمیشہ کی طرح مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کیا تم پر کبھی شعر گوئی میں barren Period نہیں گزرا بانجھ پن کا ایسا وقت جو بعض اوقات مہینوں پر پھیل جاتا ہے۔'' میں نے عرض کیا'' کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ طویل عرصہ تک مصرع بھی نہیں کہا۔'' تو پھر زمانے میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے جنگ ہو نہ ہو سپاہی کو اپنے ہتھیار صیقل رکھنے چاہئیں۔''

''سب آوازیں میری ہیں'' کے تراجم محض تخلیقی ہتھیاروں کو صیقل رکھنے کی غرض سے ہی نہیں کئے گئے بلکہ کچھ اور محرکات بھی تھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں خود انہی حالات سے گزر رہا ہوں جن سے بیشتر افریقی جلاوطن شاعر دوچار ہیں اور اپنی سرزمین سے دور اپنے لوگوں کی انقلابی جدوجہد میں قلمی حوالے سے شریک ہیں۔ دوسرا سبب یہ کہ پاکستان اور جنوبی افریقہ کے تاریخی اور سیاسی کوائف مختلف ہوتے ہوئے بھی کئی طرح کی مماثلت رکھتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نے جس ظلم اور ڈھٹائی سے مقامی سیاہ فام اکثریت کو انسانی توقیر اور حقوق سے محروم کر رکھا ہے اسی طرح پاکستان میں فوجی آمریت نے بھی ظالمانہ اور غاصبانہ رویہ سے اپنے ہی لوگوں کو محکوم بنا رکھا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں بندوق کی لبلبی پر گوری انگلیوں کی جنبش حریت پرستوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور پاکستان میں جمہوریت پسند دانشوروں سیاسی کارکنوں صحافیوں اور طلبہ کا لہو زمین کا رزق بن رہا ہے۔ غالباً یہی بنیادی وجہ ہے کہ افریقی شاعری موضوعات کی حیرت انگیز مماثلت کے سبب پاکستان کے حالات کی بھی عکاس معلوم ہوتی ہے۔

ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ جنوبی افریقہ کی بڑی اور سچی شاعری کو اردو طبقہ سے بالعموم اور پاکستان کے ادیبوں شاعروں سے بالخصوص روشناس کرایا جائے۔ ساتھ ہی یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ جب خلقِ خدا ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہو اور لوگ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جانیں تک قربان کر رہے ہوں تو لکھنے والوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس تناظر میں ان کا کیا کردار ہونا چاہیے۔

میں اپنے مختصر پیش لفظ کو افریقی ادیب کے اس جملہ پر ختم کرتا ہوں ''صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے۔''

احمد فراز

لندن

شاعر کا پرچم

وہ کہتے ہیں
باآبرو شاعری کرو
جن سے ان کی سفّاکیاں خوشنما لگیں
مکروہ منظر تصویر دکھائی دیں
غلیظ آنتیں روشنی کی لکیریں نظر آئیں
خون کی شراب
اور موت کو نیند سے تعبیر کرو
وہ شاعر سے پھولوں کے ہار مانگتے ہیں
تاکہ ان کی گولیوں سے چھلنی ہونے والوں کی
قبریں سجائی جاسکیں
وہ لفظوں کے معطّر گلدستے چاہتے ہیں
تاکہ تعفّن پر خوشبو کی چادر ڈال دی جائے
وہ چاہتے ہیں
کہ لوگوں کے احتجاج کو

شعر کے منقش گنبدوں میں دفنا دیا جائے
ان کی خواہش ہے
کہ انسانوں کی دردناک چیخوں پر
موسیقی کی تانیں حاوی ہو جائیں
اونچے سُروں والے ساز بجائیں
جن میں
بے دردی سے قتل ہونے والوں کی کراہیں
دب جائیں
وہ چاہتے ہیں
کہ شاعر پنجرے میں بند ہو کر خوش نوائی کرے
عبادت گاہوں (کلیساؤں) میں گانے والوں کے
طائفہ کا خواجہ سرا بن جائے
اپنے غیض و غصے کو
چاندی کی چھنکتی ہوئی زنجیروں سے اسیر کر دے
ہم یہ سب نا قبول کرتے ہیں
ہمیں بدصورت ہونا گوارا
مگر
ہم آزادی سے قبروں کو کھود کر
لاشیں دکھائیں گے

ہم سڑاند سے (خوشبوؤں کے) غلاف
نوچ پھینکیں گے
ہم اپنے شہیدوں کی انتڑیوں کو
اپنے پرچموں میں لپیٹیں گے
اگر ہم نے پھریرے ہی اٹھانے ہیں
تو پھر ان کا رنگ عنابی ہونا چاہیے

David Evans

If Poets Must Have Flags

ہماری ماؤں کو فراموش مت کرو

ہماری ماؤں کو فراموش مت کرو
جو ایک متعین صبر کے ساتھ
ہمارا انتظار کر رہی ہیں
ہمارے آبا کو مت بھولو
جو جیلوں میں سڑ رہے ہیں
اور کانوں میں گُھل رہے ہیں
ہمارے بچوں کو اپنی یادوں سے دُور نہ رکھو
جن کے بدن
گلیوں میں دم توڑ رہے ہیں
اب انتقام کا ہاتھ بلند ہو چکا ہے
اور ہم
مزید یقین کے ساتھ

اعادہ کرتے ہیں

کہ افریقہ آزاد ہوگا

ہم اسے آزاد کرائیں گے

Ilva Mackary

Forget Not Our Mother

جلاوطنی

مجھے جلاوطن کہیں
خانہ بدوش سمجھیں
یا شوریدہ سر شاعر مانیں
(جو بھی کہیں)
میں ایک خاموش طبع اور مرنجاں مرنج انسان ہوں
اپنی غیر مرئی رفتار سے گامزن
اپنے منصوبوں میں مگن
غلامی کی حد تک خوش خلق
لیکن پھر بھی
کبھی کبھی ماتمی نوحے
میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں
میری خاموش آنکھوں کے پیچھے

میرے سر میں
سائرن اور انسانی چیخوں کی آوازیں
گونجنے لگتی ہیں

Dennis Brutus

I Am The Exile

آوازیں

پھر آوازیں آنی شروع ہوگئیں
رات گئے سائرن کی گونج
دروازوں پر مکّوں کی دھمک
اور رگوں میں درد کی ہُوک
پھر آوازیں آنے لگیں
بے الفاظ
لامتناہی نوحہ
(جسے کوئی قیدی ہی سمجھ سکتا ہے)
مدھم سے پنچم کی سمت
دھیرے دھیرے بلند ہوتا جاتا ہے
میرے ہمزاد
ضدی بارش کی طرح
اپنے دکھ آہوں کی صورت میں اگلنے لگتے ہیں
سائرن کی گونج

ہڈیوں کے ٹوٹنے کی چٹخار
اور فوجی بوٹوں کی چاپ
پھر وہی آوازیں آنے لگیں

Dannis Brutus

The Sound Begin Again

شاعر اور گوریلا

ایمسٹرڈیم میں تارک الوطن حریت پسند نہایت محتاط اور خفیہ طور پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ایک گوریلا ایک شاعر ساتھی کا ہاتھ تپاک سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے' مفارقت زدہ لوگ جنہیں سیاسی حالات نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ایک اجنبی ملک میں دوبارہ یکجا ہوتے ہیں۔

پہلی آواز:

سوال یہ ہے کہ لوگ جو اپنی سرزمین کی آزادی کے لیے بندوق اٹھاتے ہیں اور وہ جو پھولوں' محبت یا جنگ ہی سے متعلق نظمیں لکھتے ہیں کیا وہ ایک ہی خمیر رکھتے ہیں۔یا وہ ساخت، پرداخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دوسری آواز:

شاعر کا کام خواہ وہ جنگ کی حالت ہی کیوں نہ ہو قلمی کاوشوں تک محدود ہوتا ہے۔ایسی جنگ جو شاعر کو نغمہ سازی پر نہ اکسائے ایک بے مقصد محاذ آرائی کے مترادف ہے۔

تیسری آواز:

تمام انسان شاعر ہوتے ہیں
تمام شاعر انسان ہوتے ہیں

ادھر دور کہیں خون آلودہ جھاڑی میں دو حریت پرست زخموں سے چور زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہیں ان میں سے ایک جب بمشکل سانس لیتا ہے تو درد کی تپش اس کے وجود کو یوں جھلسا دیتی ہے جیسے نیپام اردگرد کے علاقے میں آگ بکھیر دیتا ہے۔ ایک ایسی آگ جسے فنا ہی بجھا سکتی ہے۔ اسی لیے وہ مرنا چاہتا ہے جتنی بھی جلدی ہو سکے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے اس جانکنی کے عذاب سے نہایت سست روی اور بے توقیری کے ساتھ گزرنا پڑے گا اس کے نوعمر ساتھی کو اپنے دوست کی جانکنی نہایت بے بسی سے دیکھنا پڑے گی۔

سنو خون اگلتے ہوئے منہ کی آواز

ساتھی:

مجھے ختم کر دو۔ مجھے فوراً ختم کر دو

(ادھر لندن کے ایک بلند بام فلیٹ میں ایک شاعر نے آخری الفاظ لکھ کر اپنی نظم کو تکمیل دے دی)

پہلی آواز:

یہ نہ بھولو کہ ہم جنگ لڑ رہے ہیں

دوسری آواز:

مگر ہم جنگ کیوں لڑ رہے ہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے۔

تیسری آواز:

اور یہ بھی نہ بھولو

ایک مرتبہ پھر دم توڑتا ہوا حریت پرست اپنے ساتھی سے رحم کی سزا کا تقاضا کرتا ہے۔

مجھے ختم کردو۔ ساتھی مجھے دشمنوں کے لیے زندہ مت چھوڑو۔

پہلی آواز:

ہم ایمسٹرڈیم لندن اور نیو یارک میں کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے قلم یہاں محض سیاہی رو ہیں جبکہ دوسروں کے جسم خون اگل رہے ہیں۔ وہ زندگیاں قربان کر رہے ہیں اور ہم گفتگوؤں میں مصروف ہیں۔

یہاں محض الفاظ کی بوندا باندی
اور وہاں گولیوں کی مسلسل بارش

دوسری آواز:

لفظ کی برکتیں اور شعر کی تہذیب سے محروم جدوجہد سفاکیت کے مترادف ہوتی ہے۔

پہلی آواز:

جدوجہد کی پشت پناہی بغیر لفاظی محض ہوا ہے۔ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کی

طرف سے جو قرض واجب ہے شاعر کو اس کی آگہی ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا سب شور و غوغا گھومتے ہوئے پنکھے کی بے معنی آواز کے سوا کچھ بھی نہیں۔

دوسری آواز:

شاعر اپنے فرض سے غافل نہیں وہ رفتہ اور آئندہ سے آگاہ ہے، لمحۂ موجود کا مطیع اور ساعتِ گزشتہ کا غلام ہوئے بغیر اپنی نغمہ گری جاری رکھتا ہے۔ اس گوریلا کے مصداق جو اپنے دشمن پر بندوق تان تو سکتا ہے لیکن اسے ہلاک نہیں کر سکتا۔ اس کی انگلی لبلبی پر ہے مگر لبلبی دبا نہیں سکتا۔ وہ اپنے حریف کو پہچان لیتا ہے جس کی بہن سے اس نے لڑکپن میں شدت سے محبت کی تھی ان موسموں میں جب خوبصورت اور لانبی دُم والے پرندے اپنی چونچوں کو پانیوں میں ڈبوتے ہیں۔

پہلی آواز:

ایسی شاعری کا کیا فائدہ
ایسے رحم کی کیا ضرورت
مختصر یہ کہ اصلی زبان بندوق اور پیغام فنا ہے
باقی سب بکواس بیل کا مُوت

تیسری آواز:

شاعر اور لفظ
سیاہی اور بندوق
جد و جہد میں دونوں کو ہمقدم اور دوش بدوش ہونے کی ضرورت ہے۔

ائرکنڈیشنڈ کانفرنس ہال سے باہر ایمسٹرڈیم افریقہ کی طرح تپ رہا ہے۔
یہاں لوگ سورج مکھی کے پھولوں کی طرح جھلس رہے ہیں۔ لیڈن جاتے ہوئے
دونوں اطراف پر لالے کے رنگا رنگ پھول قطار اندر قطار اپنی خوشبوؤں سے مست و
رقصاں وین گاف کے نام پر اپنی عقیدتیں نچھاور کر رہے ہیں۔

(یہاں کسی بندوق چلنے کی آواز فضا میں نہیں تھرتھراتی)

ادھر دور خون سے لت پت کسی جھاڑی میں ایک زخمی حریت پرست دم توڑ چکا
ہے۔ اس کی نزع اور فتح دونوں کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن آنے والے برسوں میں اس
کے زندہ بھائیوں کے انتظار میں کون ہے؟

پہلی آواز:

جنگ میں شاعر کو اپنے جیالوں کی جانثاری کے ترانے گانے چاہئیں۔ بس
گیت کی یہی مقصدیت ہونی چاہیے۔

دوسری آواز:

نہیں صرف ایسے گیت جو جنگ کا مقصد اور جواز بتائیں اس کا موضوع ''یہ
جنگ کس کے لیے ہے'' ہونا چاہیے۔

تیسری آواز:

جب ماؤ اور چے نے بندوق اٹھائی تب شاعر اور سپاہی نے لفظ اور گولی کو
ہمزبان کر دیا۔

ایمسٹرڈیم میں سیاسی تارکین وطن جب ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو

گوریلا، شاعر کا ہاتھ تپاک سے تھام لیتا ہے۔

افریقہ انتظار میں ہے
گولی اور حرف کے یکجان ہونے کا
گولی اور حرف کے ہم زبان ہونے کا
افریقہ انتظار میں ہے

ھالینڈ کا ایک خوبصورت مقام جو گل لالہ کے افراط کے لیے مشہور ہے

Poet and Guerrilla

آج جیل خانے میں

آج جیل خانے میں
ایک خاموش عہد کے تحت
ہم قیدیوں کو ایک گیت گانے کی اجازت ہے

افریقہ سلامت رہے
صرف ایک گیت
کم آہنگی اور متانت کے ساتھ
جذبوں پر ضبط کے بند باندھ لو
احساسات کی لو نیچے رکھے رہو
قیدی توانا مگر استوار آوازوں میں گاتے ہیں
افریقہ تیری خیر ہو
آنکھوں کے پیچھے
دل کی گہرائیوں سے امڈے نکیلے آنسو
بے ٹھکانہ پرندے کی وحشت کی طرح

کوئی نام مقام ڈھونڈ تے ہیں

جن پر قیام کر سکیں

ان کارناموں کا ذکر

جو وہ انجام دے چکے

ان مرحلوں کا تذکرہ

جن سے گزر رہے ہیں

اُن مُرادوں کی فہرست

جن کے حصول کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے

آج جیل خانے میں

ہمیں ایک گیت گانے کی اجازت ہے

Dennis Brutus

Today in Prison

نوحہ

(ایک افریقی حریت پرست رہنما ڈیوما نوکاوی کی موت پر)

میت کی رسومات کے دوران
دیوانگی کے عالم میں
اگر ہم نے یہ محسوس کیا
کہ تیری موت نے ہمیں تنہا کر دیا ہے
تو ہم یہ معمول کا ماتمی گیت
"اے چمکتے سورج
اے نیلے آسمان
ہماری نظروں سے اوجھل ہو جا"
ضرور گائیں
لیکن اے ڈیوما
ہمارے مشکل دنوں کے شہید بیٹے!
جس امن اور مساوات کے حصول کے لیے

تُو زندہ رہا
اگر وہ ہمیشگی اور تسلسل کے ساتھ
ہمارے وجود میں موجود ہے
تو ہم تیری موت پر کیسے آنسو بہا سکتے ہیں
تیرا نام جس کا تعارف ہمارے خون کے چھینٹوں سے
ہو چکا ہے
وہ تیرے پیکر سے بہت پہلے
ظہور میں آ چکا تھا
تاکہ ہمیں بتائے
کہ نسل پرست زانیوں
اور سونے کے دانتوں والے
غاصبوں کی بدبودار اور دھنسی ہوئی قبروں پر
قدم رکھتی ہوئی
مزدور کی صبح طلوع ہو رہی ہے
ڈیوما
میری مٹی کے لال!
تیرا جسم ہمیں چھوڑ گیا ہے
اور بہت جلد چھوڑ گیا ہے
بے شک

یہ ایک سرحد ہے
مگر تُو نے تو ہمیں بتایا تھا
کہ سرحدیں اور سمندر
انسانوں کو جسمانی طور جدا کرتے ہیں
ورنہ ایسی جدائی
کسی دکھ کے بغیر وجود میں نہیں آتی
بچی نے کہا
کہ بعض لوگ مر کر
فنا ہونے کی بجائے
دوسروں میں منتقل ہو کر
اپنی زندگی اور فتح پا لیتے ہیں
اور پھر وہ
سب ناموں میں زندگی بسر کرتے ہیں
اور یہ ایسا ہے
کہ زندگی کے لیے جان تج دینا
زیست کو موت سے زیادہ یقینی بنا دیتا ہے
تمہارا نام بھی
ماؤں کے رحم سے زمین کی کوکھ تک
اور جانبازوں کے بازوؤں سے

مزدوروں کے ہاتھوں تک
زندگی کے دوامی تسلسل کی علامت رہے گا
اگر مردم آزار کج روشکاری کتے کہتے ہیں
کہ وہ ہمیں تڑپا تڑپا کر مار دیں گے
انہیں کہنے دو
ان کے واہمے خود ان کی کھوپڑیوں میں
شگاف ڈال دیں گے
انہیں ان واہموں میں رہنے دو
وہ ہمارے سروں کے کاسے چور کر دیں گے
بجا
وہ ہماری ہڈیوں کو سرمہ بنا دیں گے
درست
مکتبوں اور عبادت گاہوں کے ذریعے
وہ ہمارے نوخیز ذہنوں کو
گمراہ بنا دیں گے
تسلیم
لیکن
ہمیں یقین ہے
کہ ہمیشہ کے لیے روتے رہنا

ہمارا مقدر نہیں

ان بے لگام درندوں کی سفاکیت

ہمیں مطیع نہیں کر پائے گی

ہم نو دمیدہ شاخیں نہیں

پھر بھی تمہاری امن پرستی اور انسان دوستی

ہمیں توانا بنائے گی

ڈیوما! میری ماٹی کے سپوت!

اس دھرتی پر ایسے وجود ہوتے ہیں

جو اپنے بعد بھی

ان گنت لوگوں میں موجود رہتے ہیں

تم ہمیشہ ہم میں زندہ رہو گے

سب نام تمہارے نام ہیں

ہمارا ایمان ہے

کہ زندگی کے لیے مرنا

زندگی کو موت سے زیادہ یقینی اور معتبر بنا دیتا ہے

اے شاعر!

اُسے تنہا رہنے دے

تم نے اس کی چاہت کا گیت گا لیا

اگر تم پہاڑوں جیسا بوجھ ڈھوتے مزدوروں

کی مدح کرو گے

تو یہ اُسی کی تعریف ہو گی

اگر تم انسان کی تکریم کی بات کرو گے

تو یہ اُسی کا قصیدہ ہو گا

اگر تم آزادی کا ترانہ گاؤ گے

تو یہ اُسی کا رجز ہو گا

اگر تم امن کا نغمہ سناؤ

تو یہ اُسی کا گیت ہو گا

شاعر

تم نے اُس کا نام جانے بغیر

اس کا قصیدہ پڑھا

سنو میں تمہیں اس کا نام بتاؤں

اس کا نام ایک نعرہ ہے

''افریقہ واپس آؤ''

آؤ نظمیں لکھیں

آؤ نظمیں لکھیں
خون کی مانند سرخ تروتازہ
گھنٹیوں کی طرح کھنکتی ہوئی
نظمیں
جو لوگوں کو جگائیں
جن کا موضوع
زندگی ہو موت نہیں
امید ہو مایوسی نہیں
صبح ہو شام نہیں
تازگی ہو پژمردگی نہیں
جدوجہد ہو ہزیمت نہیں
شاعر!
لوگوں کو یقین دلاؤ
کہ خواب بھی حقیقت بن سکتے ہیں
آزادی کی بات کرو

اور دھنواں کو
اس کے معطر خلوت خانے کی دیواروں پر
فن پارے سجانے دو
آزادی کی بات کرو
اور لوگوں کی آنکھوں کو چھو کر
انہیں احساس دلاؤ
کہ ان میں بے شمار ہونے کی قوت موجود ہے
وہ قوت
جو قید خانوں کی سلاخوں کو
گھاس کی بالیوں کی طرح مروڑ دیتی ہے
جو سنگ خارا کی دیواروں کو
کانچ کی طرح ریزہ ریزہ کر دیتی ہے
شاعر
ان لوگوں کو ڈھونڈو
جو قفلوں کے دہانے کھول دیتے ہیں
اس سے پہلے
کہ آنے والے دس برسوں کو
گزرے ہوئے دس برس کھا جائیں

A.N.C. Kumalo

Red Our Colour

کیا میں غلط تھا

کیا میں غلط تھا

جب میں نے سوچا تھا

ہم سب کا انتقام لیں گے

کیا میں غلط تھا

جب میں نے سوچا تھا

جس نے نوخیز بیلوں کی گردنوں کو جکڑ رکھا تھا

انتقام لیا جائے گا

کیا میں غلط تھا

جب میں نے سوچا تھا

بارود سے ہلاک ہونے والے یتیم

سمندر سے اٹھیں گے

کیا میں خطاوار تھا

جب میں نے سوچا تھا

کہ اب محبت کی ضرورت نہیں

کہ اب درگزر کرنے کی صورت نہیں
اب زمین پر نیکی کی ضرورت نہیں
اب قبرستان نما شہروں سے
چاند کی طرف
ہاتھیوں کے پیغام بھیجنے کی ضرورت نہیں
کیا میں غلط تھا
جب فرطِ انبساط سے میں پاگلوں کی سی ہنسی ہنس رہا تھا
جب سمندر سے زندہ چونے کی طرح دھواں اٹھ رہا تھا
جب ہوا راکھ پر راکھ لا رہی تھی
کیا میں غلط تھا
جب میں خون کے مینار بنا رہا تھا
کیا میں غلط تھا
جب میں سیزر کی لوٹ مار کا انتقام لے رہا تھا
کیا میں غلط تھا
جب زمین کو تانبے کی طرح تپا کر
ستاروں کی بلندیوں پر رقص کرتے ہوئے
یورپ کو اپنی تہذیب کے شعلوں سے
بھسم ہوتے دیکھ رہا تھا
امریکہ کے خودساختہ فولادی دیوؤں کے بازوؤں کو

روئی کے گالوں کی طرح اڑتا دیکھ رہا تھا
انسانوں کو ایذا پہنچانے والوں کو
خاک ہوتے دیکھ رہا تھا
کیا میں غلط تھا
کیا میں غلط تھا

غدّار

تم کو تو ہمارے مستقبل کا خواب بننا تھا
تا کہ تم وہ سب کچھ فراہم کر سکو
جو ہم پر حرام کر دیا گیا ہے
تم کو تو ہمارے زخموں پر مرہم رکھنا تھا
تا کہ تم شکستہ استخوانوں کو جوڑ سکو
لیکن
تم نے غدّاری کی
تم نے ہمارے دشمن کو اپنا چاہنے والا منتخب کیا
تم اس کے ہمراہ
ہمارے سامنے سے ایک گناہ کی طرح گزرتے رہے
تم اپنے آبا کے قاتلوں سے بغل گیر ہوئے
تم اپنے قبیلے کے لوگوں کو تختۂ دار تک لے گئے
تم نے اپنے باپ دادا کی روحوں کا مذاق اڑایا
تم نے ہمارے بھید کمینے اجنبیوں پر ظاہر کیے

تم نے ہمارے بزرگوں کے سروں کی تضحیک کی
اوران کے سفید بالوں کا سودا اُن کے بچوں کے
سامنے کیا
وہ ہونٹ جو قدیم صداقتوں کے امین تھے
ان پر مہریں لگادیں
اورپھران کی دھنسی ہوئی آنکھوں نے تمہیں بددعادی
''تم سمندر کا لقمہ بنو''

Mazisi Kunve

Nosizv

پولیس مقابلہ

سرکاری ہینڈ آؤٹ

وہ نویں منزل سے کود کر مر گیا
اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی
وہ فرش دھوتے ہوئے صابن کی ٹکیہ سے پھسل گیا تھا
وہ نویں منزل سے گر گیا تھا
اس نے خود کو لٹکا دیا تھا
وہ صابن کی ٹکیہ دھوتے ہوئے فرش سے پھسل گیا تھا
وہ نویں منزل سے کود گیا تھا
فرش دھوتے وقت اس نے خود کو چھت سے لٹکا دیا تھا
وہ نویں منزل سے پھسل گیا تھا
اس نے نویں منزل سے خود کو لٹکا دیا تھا
وہ نویں منزل سے فرش دھوتے ہوئے پھسل گیا تھا
وہ پھسلتے ہوئے صابن کی ٹکیہ سے گر گیا تھا
اس نے نویں منزل سے خود کو لٹکا دیا تھا

اس نے نویں منزل سے فرش دھویا جب وہ پھسل رہا تھا
وہ نویں منزل پر دھلائی کرتے وقت
صابن کی ٹکیہ سے لٹک گیا

Detention

اور وہ گا رہے ہیں

جہاں سفید فام
چھٹی کے روز
آسودگی سے قدح خواری کرتے ہیں
اور باقی روز
سونا سمیٹتے ہیں
وہاں
حیرت کی بات ہے
کالے آدمی
جانوروں کی سی
کمر توڑ دینے والی مشقت کے باوجود
گیت گا رہے ہیں

Surprisingly singing

پابجولاں

ریل گاڑی ایک شہر کے سٹیشن پر رکی
میں نے کھڑکی کے کہر آلود شیشے سے باہر جھانکا
چھ آدمی مادرزاد ننگے
جن سے انسانیت کی ہر توقیر نوچ لی گئی تھی
تازہ مونڈھی ہوئی بھیڑوں کی مانند
آگے پیچھے کھڑے تھے
بدن کو آبلہ بنا دینے والی ہوا میں
یوں منمنا رہے تھے
جیسے کہہ رہے ہوں
اے برفانی ہوا، ہم سے دُور رہ
کیا تُو نہیں دیکھ سکتی
کہ ہم برہنہ ہیں
ننگے پاؤں
ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ

ٹخنوں کے گرد بیڑیوں کے فولادی کڑے
وہ لنگڑاتے ہوئے
ریل کے ڈبے میں یوں داخل ہو رہے تھے
جیسے جانور
مذبح خانے کے خاص دروازے کی دہلیز پر
کسی نامعلوم خوف سے ٹھٹھک جاتے ہیں
ایک آدمی
جس کا سر آلو کی طرح منڈھا ہوا تھا
نیم واچشمِ خوں بستہ کی مصداق
دونیم سورج کی طرف دیکھ کر
دھیمی آواز میں بولا
اچھے سورج
کیا تُو میرا دل امید کی شعاع سے نہیں گرمائے گا
اور ریل گاڑی
ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگئی

Men in Chains

انتقام

تمھیں کیسا لگے گا
اگر میں رات کے اندھیرے میں آؤں
اور تمہارے پہلو میں نیزہ اتاروں
اپنے ان شہیدوں کا انتقام لینے کے لیے
جن کو تم نہیں جانتے تھے
جن کے زخم مخفی ہیں
جن کی کوئی یادگار نہیں
وہ جن کو تم صرف جشن کے اوقات میں
یاد کرتے ہو
ہم ان کو نہیں بھولے
روز بروز
ہمارے انتقام کی آگ تیز
اور اس کے شعلے
تمہارے شہروں

تمہارے بچوں کے گرد
اپنا حلقہ تنگ کرتے جاتے ہیں
جو راکھ کے مینار بن کر
ہمارے انتقام کی گواہی دیں گے

Mazisi Kunive

Vengeance

عروسی

سولی نادھی

ایک ٹیلے پر اکیلا کھڑا

اپنے گھر کے آنگن پر نظریں جمائے ہے

سولی نادھی

ٹیلے پر اکیلا

ڈھلوان میں واقع اپنے گھر کو دیکھ رہا ہے

جہاں آج اس کی بیٹی کی شادی ہے

مہمان گھر کے صحن میں

دولہا اور دلہن کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں

سولی نادھی سے کچھ فاصلے پر

خفیہ پولیس کے لوگ

سفید کپڑوں میں

نگرانی کے لیے موجود ہیں

تاکہ سولی نادھی

جس پر سماجی اجتماعات میں شرکت پر بھی
پابندی ہے
اپنی اکلوتی بیٹی کی عروسی کے دن
کہیں قانون شکنی کا مرتکب نہ ہو
نیچے ڈھلوان
سولی نادھی کے گھر
مہمان
دولہا دلہن کے ساتھ کھانا کھا کر
ایک ایک کر کے
ٹیلے کی طرف آتے ہیں
تا کہ سولی نادھی سے
ہاتھ ملا کر رخصت ہوں
سولی نادھی
اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے روز
ٹیلے پر کھڑا
اپنے گھر کو دیکھ رہا ہے
اکیلا بہت ہی اکیلا

Hugh Lewin

Wedding

ایک اور دن

آج کا دن بھی
بس روز ہی کی طرح کا ایک دن تھا
کوٹھڑی کا قفل کھلتا ہے
ناشتہ
دھلائی
خاکروبی
صفائی
شاخوں کی تراش خراش
تالہ بندی
کوٹھڑی
غسل
چار بجے رات کا کھانا
تالہ بندی۔کوٹھڑی تنہائی
اگلی صبح تک

چودہ گھنٹے مقفل کوٹھڑی میں

ہر رات

صبح

ہم نے گیارہ جوار کی پھلیوں کا راتب لیا

دس اپنے لیے

ایک اُس کے لیے

اپنے ہاتھوں اگائی ہوئی پھلیوں کے لیے

ہم قدرے جذباتی ہو رہے تھے

آج شام کے راتب میں

پھلّیاں کھائیں گے

سہ پہر تک

ہم نے اکیس جھاڑیاں تراشیں

ہم خوش تھے کہ ہمارے بوئے ہوئے بیج

کس طرح بارآور ہو رہے ہیں

آج کا دن بھی

معمول کی طرح کا ایک دن تھا

شاخ تراشی

دوپہر کا کھانا

مقفل کوٹھڑی

دھلائی۔خاکروبی۔صفائی

غسل

چار بجے رات کا کھانا

مگر چار بجے سے پہلے

اسے بلالیا گیا

اچانک۔غیر متوقع

کوئی ملاقاتی آیا ہے

میں نے سوچا

یہ اچھی بات بھی ہو سکتی ہے

یہ بری بات بھی ہو سکتی ہے

وہ ملاقات کے لیے

کھانا کھائے بغیر روانہ ہو گیا

ہم نے اس کا کھانا

اس کی کوٹھڑی میں رکھ دیا

تا کہ ملاقات کے بعد کھا سکے

کوئی خوشخبری

یا کوئی منحوس اطلاع

آج کا دن بھی

عام دنوں کی طرح ایک دن تھا

رات کا کھانا

کوٹھڑی میں تالہ لگ گیا

اکیلا پن

کوٹھڑی

آئندہ چودہ گھنٹوں تک کے لیے

جب ہم کھانا کھا رہے تھے

وہ ملاقات کے کمرے میں تھا

لکڑی کا ایک صندوق نما کمرہ

جس میں صرف چار انچ کا چوکھٹا

ملاقاتی کا منہ

قیدی کا کان

ساتھ ہی ایک ساؤنڈ بکس

تاکہ قیدی اور ملاقاتی کی گفتگو

صاف طور پر ریکارڈ کی جا سکے

دو پہرہ دار قیدی کی طرف

دو پہرہ دار ملاقاتی کے قریب

اسے وہ ملاقات کا کمرہ کہتے ہیں

اس کے بھائی نے چوکھٹے میں تھوتھنی ڈال کر

اسے بتایا

لمس

جب میں جیل سے باہر آؤں
تو میں کسی سے کہوں گا
مجھے چھوؤ
بہت آہستگی بہت ملائمت سے
مجھے چھوؤ
کیونکہ میں ایک بار پھر جاننا چاہتا ہوں
کہ زندگی کیسے محسوس ہوتی ہے
مجھے سات برسوں سے
کسی نے نہیں چھوا
میں سات برسوں سے
لمس کے احساس سے محروم ہوں
میں زندگی سے کٹ چکا ہوں
ان سات برسوں نے مجھے سکھا دیا ہے
نہ چھوا جانا کیا ہوتا ہے

چھوا جانا کیسا ہوتا ہے

نہیں ایسا بھی نہیں

جن چیزوں نے مجھے چھوا

مجھے یاد ہیں

میں انگلیوں پر گن سکتا ہوں

وہ مکے

جو ابتدا میں مجھ پر برسے تھے

تیز۔ تند۔ مسلسل

پٹائی خوب پٹائی

آخر میں چیخ اٹھا تھا

نہیں، خدا کے لیے مجھے مت چھوؤ

ہاتھ

پہلے چار برسوں تک

ہر روز تلاشی لینے والے پہرہ داروں کے ساتھ

متجسس۔ تھپتھپاتے ہوئے ہاتھ

بازو اٹھاؤ

بوٹ اتارو

دونوں ٹانگیں کھول دو

بہت مہارت سے

بوجھل۔ بے حس۔ لاتعلق
جسم کے تمام پوشیدہ حصے ٹٹولتے ہوئے ہاتھ
میں سُکے اور جاسوس ہاتھ نہیں چاہتا
میں دوبارہ چھوا جانا چاہتا ہوں
کچھ اس طرح
کہ مجھے محسوس ہو
میں زندہ ہوں
میرا مطلب ہے جب میں یہاں سے نکلوں
تو کہوں۔ یہ میں ہوں
مجھے چھو کر دیکھو

Hugh Lewin

Touch

پھانسی

(جنوبی افریقہ کے ایک جیلر نے کہا ہمارے ہاں مجرموں کو موت کی سزا دینے کے لیے
نہایت مہذب اور انسانی طریقہ ہے)

میں ایک مرتبہ
ایک شخص سے ملا
جس کی موت
نہایت ''مہذب طریقے'' سے واقع ہونے والی تھی
اسے آخری ملاقات کے لیے
ملاقات کے کمرے میں لے جایا جا رہا تھا
وہ سر اٹھائے اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا
جہاں ایک دھوپ کا ٹکڑا مچل رہا تھا
جب ہم ایک دوسرے سے ٹکرائے
تو اس نے سر نیچا کر کے
میری طرف دیکھا
مسکراتے ہوئے اس نے نہایت ملائمت سے کہا

''معاف کیجیے''

اور مجھے عجیب نا آسودگی میں چھوڑ گیا

وہ موت کی سزا پانے والے کے خاکی رنگ

کے مخصوص کپڑوں میں تھا

بغیر بٹنوں

بغیر تسموں

بغیر پیٹی کے

فقط حفظِ ماتقدم کے طور پر

تا کہ وہ ''مہذب طریقے'' سے مرنے کی بجائے

خود کو لٹکا نہ دے

تمام ممکنہ احتیاطیں

تا کہ وہ خودکشی نہ کرے

دوسری صبح وہ اسے لینے آئے

یہ ایک ہلکی گرمی کا دن تھا

سورج نکل چکا تھا

اور تمازت بڑھ رہی تھی

وہ پانچ بجے صبح پہنچے

ایک منصف

دو فوجی لیفٹیننٹ

تین محافظ
اور پانچ علاقائی نائب محافظ
(جن کے پاس چابیوں کے گچھے تھے)
تمام پرسکون اور چوکنّے
ان کے ساتھ ہی
ایک کمانڈر
ایک ڈاکٹر
اور ایک پادری بھی تھا
(پادری کو صرف دہرے دروازے تک آنے کی اجازت تھی جہاں وہ بے بسی سے
صرف دعائیں پڑھ رہا تھا جب کہ باقی کے سب مجرم کی رہنمائی کرتے ہوئے دہر
دروازے سے آگے بڑھ گئے)
دھوپ کا ٹکڑا بلند کھڑکیوں کے راستے سے کمرے
میں اتر رہا تھا
وہ سب کے سب خوش خلق تھے
سب کے سب کچھ بڑبڑا رہے تھے
اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکایا
اس کے ہونٹ خشک تھے
جس وقت اس کے سر اور چہرے پر نقاب
ڈالا جا رہا تھا

اس نے سیکشن وارڈر کا ہاتھ سہلایا

ہر کوئی چپ چاپ

بت بنا دیکھ رہا تھا

بالکل اس طرح جیسے

اس ساری کارروائی میں

ان کا کوئی حصہ نہ ہو

سب اس طرح پرسکون تھے

جیسے کوئی عام جگہ تھی

سب جانے پہچانے چہرے اور وردیاں تھیں

جیسے (کسی عبادت گاہ میں) بلند آواز میں بولنے کے خواہشمند ہوں

اس کے دونوں پاؤں کو تختے کی لکیروں کے مخصوص

ٹکڑے پر جوڑ دیا گیا

اس نے اپنے نقاب پوش سر کو

کسی متوقع آواز کو سننے کے لیے ایک طرف کو جنبش دی

جب اچانک تختہ کھسکا

جھٹکا

گلے میں پھندے کی گرفت سخت ہوگئی

اور سخت ہوگئی

اور وہ لٹک گیا

بیس منٹ تک اس کے جسم کو لٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا

تا آنکہ

ڈاکٹر نے

آخری

قطعی

اور سرکاری اعلان کیا

ختم

اب لاش کو اتار دو

مجھے یاد کرنا

مجھے یاد کرنا

جب لاجوردی آسمان

دکھ سے آہیں بھرے

اور مٹیالے پیلے ہونٹوں کی جنبش

میری موجودگی کا احساس دلائے

مجھے یاد کرنا

جب میرے وطن کے میدانوں کا سبزہ

میرے گہرے زخموں پر

اپنی چادر ڈال کر

میرے اندر

جی اٹھنے کی خواہش کا شعلہ

بیدار کرے

جہاں سنسناتی ہوئی

گولیاں

ہمیں آزادی کی صبح سے
قریب تر کر دیں
مجھے یاد کرنا

Remember me

آس

رات کے سرخ انگارے
غلامی کی مار کھائے ہوئے
ہمارے یخ بستہ دلوں کو
خطرے کا اشارہ دے رہے ہیں
رات کی سیاہی میں
انگار آنکھیں چمک رہی ہیں
ہماری زندگیاں
کتنی ہی اذیتوں کے سایوں میں لپٹی ہوئی ہیں
مگر ہماری فطری انسانی امید
مزاحمت
اور نبرد آزمائی کے لیے
ہمیں آگے اور آگے
ہنکائے لیے جا رہی ہے

Victor Motapanyane
Hope

میں انتظار کروں گا

میں نے بارہا
بھوک کا ذائقہ چکھا ہے
بالکل اسی طرح
جیسے منہ میں ریت بھر جائے
میں شعلوں جیسے آنسو رویا ہوں
جنہوں نے میری پلکوں کو چاٹ لیا ہے
اور وہ سب کچھ دھندلا دیا ہے
جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں
لیکن وہ ہمیشہ
آج اور کل
ہر لمحہ ہر جگہ
جہاں بھی میں رہا ہوں
مسرت
بالکل ایک خوشگوار منظر کی طرح

میرے وجود کے سامنے کے راستوں میں
پھیلی ہوئی ہے
میرے رگ و پے میں
چاندی جیسے چمکیلے دریاؤں کی طرح رواں دواں ہے
اور اب مجھ پر کھلا
کہ میں اتنا لبریز ہو کر بھی
کتنا پیاسا ہوں
میں انتظار کروں گا
میں انتظار کروں گا

کتبہ

(احمد ناموں اور دوسرے شہید ساتھیوں کے لیے)

ان کی فتح یہی تھی

جب اس کا گرنا

کانٹے میں لٹکی ہوئی مچھلی کی طرح تھا

چار روز بعد

اس کے باپ سے کہا گیا

جاؤ مسجد میں دعا کرو

تمہارے بیٹے نے جان دے دی ہے

وہ کھڑکی سے کود گیا تھا

ہم نے اسے ایک سل پر لٹا دیا ہے

۱۹۶۴ء میں سلوجی بھی اسی جگہ سے کودا تھا

احمد کو انہوں نے بتایا

۱۹۶۴ء میں سلو جی بھی تمہاری طرح کچھ بتانے سے انکاری تھا اور پھر

سات منزلہ عمارت کی کھڑکی سے کود کر مر گیا تھا

مصنوعی ہنسی ہنستے

اور ایک دوسرے کو مکارانہ شرارت سے آنکھیں مارتے ہوئے وہ اسے

تین منزلیں اور اوپر لے گئے

کیا تمہیں یہاں سے شہر کا نظارا اچھا لگتا ہے

تم گفتگو کرنا پسند کرو گے

پھر تم تو ہمارے لیے بہت قیمتی ہو انعامی شکار

تم گفتگو کرو گے

یا اس بلندی سے کود جانے کو فوقیت دو گے

آنکس سے اس کے سر کو چھیدنے کے باوجود بھی

جب اس کی مزاحمتی خاموشی برقرار رہی

تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا

اور گینڈے کے سے طیش میں آ کر

انہوں نے اسے

سر کے بل...... دسویں منزل سے نیچے پھینک دیا

تا کہ اس کے سر کے زخموں پر پردہ ڈالا جا سکے

جو آنکڑے دار سلاخ سے آئے تھے

وہ اس ''چھلانگ'' کا تذکرہ

اولمپک کے کسی کھیل کی طرح خوش مزاجی سے

کر رہے تھے

ہم کبھی بھی طاقت کا استعمال نہیں کرتے

کچھ لوگ خود کو لٹکا دیتے ہیں

کچھ صابن پر سے پھسل جاتے ہیں

لیکن اس نے کود کر مرنا پسند کیا

(پولیس کے نمائندے نے پریس کے سامنے جیل میں سترویں موت کی وضاحت

کرتے ہوئے کہا)

ہم کسی کو دھمکاتے نہیں

ہم کسی پر تشدد نہیں کرتے

ہم فرض کر لیتے ہیں

کہ کوئی بھی ملزم تفتیش کے دوران

فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا

کوئی نہیں

کوئی نہیں

کوئی بھی نہیں

اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے

سب مرنے والوں کے لیے ایک ہی کتبہ کی تحریر لکھی

ہم جانتے ہیں

حریت پسندوں کو تشدد کی دھمکی دی جاتی ہے

تو وہ اپنے ساتھیوں کا نام بتانے کی بجائے

خودکشی کر لیتے ہیں

انہیں سکھایا جاتا ہے

کہ تفتیش کے آغاز ہی میں

کھڑکی سے کود جایا کرو

A.N.C. Kumalo

Before Interugation

ہم کون ہیں؟

(ایک افریقی کی موت پر جو پولیس کی بلا جواز فائرنگ سے ہلاک ہوا تھا)

ہم کون ہیں
شہید یا غازی
جب ہم نے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی
صرف ایک بیمار ریاست کی کشتہ مخلوق
گوناگوں ناسوروں کے انبار
جو نفرت کی بارشوں میں
نمو پاتے ہیں
ہم رزمگاہ میں نہیں اترے
نہ ہی کسی میدان میں نبرد آزما ہوئے
تاکہ تاریخ کی فرسودہ دستاویز سے
خود کو منسوب کر سکیں
ہم وہ قیدی تھے
جو اندھی راتوں میں مارے گئے

ہماری موتیں

''اتفاقیہ یا حادثاتاً'' واقع ہوئیں' اس کے باوجود
جب کل شہیدوں کے نام پکارے جائیں گے
جنہوں نے ہماری سرزمین کو آزاد کرانے میں
اپنی جانیں قربان کیں
تو بغیر کسی حیرت اور تامل کے
وہ گمنام اور نہتے ساتھی بھی
ان جانثار بلوانوں کی فہرست میں ہوں گے
جنہیں لوگ عقیدتوں کے خراج پیش کریں گے

اپنی زمین کے مستحق بیٹے

ہمارے بچوں کے پھولے ہوئے پیٹ
جن کا نمایاں اُبھار
نظرانداز نہیں کیا جاسکتا
نہایت بیچارگی سے
توجہ کی بھیک مانگتے ہیں
تابوت ساز
اور قبر فروش
انہیں دیکھ کر
منافقانہ ہنسی ہنستے ہیں
ہر دن
ہمارا مرنا
ہمارا ماتم کرنا
ہماری زندگی بن چکا ہے
جب بھی منافع کے پھیلاؤ میں
ذرا سی سکڑن کا

اندیشہ ہو
فصل اٹھانے والے اجنبی
وحشیوں کی طرح
ہم پر کوڑے برساتے ہیں
ہمارے سمندروں کی ہوائیں
ہمیں اپنے غیر فطری ماحول کا
احساس دلانے کے لیے
ہمارے کانوں میں
شدت سے شُوکتی ہیں
ہمارے ساحلوں کی ریت
ہماری خودکوری کو
ستانے کے لیے
ہماری آنکھوں میں
طنزیہ رقص کرتی ہے
مگر اپنی زمین کے مستحق بیٹے
ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے
اپنے وجود کو
نہیں دیکھ سکتے

Duncan Mattho

And worthy sons of the land

نفرت کی نمو

میری طرف دیکھو

اِدھر

میری آنکھوں میں

میرے تیوروں کی گہرائیوں میں

کوئی بے یقینی کوئی خوف نہیں

بلکہ

وہ کالی خوبصورتی ہے

جو طوفان سے پہلے

گھٹاؤں سے بوجھل آسمانوں میں

نظر آتی ہے

ان میں

تہہ بہ تہہ

نفرت کی سرخ تمتماہٹ

دکھائی دے گی

میرے کالے اور مضبوط ہاتھوں کو دیکھو

جن میں

تمہارے نرخرے کو پھاڑ کر

تمہاری آنتیں تمہارے اندر کا سب کچھ

گندگی کے ڈھیر پر پھینکنے کے ارادے سے

کپکپاہٹ اور رعشہ آ گیا ہے

اس کے لیے مجھے

بڑے بڑے ناخون پالنے کی ضرورت نہیں

کہ تم نے خود ہی

میرے اندر

لازوال نفرت کو

پروان چڑھایا ہے

میرے منہ کو دیکھو

اس کی لکیریں

میرے دل پر پڑی ہوئی خراشوں کا

عکس ہیں

یہ میری جاوداں مزاحمت

اور تمہیں شکست دینے کا

عہد نامہ ہیں

میرے ماتھے کی نالیوں جیسی گہری لکیروں سے
بل کھاتا ہوا پسینہ
زمین کو اس طرح داغ داغ کر دے گا
جیسے بے بسی میں
غصے کے کڑوے آنسوؤں سے
ہمارے دل زخم زخم ہیں
مجھے ابھی تک
سکول جاتے ہوئے
نوعمر سیہ فام بچوں کے خون کے فوارے یاد ہیں
جن کے قدموں کی آوازوں کو
گرد سے اٹی ہوئی گلیاں
اب کبھی نہ سُن پائیں گی
میری آنکھوں کے گوشوں کی سلوٹیں
اپنی موجودہ حالت پر ٹھہری رہیں گی
اس شرمناک منظر کو اوجھل ہونے سے بچانے کے لیے
جب تمہاری گولیوں کی بوچھاڑ سے
خوفزدہ ہوکر
دس اور بارہ برس کے نوعمر بچے
کوڑے کے ڈبوں کے ڈھکنوں کے پیچھے

پناہ لیتے وقت
چھلنی ہو ہو کر گر رہے تھے
اس روز میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا
اور میری آنکھیں
جب سے کھلی ہیں
اور ان کی سلوٹیں
جب سے اسی زاویے پر ٹھہر گئی ہیں
تاکہ تم انہیں
اس وقت تک نہ بھٹکا سکو
جب تک
میں ان شہید بچوں کا
انتقام نہ لے لوں

Tending Hate

راستہ

اے ماٹی کے لال

اپنی منزل کا تعین خود کر

اس راستے سے گزر جا

مانا کہ تلوار کی دھار

شیروں پر سوار ہو

اور ان کے ایالوں پر

اپنی گرفت مضبوط رکھ

اپنے کندھوں کو اٹھا کر چل

آسمان تمہاری راہیں

روشن رکھیں گے

اور خاردار جھاڑیوں سے اٹھتی ہوئی

آوازوں کی گونج

تیری رہنمائی کرے گی

لوتھی کولٹین منڈیلا اور سیول

اسی راستے پر چلے تھے

سرکنڈوں کو پیچھے دھکیلتا

کانٹوں کو روندتا چلا چل

تمہارے ابروؤں پر

فرض کا بوجھ

اور پیٹھ پر مقدس جُوا

تمہارے ایذا رسیدہ

لوگوں کے دلوں کا مرہم

اور آزادی کا

بیج بنے گا

افریقن نیشنل کانگرس کے شہید اور مقید رہنما

Rebecca Mathlou

The Path

اے یادِ وطن

اے یادِ وطن
میں تجھے اگر تکلیف دہ سمجھتا ہوں
تو اس لیے نہیں
کہ تُو میرے دل کو چیر کر
خواہشوں کے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے
بلکہ اس خواہش کے سبب
کہ میں اپنے ہموطنوں کا نجات دہندہ بنوں

اِدھر
انسانوں کو کچلا جا رہا ہے
پھول سے بچوں کو مسلا جا رہا ہے
بڑی بوڑھیوں کو پیسا جا رہا ہے
تاکہ وہ کھاد بن سکیں
گلیاں خون کے تالاب ہیں
جہاں لوگوں کو چیر کر

دو نیم کر دیا جاتا ہے
وہاں
روحیں زنجیروں میں جکڑی
اور جسم پنجروں میں بند ہیں
صرف چمڑی اور ہڈی والی کلائیوں پر
ہتھکڑیوں کے زخم ہیں
ان کے بدن
کل پرزوں میں کس دیئے جاتے ہیں
تا کہ
ان کے وجود سے
بھوک کی اذیت
سوچ کا کرب
بے چھت کے گھروں پر
طوفان کی یورش کا اندیشہ
اور مارے جانے والے
عزیزوں کا ماتم
خون کے ساتھ نچوڑ دیا جائے
یہ نقشے ہیں
جو میرے دکھ کو افزوں کرتے ہیں

یہ منظر ہیں
جو میرے جسم میں شگاف ڈالتے ہیں
یہ تصور ہیں
جو کیڑوں کی طرح
میرے وجود کو تڑخا کر
ایذا پسندی کے بیج کو
خوراک مہیا کرتے ہیں
اے یادِ وطن
اے ماضی کے خیال
بس اسی لیے
تُو تکلیف دہ ہے

Rebecca Mathlou

Nostalgia

منڈیلا

جنوبی افریقہ کا سیاہ فام رہنما جسے سفید فام حکومت نے عمر قید کی سزا سنائی ہے وہ ۲۸ برس جیل میں گزار چکا ہے مگر مشروط آزادی سے انکاری ہے

منڈیلا

صرف ۴۶۶/۶۴ نمبر ہے

جو اس جزیرے کی زمین پر

قلبہ رانی اور روشیں صاف کرتا ہے

مگر تم ایک قوت ہو

ایک استقامت ہو

اور اپنے بیٹوں کی شریانوں میں

جاری و ساری ہو

جو تمہاری زمین کے لیے

جنگ لڑ رہے ہیں

ہاں

اپنے ہاتھوں میں بیلچے کو مضبوطی سے تھامے

اپنی مٹی کے لیے

کھیتوں میں مشقت کرتے رہو

اپنے دوسرے کئی بھائی بہنوں

بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح

جو افریقہ کی زمین کو

اپنی سخت کوشی کے پسینے سے سینچتے ہیں

یہ زمین ہماری ہے

ہمیں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنا

جب تک افریقہ ہمارے پاس واپس نہیں آتا

Mandela

میری ہزاروں آوازیں ہیں

میری ہزاروں آوازیں ہیں
میں تمہیں وہاں سے پکاروں گا
جہاں سورج ڈوبتا ہے
میں تمہیں ان شاخوں سے آواز دوں گا
جو ہوا کا آنچل تھام کرناچتی ہیں
تم نہ ختم ہونے والی متاع ہو
جو نسلوں کے ہونٹوں سے گاتی ہے
تم ایک سرسبز تنا ہو
جس کی ہری بھری شاخیں
جھیل میں اتری ہوئی ہیں
جنہیں درخت کاٹنے والا
بے سود ذبح کر جاتا ہے
کہ بہار کے ساتھ ہی
ان میں زندگی کا تازہ خون

موج مارنے لگتا ہے
نئی کونپلیں پھر پھوٹ نکلتی ہیں
اور شاخیں جب پھلوں سے لد جاتی ہیں
تو قاتل
اپنے کلہاڑے اور تبر لے کر پھر آتا ہے
یہ سوچ کر
کہ یہ ہمیشہ کے لیے بانجھ ہو جائیں
وہ تمام پھلوں کو ہڑپ کر جاتا ہے
اس خوش فہمی میں
کہ اب ان پر بُور نہیں آئے گا
لیکن نئے موسموں میں
نئی کونپلیں پھر پھوٹ نکلتی ہیں

Mazisi Kuvene

Abandance

پسِ مرگ

وہ لاشوں پر نمبر لکھ دیتے ہیں
نعش خانے کے نمبر
ماتھوں کی قطاریں
چہروں کا جنگل
خاردار آنکھوں کے نیچے
کبھی ان کے ماتھوں کے پیچھے
دماغ دھڑکا کرتے تھے
جن کی دھڑکن
ایک للکار تھی
طاقت عوام کی ہے
مبازرت کا نعرہ
ابھی بھی گونج رہا ہے
بچوں کے جلے ہوئے سکول کے خاکستر سے
اٹھتا ہوا نعرہ

معصوم ہونٹوں سے پھوٹ کر

بزرگوں کے دہنوں سے

اٹھتا ہوا نعرہ

کانوں

کارخانوں

اور کھیتوں کے حلقوم سے اٹھتا ہوا نعرہ

خوشنما پرندے کے گلے سے اٹھتا ہوا نعرہ

اِس کٹھالی سے

اُس بھٹی سے

چنگاری کی طرح

اڑتا ناچتا چکراتا ہوا

ٹنڈی سے

لوہے کی سلاخ کی مانند

سرخ گرم ہوا میں جذب ہو جاتا ہے

یہ سویٹو کے انگار ہیں

جو گوگولیٹو کے دل کو آتش فشاں کر رہے ہیں

جو بوں ٹیو ہول کے پھولوں کی طرح آتشیں ہیں

سنو

دہکتے ہوئے انگاروں کو چھوتی ہوئی

مجاہد بچے کی آواز
گرتے ہوئے بچے کی آواز
سنو
اے ماں
اے بابا
اے لوگو
آزادی کی توپ داغی جارہی ہے
''مرتے ہوئے بچے کے ہونٹوں پر
نعرہ سوکھ جاتا ہے''

A.N.C. Kummalo
Embers of Sweto

ہم ملیں گے

(ڈیوب ۔ ٹیرو اور ہر شہید ساتھی کے نام)

ہم ملیں گے

ڈیوب اور ٹیرو

اور اے ہر شہید ساتھی!

پہاڑی کی چوٹی پر

ہم ملیں گے

ڈیوب اور ٹیرو

لڑنے والے سپوتوں کے سینوں میں

بم باتھا کا دل دھڑک رہا ہے

ڈیوب اور ٹیرو

لتھولی کے سچے بیٹوں کے سینوں میں

بم باتھا کا دل دھڑک رہا ہے

کوئی کوڑا

کوئی بیڑی

کسی بم کی دہشت

کوئی گولی

کوئی خوں آلود صلیب

کوئی گرجتی ہوئی توپ

بم باتھا کے دل کو

جو ڈیوب اور ٹیرو

اور ہر کالے بچے کے سینے میں دھڑک رہا ہے

مطیع نہیں کر سکتی

ہم کبھی نہیں جھکیں گے

ہم کبھی تذبذب کا شکار نہیں ہونگے

ہم کبھی چین سے نہیں بیٹھیں گے

مکافات سے پہلے

انتقام سے پہلے

مردو...... بڑھو

عورتو...... بڑھو

اپنے ان ساتھیوں کی لاٹھیاں

مضبوطی سے تھام لو

جو رزمگاہ میں مارے گئے

جو شہید ہو گئے

ہم ڈیوب اور ٹیرو

اور

ہر شہید ساتھی سے
پہاڑ کی چوٹی پر ملیں گے
پہاڑ کی چوٹی پر ملیں گے
جب قوم آزاد ہو گی

۱۔ ہم باتھا۔ جنوبی افریقہ کا سیاہ فام رہنما جسے بغاوت کے الزام میں قتل کر دیا گیا تھا۔
۲۔ جان ڈیوب۔ نیشنل کانگریس آف افریقہ کا شہید رہنما
۳۔ ابراہیم ٹیرو۔ نوجوان طالب علم رہنما جو مارچ ۱۹۷۴ء کو فرار ہو گیا لیکن سفید فام پولیس نے اسے ایک پارسل بم کے ذریعے ہلاک کر دیا تھا۔

جنگ کے بعد کا پہلا دن

ہم نے ایک نغمہ سنا

جیسے کہیں سے شادی کا جلوس آ رہا ہو

شہنائیاں بجاتا ہوا

ہم نے ایک ملائم روشنی دیکھی

جو شبنمی گھاس کی روشوں سے لپٹ رہی تھی

شروع میں کچھ تامل تھا

پھر ہم نے دوشیزہ کے قدموں کے نشان دیکھے

پھر آہستہ آہستہ

دھندلکوں سے ابھرتا ہوا

اس کا خوبصورت چہرہ

اور پھر آزادی کی چمک لیے ہوئے

اس کی تابندہ آنکھیں

وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ جاگی

اور بولی

آج کونسا دن ہے جو اچانک آ گیا ہے

ہم نے اسے بتایا

کہ آج جنگ کے بعد کا پہلا دن ہے

پھر کسی بات کا انتظار کیے بغیر

ہم کھلے میدانوں کی طرف بھاگے

نعرے لگاتے ہوئے

ہجوم در ہجوم

پہاڑوں اور پگڈنڈیوں پر پھیل گئے

اور دنیا بھر کے لوگوں کو پکارنے لگے

ہم نے ایک بوڑھے بابا کو جھنجھوڑ کر

جشن منانے کا مطالبہ کیا

ہم نے نئے موسم کے

تمام پھل مانگے

ہم نے آبشاروں کے پار

آوازیں دیں

اور پھر دنیا کے ہر ٹکڑے سے

لوگ آ گئے

یہ امن اور محبت کا پہلا دن تھا
ہم نے دیکھا
کہ ہمارے آبا کے سائے
اپنے سروں کو اونچا کیے
چل رہے ہیں

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں
ابھی ابھی سب نے دیکھا
یہاں آٹھ برس کی
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
اس کے بال
نوکدار چوٹیوں میں گندھے تھے
اس نے معصومیت سے
(پولیس کو)
احتجاجاً مکہ دکھایا
اس کے بعد
دیکھنے والوں نے دیکھا
سرخی ہی سرخی پھیل گئی
کچھ گوشت کے لوتھڑے
کچھ پھڑ پھڑاتے ہوئے

رنگدار چیتھڑے
زمین پر بکھرے پڑے تھے
ابھی ابھی
یہاں پھولدار سرخ کپڑوں میں
ایک گڑیا جیسی بچی تھی
ابھی ابھی......
لوگ کہتے ہیں

Dennis Brutus

There was a girl

آزادی کے وارث

تمھی نے تو
کڑے موسموں میں
ہمارے دلوں کو
زندگی کا ذائقہ دیا تھا
سو تمھی
یہ ہتھیار ہمارے بچوں کے بچوں کے لیے لے جاؤ
یہ ہمارے ہیں
ان ہتھیاروں نے
کئی مرتبہ
دشمن کا گھیرا توڑا تھا
پھر کیوں نہ ہمارے بچے
ہماری آوازوں کے ساتھ جیئیں
ہمارے ڈراؤنے خوابوں کے بھرپور پن
کے ساتھ جیئیں

انہیں چاہیے
کہ وہ ہمیں پہاڑوں پر دفن کریں
تاکہ ہمارا مارے مارے پھرنا
ان کی یاد سے نہ اترے
غروبِ آفتاب
ہماری جوانی چرائے لیے جا رہا ہے
اب ہمیں رخصت ہو جانا چاہیے
ہمیں قاتل پرندے کے پیچھے پیچھے جانا چاہیے
نیند
دہشت ناک نیند سو جائیں
اور ہمارے بچوں کے بچے
ہم سے آنے والے جشن کا خواب
ترکے میں لیں
ہم جو اپنے سروں پر
باز کو منڈلاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں
ہم جو موت کی تیز بساند
سونگھ چکے ہیں
ہم جنہوں نے
اپنے ساتھیوں کے جسموں سے

گدھوں کو گوشت نوچتے دیکھا ہے
ہم تمہارے لیے
صبح کی شعاعیں
ورثے میں چھوڑتے ہیں

Mazisi Kuvene

A Heritage of Liberation

ناتمام مسافت

نہیں

ہمیں اس راستے سے نہیں لوٹنا

کہیں ایسا نہ ہو

کہ پھر

ہم اپنے ہی سایوں کے روبرو ہو جائیں

کہیں ایسا نہ ہو

کہ ہمارے کانوں کے پردے

اپنی ہی اداسی کی گونج سے پھٹ جائیں

نہیں

ہمیں ہتھیار نہیں ڈالنے

چاہے یہ سلسلہ

کیسا ہی لامتناہی کیوں نہ ہو

اور ہمارے پاؤں کو

شام کا راستہ

خستگی سے چور کر دے

ہمیں رات سے

بڑے خوابوں کی تخلیق

کا کام لینا ہوگا

تا کہ آنے والے دن کو

ہم نشانِ راہ بنا سکیں

ہمارے اطراف میں

مہکتے ہوئے پھولوں کی

مزید افزائش ہونی چاہیے

درختوں میں لگے پھل

تازہ پتوں میں جذب ہو جائیں

وگرنہ بعد میں

سڑے ہوئے رگ و ریشے کے سوا

کیا رہ جائے گا

ہمارے سفر کی ابتدا یہاں سے ہو

جو آفاق کی حد تک پھیل جائے

جہاں ہمارا ملاپ

اپنے بچھڑے ہوئے ہمزادوں سے ہوگا

تا کہ ہم انہیں

ایفائے عہد کی نوید دے سکیں
تا کہ وہ سورج کی
آخری پہاڑی کو سر کر سکیں
لاریب ایسے معجزوں سے
ہماری فتح یقینی ہے

Mazisi Kuvene

Unfinished Adventure

A.N.C.Kumalo ۱۹۳۸ء میں ہنز برگ میں پیدا ہوا لیکن جنوبی افریقہ کی بجائے افریقہ میں مقیم ہے۔ اس کی نظمیں مختلف بین الاقوامی ماہناموں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ نیشنل افریقن کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔

Hugh Lewin ۱۹۳۹ء میں مشرقی ٹرانسوال میں پیدا ہوا۔ دہشت پسندی کے الزام میں سات سال جیل میں گزارنے کے بعد لندن آ گیا جہاں وہ تحریر و تصنیف میں مصروف ہے۔

Ilva Mackay ۱۹۵۲ء میں جنوبی افریقہ میں پیدا ہوئیں۔ دو مرتبہ جیل کاٹنے کے بعد وہ ۱۹۷۷ء میں لندن آ گئیں۔ افریقی نیشنل کانگریس کی رکن ہیں۔

David Evans ۱۹۳۵ء میں کوئینز ٹاؤن میں پیدا ہوا۔ زیرِ زمین سرگرمیوں کی بنا پر پانچ برس قید کاٹنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں برطانیہ آ گیا جہاں اس نے آکسفورڈ سے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لیور پول میں بطور ایک ماہر تعلیم کام کر رہا ہے۔ اس کے ڈراموں، مختصر افسانوں اور شاعری کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قید کے زمانے میں اس نے شاعری کا آغاز کیا تھا۔

Barry Feniberg ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء سے برطانیہ میں مقیم ہیں ان کی نظمیں مختلف جرائد اور شعری انتخابوں میں شائع ہو چکی ہیں مختلف زبانوں میں ان کی نظمیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ افریقن نیشنل کانگریس کے رکن بھی ہیں۔

Mazisi Kuvene پیدائش ۱۹۳۰ء شہر ڈربن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لاتعداد رسائل میں ان کی نظمیں شائع اور افریقی شاعری کے بہت سے انتخابوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ لاس اینجلس (امریکہ) کیلیفورنیا یونیورسٹی میں افریقی ادب کے پروفیسر ہیں۔

Keorapetse Kgositsile پیدائش ۱۹۳۸ء (جوہنز برگ) ۱۹۶۱ء سے جلاوطن ہیں۔ آج کل دارالسلام میں قیام پذیر ہیں اور تنزانیہ یونیورسٹی میں ادب کے استاد ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے امریکہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور جدید افریقی شاعری کا انتخاب مرتب کر رہے ہیں۔ افریقی نیشنل کانگریس کے رکن ہیں۔

Dennis Brutus پیدائش ۱۹۲۴ء۔ زمبابوے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جنوبی افریقہ سے ہجرت کر کے لندن آ گئے۔ اٹھارہ ماہ تک قید با مشقت اور ایک برس تک خانہ بندی کے بعد برطانیہ آ گئے۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ جنوبی افریقہ کے غیر نسلی کھیلوں کی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ آج کل یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے استاد ہیں۔

Dunncan Mattho ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں گرفتار ہوئے۔ ان پر دہشت پسندی کے الزامات تھے۔ ۱۹۷۶ء میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور افریقی نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

ان کی نظمیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

Victor morapanyane پیدائش ۱۹۴۲ء ہنز برگ ۱۹۶۵ء میں جنوبی افریقہ سے فرار ہو کر ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی سے ایم اے فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ اے این سی کے ممبر ہیں۔ بہت سے رسائل میں ان کی نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔

Oswald Mtshali پیدائش ۱۹۴۰ء جنوبی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کل

امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ان کی نظمیں بہت سے انتخابوں میں شامل ہیں۔

Christopher Vanwyk پیدائش ۱۹۵۱ء جوہنز برگ۔ آج کل بطور صحافی کام کر رہے ہیں۔ پہلا مجموعہ کلام ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

خوابِ گُل پریشاں ہے

حمید اخوند

کے نام

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، برسرِ عام رکھ دیا

ترتیب

احمد فراز کی شاعری......ایک مختصر تاثر

چند ہفتے پہلے کا واقعہ ہے کہ احمد فراز' امجد اسلام امجد' سجاد بابر اور میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھے مکہ مکرمہ پہنچے۔ ہم طوافِ کعبہ مکمل کر چکے اور سعی کے لیے صفا و مروہ کا رخ کرنے والے تھے کہ ایک خاتون لپک کر آئی اور احمد فراز کو بصد شوق مخاطب کیا۔ ''آپ احمد فراز صاحب ہیں نا؟'' فراز نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ ''ذرا سا رکیے گا۔ میرے بابا جان کو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔'' وہ گئی اور نہایت بوڑھے بزرگ کا بازو تھامے انہیں فراز کے سامنے لے آئی۔ بزرگ اتنے معمر تھے کہ بہت دشواری سے چل رہے تھے مگر ان کا چہرہ عقیدت کے مارے سرخ ہو رہا تھا اور ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بولے۔ ''سبحان اللہ۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے ہی گھر میں مجھے احمد فراز صاحب سے ملوا دیا...... وہ احمد فراز جو میرے محبوب شاعر ہیں اور جنہوں نے میر و غالب کی روایت کو توانائی بخشی ہے۔'' عقیدت کے سلسلے میں انہوں نے اور بہت کچھ کہا اور جب ہم ان سے اجازت لے کر سعی کے لیے بڑھے تو میں نے فراز سے کہا۔'' آج آپ کی شاعری پر سب سے بڑے الزام کا ثبوت مل گیا ہے۔'' سب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''دیکھا نہیں آپ نے۔'' یہ ''ٹین ایجر'' فراز سے کتنی فریفتگی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ٹین ایجر کی عمر اسی پچاسی سے متجاوز تھی۔''

''فراز ٹین ایجر کا شاعر ہے......'' ''فراز صرف عنفوانِ شباب میں داخل ہونے والوں کا شاعر ہے۔'' ......'' فراز کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ کا شاعر ہے اور بس'' ......فراز پر یہ

الزامات ہر طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں مگر وہ اس الزام تراشی سے بے نیاز' نہایت خوب صورت شاعری تخلیق کیے جا رہا ہے۔ اگر حسن و جمال اور عشق و محبت کی اعلیٰ درجے کی شاعری گھٹیا ہوتی تو میر اور غالب' بلکہ دنیا بھر کے عظیم شاعروں کے ہاں گھٹیا شاعری کے انباروں کے سوا اور کیا ہوتا۔ فراز کی شاعری میں بیشتر یقیناً حسن و عشق ہی کی کارفرمائیاں ہیں اور یہ وہ موضوع ہے جو انسانی زندگی میں سے خارج ہو جائے تو انسانوں کے باطن صحراؤں میں بدل جائیں' مگر فراز تو بھرپور زندگی کا شاعر ہے۔ وہ انسان کے بنیادی جذبوں کے علاوہ اس آشوب کا بھی شاعر ہے جو پوری انسانی زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس نے جہاں انسان کی محرومیوں' مظلومیتوں اور شکستوں کو اپنی غزل و نظم کا موضوع بنایا ہے' وہیں ظلم و جبر کے عناصر اور آمریت و مطلق العنانی پر بھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے اور اس سلسلے میں غزل کا ایسا ایسا شعر کہا ہے اور ایسی ایسی نظم لکھی ہے کہ پڑھتے یا سنتے ہوئے اس کے مداحین جھومتے ہیں اور اس کے معترضین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یہ دونوں پہلو زندگی کی حقیقت کے پہلو ہیں اور حقیقت ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے۔

ایک بار ایک معروف شاعر نے چند دوسرے ہر دلعزیز شعراء کے علاوہ احمد فراز پر بھی تک بندی کا الزام عائد کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شاعر اگر احمد فراز کا سا ایک شعر بھی کہہ لیتے تو اس احساس کمتری کا مظاہرہ کرنے کا تکلف نہ فرماتے۔ مثال کے طور پر فراز کے صرف دو شعر دیکھیے۔ اگر یہ تک بندی ہے تو نہ جانے اعلیٰ معیار کی شاعری کسے کہتے ہیں:

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہی

میں صرف ان دو شعروں کے حوالے سے کہوں گا کہ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں پوری فارسی اور اردو غزل کی دل آویز روایات گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

احمد فراز کے والد مرحوم اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ پھر فراز کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ کوہاٹ اور پشاور میں اردو شعروشاعری کا ایک بھرپور ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی غزل دراصل صنفِ غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے۔ اس کا ایک ایک مصرع ایسا گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ اور چونکہ فراز کی غزل تکمیل (PERFECTION) کی انتہا ہے اس لیے جب وہ نظم کہتا ہے، تو اس کی بھی ایک ایک لائن برجستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ چنانچہ احمد فراز غزل اور نظم کا ایسا شاعر ہے جو دورِ حاضر کے چند گنے چنے معتبر ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔

یہ جو بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ فراز کے ہاں حسن وعشق کی زمیوں کے ساتھ ساتھ تغیر وانقلاب کی جو للکار ہے وہ اسے تضادات کا شکار بنا دیتی ہے، تو یہ حضرات اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسن وعشق کی منازل سے گزرے بغیر انقلاب کی للکار اعتماد سے محروم رہتی ہے اور وہی شعراء صحیح انقلابی ہوتے ہیں جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے اندازہ داں ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ فراز کا یہ کمال بھی لائقِ صد تحسین ہے کہ کڑی آزمائشوں میں سے گزرنے کے باوجود وہ اپنی انقلابی شاعری میں بھی سچا شاعر رہا ہے۔ وہ نعرہ زنی نہیں کرتا، صورتحال کا تجزیہ کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کو اپنی سوچ کے مطابق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ صدفی صد درست ہے کہ:

دیکھو تو بیاضِ شعر میری
اک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

فراز کے یہ نام نہاد ''تضادات'' تو اس کے فن کی توانائی ہیں۔ بصورت دیگر وہ ذات اور کائنات کو ہم رشتہ کیسے کر سکتا تھا اور اس طرح کے شعر کیسے کہہ سکتا تھا کہ:

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

خود آگاہی کا یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔

میں فراز کے شاعرانہ کمالات کے اس نہایت مختصر تاثر کے آخر میں اس کی غزل میں تغزل کی اس بھرپور فضا سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہوں جو غزل کی سی لطیف صنفِ سخن کی سچی شناخت ہے۔

یہ صرف چند اشعار ہیں جو اس وقت یادداشت میں تازہ ہیں:

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار، مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے

یہ اس دور کی غزل ہے جس پر احمد فراز نے سالہا سال تک حکمرانی کی ہے اور جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک الگ باب کی متقاضی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

انتساب

ہماری چاہتوں کی بزدلی تھی

ورنہ کیا ہوتا

اگر یہ شوق کے مضموں

وفا کے عہد نامے

اور دلوں کے مرثیے

اک دوسرے کے نام کر دیتے

زیادہ سے زیادہ

چاہتیں بدنام ہو جاتیں

ہماری دوستی کی داستانیں عام ہو جاتیں

تو کیا ہوتا

یہ ہم جو زیست کے ہر عشق میں سچائیاں سوچیں

یہ ہم جن کا اثاثہ تشنگی، تنہائیاں، سوچیں

یہ تحریریں

ہماری آرزو مندی کی تحریریں

بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں
فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہوں
یہ تحریریں
اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا
شعر کے مدّاح
ہم پر تہمتیں دھرتے
ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں
اور یہ افواہیں
کسی پیلی نگارش میں
ہمیشہ کے لیے مرقوم ہو جاتیں
ہماری ہستیاں مذموم ہو جاتیں
نہیں ایسا نہ ہوتا
اور اگر بالفرض ہوتا بھی
تو پھر ہم کیا
سبک سارانِ شہرِ حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟
سگانِ کوچۂ شہرت کے غوغا

کالے بازاروں کے دلالوں سے ڈرتے ہیں؟
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں' پاکیزہ ہیں' زندہ ہیں
بلا سے ہم اگر مصلوب ہو جاتے
یہ سودا کیا بُرا تھا
گر ہماری قبر کے کتبے
تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے!

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اُس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشمِ تصوّر سے دشتِ امکاں میں
پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گُلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنّا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متّصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فرازؔ آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فرازؔ اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

جدائیاں تو مقدّر ہیں پھر بھی جانِ سفر
کچھ اور دُور ذرا ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

رہِ وفا میں حریفِ خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

تُو سامنے ہے تو پھر کیوں یقیں نہیں آتا
یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں موجود تیری محفل میں
جو لالچوں سے تجھے، مجھ کو جل کے دیکھتے ہیں

یہ قُرب کیا ہے کہ یکجاں ہوئے نہ دُور رہے
ہزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی
سواب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

یہ کون ہے سرِ ساحل کہ ڈوبنے والے
سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک تو نہ کندن ہوئے نہ راکھ ہوئے
ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خبر
چلو فراز کو، اے یار چل کے دیکھتے ہیں

○
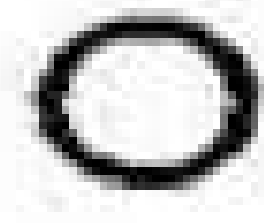
وہ تفاوتیں ہیں مرے خدا کہ یہ تُو نہیں کوئی اور ہے
کہ تو آسمان پہ ہو تو ہو، پہ سرِ زمیں کوئی اور ہے

وہ جو راستے تھے وفا کے تھے یہ جو منزلیں ہیں سزا کی ہیں
مرا ہمسفر کوئی اور تھا مرا ہمنشیں کوئی اور ہے

مرے جسم و جاں میں ترے سوا نہیں اور کوئی بھی دوسرا
مجھے پھر بھی لگتا ہے اس طرح کہ کہیں کہیں کوئی اور ہے

میں اسیر اپنے غزال کا میں فقیرِ دشتِ وصال کا
جو ہرن کو باندھ کے لے گیا وہ سبکتگیں کوئی اور ہے

میں عجب مسافرِ بے اماں کہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں
مجھے یہ لگا مرا خاکداں یہ زمیں نہیں کوئی اور ہے

رہے بے خبر مرے یار تک، کبھی اس پہ شک، کبھی اُس پہ شک
مرے جی کو جس کی رہی للک، وہ قمر جبیں کوئی اور ہے

یہ جو چار دن کے ندیم ہیں انہیں کیا فرآز کوئی کہے
وہ محبتیں وہ شکائتیں ہمیں جس سے تھیں کوئی اور ہے

To Let

میں تیرے لطفِ فراواں کا معترف ہوں مگر
حسین و خندہ جبیں میزبان تھی وہ بھی

مطابقت تو نہیں پر مماثلت ہے بہت
تو آسمان سہی سائبان تھی وہ بھی

تو میرے شام و سحر کا خیال رکھتی ہے
تری طرح ہی بہت مہربان تھی وہ بھی

تجھے بھی لوگ بڑی چاہتوں سے دیکھتے ہیں
نگاہِ اہلِ تمنا کی جان تھی وہ بھی

تو ایک حرف و حکایت کے سلسلے کی طرح
طلسمِ ہوشربا داستان تھی وہ بھی

تو لے اڑی ہے مجھے جس طرح نشے کی طرح
جو سچ کہوں تو مزے کی اڑان تھی وہ بھی

میں اپنے گھر کی طرح اس میں بس گیا تو کُھلا
کرائے کے لیے خالی مکان تھی وہ بھی

ن

نہ جانے ظرف تھا کم یا انا زیادہ تھی
کلاہ سر سے تو قد سے قبا زیادہ تھی

رمیدگی تھی تو پھر ختم تھا گریز اس پر
سپردگی تھی تو بے انتہا زیادہ تھی

غرور اس کا بھی کچھ تھا جدائیوں کا سبب
کچھ اپنے سر میں بھی شاید ہوا زیادہ تھی

وفا کی بات الگ پر جسے جسے چاہا
کسی میں حسن، کسی میں ادا زیادہ تھی

فرازؔ اس سے وفا مانگتا ہے جاں کے عوض
جو سچ کہیں تو یہ قیمت ذرا زیادہ تھی

○

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

اس کی وہ جانے اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فرازؔ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں گرم تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اُس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

جو بھی ملا اسی کا دل حلقہ بگوشِ یار تھا
اس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

وہ شام کیا تھی

وہ شام کیا تھی جب اس نے بڑی محبت سے
کہا کہ تُو نے یہ سوچا بھی ہے کبھی احمد

خدا نے کتنی تجھے نعمتیں عطا کی ہیں
وہ بخششیں کہ ہیں بالا تر از شمار و عدد

یہ خال و خد یہ وجاہت یہ تندرست بدن
گرجتی گونجتی آواز استوار جسد

بسانِ لالۂ صحرا تپاں تپاں چہرہ
مثالِ نخلِ کہستاں دراز قامت و قد

اگرچہ نام و نسب کا نہیں ہے تُو قائل
پہ ہیں قبیلۂ سادات سے ترے اب و جد

بجائے خود ہنرِ شاعری ہے اک انعام
پھر اس پہ اورشرف ہے قبولیت کی سند

ترے کلام پہ یہ قول صادق آتا ہے
کہ شعرِ خوب ز دل خیزد و بہ دل ریزد

کبھی غزل سنو تیری تو ایسا لگتا ہے
درونِ نَے چوں دلِ نَے نوازمی نالد

ترا نہالِ سخن بارور ہوا کیا کیا
اگرچہ سایہ کناں تجھ پہ تھے کئی برگد

قبولِ عام نے تجھ کو وہ آبرو بخشی
کہ خلق پیار کرے تجھ سے اور حریف حسد

محبتیں تجھے اتنی ملیں کہ دل میں ترے
نہ دشمنی نہ عداوت نہ ضد نہ بغض نہ کد

تو اپنے عصر میں ممتاز ہے یہی ہے بہت
چراغ کس کا وگرنہ جلا ہے تا بہ ابد

اگر ہو محفلِ خوباں تو جانِ محفل تُو
اگر ہو حلقۂ رنداں تو، تُو سرِ مسند

کبھی ہے رقص کناں نعرہ زن سرِ بازار
کبھی ہے راندۂ دربار صورتِ سرمد

امیرِ شہر کی نظروں میں مفسد و سرکش
خطیبِ شہر کے خطبوں میں کافر و مرتد

کبھی وطن بدری کے عذابِ جاں لیوا
کبھی اسیری و درماندگی کی ساعتِ بد

اگر کریں جو تقابل ترے مصائب کا
زمانہ سخت کم آزار تھا بجانِ اسد

سو یہ بھی ایک ہے اعزاز اہلِ دل کے لیے
سو یہ بھی دین ہے اس کی بہر کسے نہ دہد

نہ تیرے دوش پہ خلعت کوئی کفن کی طرح
نہ تیرے سر پہ ہے دستارِ کبر کا گنبد

سعادت ایست کہ ہرگز بزورِ بازو نیست
"کہ تانہ رحمتِ پروردگار می بخشد"

میں بت بنا رہا سنتا رہا بیانِ صنم
چوں پیشِ آئنہ رُو نفس نہ کشد

وہ خود غزل تھی سو جائز مبالغے اس کے
مگر نہ یوں بھی کہ چھو لیں غلو و کذب کی حد

وہ بولتی گئی جذبات کے بہاؤ میں تھی
وہ کہہ رہی تھی خرد کو جنوں، جنوں کو خرد

جب اس کی ہوش ربا گفتگو تمام ہوئی
تو اس سے میں نے کہا اے قرارِ جان و جسد

میں کب رہا ہوں مگر اس کی ذات سے غافل
کہ جس کی مجھ پہ رہیں مہربانیاں بے حد

یہ رنگ و نقش یہ حرف و نوا یہ صحتِ جاں
یہ شاعری یہ شرف سب اسی کی داد و مدد

یہ فن بہانہ ہے اظہارِ دردِ دل کے لیے
نہ یہ کہ شہرہ و شہرت تھا گوہرِ مقصد

مگر مرے لیے سو بخششوں کی اک بخشش
مری طلب کے بیابان میں تری آمد

ترے ہی طلعت و گیسو کی دھوپ چھاؤں ہے
کہاں کی صبحِ بنارس کہاں کی شامِ اودھ

تو خود بہار شمائل ہے داد خواہ ترے
گلاب و لالہ و نسرین و نسترن کے سبد

ترا جمال ترا التفات تیری وفا
مرے دیارِ تمنا کی آخری سرحد

مرا وجود مرے خواب میری دولتِ فن
تری ہی نذر ہیں اے جاں اگر قبول افتد

کجاست سنگِ درِ یارِ من کہ دل بہ نہم
بر آستانۂ شاہاں فرازؔ پا نہ نہد

(نذرِ جالب)

کب تک درد کے تحفے بانٹو خونِ جگر سوغات کرو
"جالب ھُن گل مُک گئی اے"، ھُن جان نوں ہی خیرات کرو

کیسے کیسے دشمنِ جاں اب پرسشِ حال کو آئے ہیں
ان کے بڑے احسان ہیں تم پر اٹھو تسلیمات کرو

تم تو ازل کے دیوانے اور دیوانوں کا شیوہ ہے
اپنے گھر کو آگ لگا کر روشن شہر کی رات کرو

اے بے زور پیادے تم سے کس نے کہا کہ یہ جنگ لڑو
شاہوں کو شہہ دیتے دیتے اپنی بازی مات کرو

اپنے گریباں کے پرچم میں لوگ تمہیں کفنائیں گے
چاہے تم منصور بنو یا پیرویٔ سادات کرو

فیض گیا اب تم بھی چلے تو کون رہے گا مقتل میں
ایک فرازؔ ہے باقی ساتھی، اس کو بھی اپنے ساتھ کرو

○
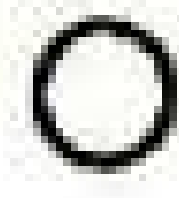
اک دست شناس نے مجھ سے کہا ترے ہاتھ کی ریکھائیں ہیں عجب
تیرے پاؤں انوکھی بیڑی ہے ترے گلے میں مالائیں ہیں عجب

ترے پیار کے کتنے قصّے ہیں تری ذات کے کتنے حصّے ہیں
کہیں رام ہے تُو کہیں راون ہے، تری پیت کی چرچائیں ہیں عجب

کبھی ندیا جیسے بول کہے کبھی ساگر جیسا شور کرے
ترا بھید بھرا لہجہ نہ کھلے تری ساری کویتائیں ہیں عجب

کئی تجھ کو دنیا دار کہیں کئی لوگ تجھے اوتار کہیں
ترا جیون ناٹک جیسا ہے ترے نام کی لیلائیں ہیں عجب

کبھی پریم کا رس چھڑکائے تُو کبھی برہا بس ٹپکائے تو
کبھی زہر ہے تُو کبھی امرت ہے ترے دھیان کی گیتائیں ہیں عجب

کوئی گوپی تجھ کو جان کہے کوئی دیوی تجھ پر مان کرے
تو کرشن نہ شام مگر پھر بھی تری رسیا رادھائیں ہیں عجب

تو اک متوالہ پنچھی ہے اس شاخ اڑے اس باگ پھرے
کیا ٹھور ٹھکانہ ہو تیرا ترے من کی دنیائیں ہیں عجب

کبھی اوس سے پیاس بجھائے تُو کہیں دریا کو ٹھکرائے تُو
تیرا ہنستا چہرہ اور لگے تری آنکھوں کی برکھائیں ہیں عجب

تو بنجارہ یا جوگی ہے، تو کوی ہے یا کوئی روگی ہے
تو گیانی ہے یا مورکھ ہے ترے بارے میں سب رائیں ہیں عجب

○
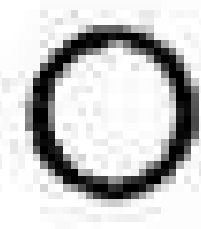
اِدھر اک دل اُدھر ساری خدائی
دُہائی ہے خداوندا دُہائی

فقیہوں کی وہی ہذیاں نویسی
خطیبوں کی وہی ہرزہ سرائی

کسی کے سر پہ دستارِ ریا ہے
کسی کے تن پہ دلقِ کبریائی

نہ یہ شائستۂ وصلِ صنم ہیں
نہ وہ سرگشتۂ رسمِ خدائی

ہوئی ہے عام اب صحرا فروشی
بہت ہے ان دنوں دریا نمائی

یہاں اندھے ہیں آئینوں کے گاہک
یہاں گونگوں کو زعمِ خوشنوائی

وفا کیسی کہاں کی دوستداری
جہاں احباب ہوں یوسف کے بھائی

محبت کا صلہ کیا ہے مگر ہاں
ملامت، طعن، تہمت، جگ ہنسائی

خوشی کیا ہے گئی تو عمر بھر کو
گھڑی بھر کے لیے آئی تو آئی

"ق"

دِلا تو کس ڈگر پر چل دیا ہے
یہاں راہی کی منزل نارسائی

گرہ جب بھی پڑی کارِ جنوں میں
خرد کب ناخنِ تدبیر لائی

وہاں بے سود ہے شکوہ شکایت
جہاں وضعِ جہاں ہو کج ادائی

نہیں نوحہ گری تیرا قرینہ
نہیں شیوہ ترا ماتم سرائی

ترا مسلک محبت ہے محبت
بلا سے راس آئی یا نہ آئی

فضا میں اجنبی تاریکیاں ہیں
جلا کوئی چراغِ آشنائی

اٹھا ساغر کہ دنیا چار دن ہے
قیامت کی گھڑی آئی کہ آئی

سجا محفل کہ تیرا ہمنشیں ہے
وہ بُت، چاہے جسے ساری خدائی

سنا ایسی غزل کوئی کہ پیارے
نہیں اب تک کسی مطرب نے گائی

○

بہار آئی تو کیا کیا یاد آئی
تری خوش قامتی لالہ قبائی

تصور نے عجب باندھا ہے نقشہ
تحیّر نے گرہ منہ پر لگائی

نہ کوئی سامنے تھا استعارہ
نہ کوئی ذہن میں تشبیب آئی

فروغِ حسن سے خیرہ تھی آنکھیں
سو ابرِ زلف نے چلمن گرائی

ودیعت ہے تری جلوہ گری کی
جو حیرت آئنہ خانوں نے پائی

تری آنکھوں کے آگے کب سے نرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ گدائی

نشاطِ وصل سے ہیں تتلیاں مست
دُھلا سبزے سے زنگارِ جدائی

کوئی بھنورا اڑا ہے گنگناتا
کلی نے آنکھ کھولی مسکرائی

عنادل لُوٹ کر ہیں زمزمہ خواں
گلابوں کا زرِ ناکتخدائی

ہوا اپنی نمی سے آپ بوجھل
فضا رنگوں کی بارش میں نہائی

لگی تھی رنگِ گل سے باغ میں آگ
صبا پاؤں کہیں رکھنے نہ پائی

قصیدہ اِک بہارِ ناز کا تھا
سو مثلِ برگِ گل تشبیب آئی

زلیخائے سخن نے مدتوں بعد
قبا کے بند کھولے گنگنائی

غزل میں ہو گیا خونِ جگر صرف
کہاں کی لوح کیسی روشنائی

پرِ طاؤس کی صورت ہے قرطاس
قلم نے مُوقلم کی چھب دکھائی

گریز آساں کہاں جب طبعِ شاعر
ہو سرمستِ مئے نغمہ سرائی

ادھر موزوں طبیعت موج پر ہو
ادھر مضموں ہو تیری دلربائی

کب آیا زنگِ الفت آئنے پر
جمی ہے کب کسی دریا پہ کائی

بہت دن ہو گئے تھے شعر لکھے
نہ آمد تھی نہ فصلِ لب کشائی

غمِ دنیا میں سرگرداں تھے ایسے
نہ دل رویا نہ تیری یاد آئی

تجھے کھویا تو یوں لگتا ہے جیسے
گنوا دی زندگی بھر کی کمائی

ترا احمد فراؔز اب بھی ترا ہے
کجائی اے نگارِ من کجائی

بھلی سی ایک شکل تھی

بھلے دنوں کی بات ہے
بھلی سی ایک شکل تھی
نہ یہ کہ حسنِ تام ہو
نہ دیکھنے میں عام سی

نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہگزر لگے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے

کوئی بھی رُت ہو اس کی چھب
فضا کا رنگ روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی
وہ سردیوں کی دھوپ تھی

نہ مدتوں جدا رہے
نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتۂ وفا پہ ضد
نہ یہ کہ اذنِ عام ہو

نہ ایسی خوش لباسیاں
کہ سادگی گلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی
کہ آئینہ حیا کرے

نہ اختلاط میں وہ رم
کہ بد مزہ ہوں خواہشیں
نہ اس قدر سپردگی
کہ زچ کریں نوازشیں

نہ عاشقی جنون کی
کہ زندگی عذاب ہو
نہ اسقدر کٹھور پن
کہ دوستی خراب ہو

کبھی تو بات بھی خفی
کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشتِ زعفراں
کبھی اداسیوں کا بن

○

سنا ہے ایک عمر ہے
معاملاتِ دل کی بھی
وصالِ جانفزا تو کیا
فراقِ جانگسل کی بھی

سو ایک روز کیا ہوا
وفا پہ بحث چھڑ گئی
میں عشق کو امر کہوں
وہ میری ضد سے چڑ گئی

میں عشق کا اسیر تھا
وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو
وہ بدتر از ہوس کہے

وہ شجر حجر نہیں کہ ہم
ہمیش پا بہ گِل رہیں
نہ ڈھور ہیں کہ رسیاں
گلے میں مستقل رہیں

محبتوں کی وسعتیں
ہمارے دست و پا میں ہیں
بس ایک در سے نسبتیں
سگانِ باوفا میں ہیں

میں کوئی پینٹنگ نہیں
کہ اک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو
اسی کے پریم میں رہوں

تمہاری سوچ جو بھی ہو
میں اس مزاج کی نہیں
مجھے وفا سے بیر ہے
یہ بات آج کی نہیں،،

نہ اس کو مجھ پہ مان تھا
نہ مجھ کو اس پہ زعم ہی
جو عہد ہی کوئی نہ ہو
تو کیا غمِ شکستگی

سو اپنا اپنا راستہ
ہنسی خوشی بدل دیا
وہ اپنی راہ چل پڑی
میں اپنی راہ چل دیا

بھلی سی ایک شکل تھی
بھلی سی اس کی دوستی
اب اس کی یاد رات دن
نہیں، مگر کبھی کبھی

○

آنکھوں میں ستارے تو کئی شام سے اترے
پر دل کی اداسی نہ در و بام سے اترے

کچھ رنگ تو ابھرے تری گل پیرہنی کا
کچھ زنگ تو آئینۂ ایّام سے اترے

ہوتے رہے دل لمحہ بہ لمحہ تہہ و بالا
وہ زینہ بہ زینہ بڑے آرام سے اترے

جب تک ترے قدموں میں فروکش ہیں سبوکش
ساقی خطِ بادہ نہ لبِ جام سے اترے

بے طمع نوازش بھی نہیں سنگدلوں کی
شاید وہ مرے گھر بھی کسی کام سے اترے

اوروں کے قصیدے فقط آورد تھے جاناں
جو تجھ پہ کہے شعر وہ الہام سے اترے

اے جانِ فرازؔ اے مرے ہر دکھ کے مسیحا
ہر زہر زمانے کا ترے نام سے اترے

○

ساقیا ایک نظر جام سے پہلے پہلے
ہم کو جانا ہے کہیں شام سے پہلے پہلے

نو گرفتارِ وفا، سعیٔ رہائی ہے عبث
ہم بھی الجھے تھے بہت دام سے پہلے پہلے

خوش ہو اے دل کہ محبت تو نبھا دی تو نے
لوگ اُجڑ جاتے ہیں انجام سے پہلے پہلے

اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے

سامنے عمر پڑی ہے شبِ تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

کتنا اچھا تھا کہ ہم بھی جیا کرتے تھے فرازؔ
غیر معروف سے، گمنام سے، پہلے پہلے

○

دکھ چھپائے ہوئے ہیں ہم دونوں
زخم کھائے ہوئے ہیں ہم دونوں

ایسا لگتا ہے پھر زمانے کو
یاد آئے ہوئے ہیں ہم دونوں

تُو کبھی چاندنی تھی دھوپ تھا میں
اب تو سائے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کو پا کر بھی
کچھ گنوائے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے سے شرمندہ
سر جھکائے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کی چاہت کو
اب بھلائے ہوئے ہیں ہم دونوں

عشق کیسا کہاں کا عہد فرازؔ
گھر بسائے ہوئے ہیں ہم دونوں

○

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے وہ کسے پیاسا رکھے

عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے مری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے

کم نہیں طمعِ عبادت بھی تو حرصِ زر سے
فقر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے

ہنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا، خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فرازؔ
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

○

کسی دل سے بابِ قبول تک جو مسافتیں ہیں دعاؤں کی
یہ لب و کلام کا عجز ہے کہ رعونتیں ہیں خداؤں کی

کبھی شہر جاؤ تو دیکھنا کسی بیسوا کی دکان پر
کئی شعر میری بیاض کے کئی لعبتیں مرے گاؤں کی

تجھے دوسروں سے ملا ہے یہ مری جستجو کا صلہ ہے یہ
ترے تخت و تاج سے قیمتی ہے یہ گرد میرے کھڑاؤں کی

یہ عجیب قریۂ بے اماں مری جاں حذر کہ یہاں وہاں
جہاں دوستوں کے ہیں سائباں وہیں ٹولیاں ہیں بلاؤں کی

نہ مزاج ابرِ کرم کا ہے نہ علاج بارشِ غم کا ہے
تری دوستی کو میں کیا کروں جو نہ دھوپ کی ہے نہ چھاؤں کی

مرے کجکلاہِ کشیدہ سر تُو حریمِ دل میں خرام کر
یہ دیار ہے تری سلطنت یہ زمین ہے ترے ناؤں کی

ہے سمندروں کے سفر کی دھن تو فرازؔ سُن کہ ابھی نہیں
یہ جو چال موجِ بلا کی ہے یہ جو نیتیں ہیں ہواؤں کی

○

طنابِ خیمہ نہ موجِ بلا سے ڈر کر کھینچ
اگر حباب ہے آغوش میں سمندر کھینچ

مرے حریف کھلے دل سے اب شکست بھی مان
نہ یہ کہ فرطِ ندامت سے منہ پہ چادر کھینچ

مبادا کل کسی بسمل پہ رحم آ جائے
کچھ اور روز ابھی تیغِ ناز ہم پر کھینچ

وہ حرف لکھ کہ بیاضِ سخن لہو سے سجے
قلم سے دشنہ کی صورت لکیر دل پر کھینچ

ہیں منفعل مرے قامت سے تیری دیواریں
حصار تو مرے قد کاٹھ کے برابر کھینچ

نہیں تو اس کے تغافل کا کیا گلہ کرنا
جو حوصلہ ہے تو دامانِ یار بڑھ کر کھینچ

کہ شاعری بھی تو جزوِ پیمبری ہے فرازؔ
سو رنجِ خلقِ خدا صورتِ پیمبر کھینچ

غنیم سے

مرے تن کے زخم نہ گِن ابھی
مری آنکھ میں ابھی نور ہے
مرے بازوؤں پہ نگاہ کر
جو غرور تھا وہ غرور ہے

ابھی تازہ دم ہے مرا فرس
نئے معرکوں پہ تُلا ہوا
ابھی رزم گاہ کے درمیاں
ہے مِرا نشان کھلا ہوا

تری چشمِ بد سے رہیں نہاں
وہ تہیں جو ہیں مری ذات کی
مجھے دیکھ قبضۂ تیغ پر
ہے گرفت ابھی مرے ہاتھ کی

وہ جو دشتِ جاں کو چمن کرے
یہ شرف تو میرے لہو کا ہے
مجھے زندگی سے عزیز تر
یہ جو کھیل تیغ و گلو کا ہے

تجھے مان جوشن و گُرز پر
مرا حرفِ حق مری ڈھال ہے
ترا جور و ظلم بلا سہی
مرا حوصلہ بھی کمال ہے

میں اسی قبیلے کا فرد ہوں
جسے ناز صدق و یقیں پہ ہے
یہی نامہ بر ہے بہار کا
جو گلاب میری جبیں پہ ہے

اب وہ کہتے ہیں

اب وہ کہتے ہیں تم کوئی چارہ کرو
جب کوئی عہد و پیماں سلامت نہیں
اب کسی کنج میں بے اماں شہر کی
کوئی دل کوئی داماں سلامت نہیں

تم نے دیکھا ہے سرسبز پیڑوں پہ اب
سارے برگ و ثمر خار و خس ہو گئے
اب کہاں خوبصورت پرندوں کی رُت
جو نشیمن تھے اب وہ قفس ہو گئے

صحنِ گلزار خاشاک کا ڈھیر ہے

اب درختوں کے تن پر قبائیں کہاں

سرو و شمشاد سے قمریاں اُڑ گئیں

شاخِ زیتون پر فاختائیں کہاں

شیخ منبر پہ نا معتبر ہو چکا

رند بدنام کوئے خرابات میں

فاصلہ ہو تو ہو فرق کچھ بھی نہیں

فتوۂ دیں میں اور کفر کی بات میں

اب تو سب راز داں ہمنوا نامہ بر

کوئے جاناں کے سب آشنا جا چکے

کوئی زندہ گواہی بچی ہی نہیں

سب گنہگار سب پارسا جا چکے

اب کوئی کس طرح قُم بہ اذنی کہے
اب کہ جب شہر کا شہر سنسان ہے
حرفِ عیسیٰ نہ صورِ سرافیل ہے
حشر کا دن قیامت کا میدان ہے

مرگِ انبوہ بھی جشن ساماں نہیں
اب کوئی قتل گاہوں میں جائے تو کیا
کب سے توقیرِ لالہ قبائی گئی
کوئی اپنے لہو میں نہائے تو کیا

○

ہجرِ جاناں کی گھڑی اچھی لگی
اب کے تنہائی بڑی اچھی لگی

قریۂ جاں پر اداسی کی طرح
دھند کی چادر پڑی اچھی لگی

ایک تنہا فاختہ اُڑتی ہوئی
اک ہرن کی چوکڑی اچھی لگی

زندگی کی گھپ اندھیری رات میں
یاد کی اک پھلجھڑی اچھی لگی

شہرِ دل اور اتنے لوگوں کا ہجوم
وہ الگ سب سے کھڑی اچھی لگی

ایک شہزادی مگر دل کی فقیر
اس کو میری جھونپڑی اچھی لگی

دل میں آ بیٹھی غزل سی وہ غزال
یہ تصوّر کی گھڑی اچھی لگی

تیرا دکھ، اپنی وفا، کارِ جہاں
جو بھی شے مہنگی پڑی اچھی لگی

آنکھ بھی برسی بہت بادل کے ساتھ
اب کے ساون کی جھڑی اچھی لگی

یہ غزل مجھ کو پسند آئی فرازؔ
یہ غزل اس کو بڑی اچھی لگی

○

ہوئے جاتے ہیں کیوں غمخوار قاتل
نہ تھے اتنے بھی دل آزار قاتل

مسیحاؤں کو جب آواز دی ہے
پلٹ کر آ گئے ہر بار قاتل

ہمیشہ سے ہلاک اک دوسرے کے
مرا سر اور تری تلوار قاتل

تری آنکھوں کو جاناں کیا ہوا ہے
کبھی دیکھے نہ تھے بیمار قاتل

وہاں کیا داد خواہی کیا گواہی
جہاں ہوں منصفوں کے یار قاتل

فراز اس دشمنِ جاں سے گلہ کیا
ہمیشہ سے رہے دلدار قاتل

○

فراق و وصل کیا ہیں عاشقی کے تجربے ہیں
مگر اس سے زیادہ زندگی کے تجربے ہیں

وفا کارِ زیاں بربادیٔ جاں مرگ ساماں
ہمارے ہی نہیں شاید سبھی کے تجربے ہیں

کوئی بت گر سرِ کہسار بیٹھا تیشہ زن ہے
یہ ہم کیا ہیں، یہ تم کیا ہو، اسی کے تجربے ہیں

تری ہیروں سی آنکھیں اور ترے یاقوت سے لب
کسی انساں کے چہرے پر کسی کے تجربے ہیں

وہی ہیں شعر جاناں جو تری چاہت میں لکھے
کہ باقی جو بھی ہیں سب شاعری کے تجربے ہیں

فرازؔ اس کو کوئی قاتل کہے کوئی مسیحا
جدا اک دوسرے سے ہر کسی کے تجربے ہیں

○

نئے سفر میں ابھی ایک نقص باقی ہے
جو شخص ساتھ نہیں اس کا عکس باقی ہے

اٹھا کے لے گئے وزدانِ شب چراغ تلک
سو، کور چشم پتنگوں کا رقص باقی ہے

گھٹا اٹھی ہے مگر ٹوٹ کر نہیں برسی
ہوا چلی ہے مگر پھر بھی حبس باقی ہے

الٹ پلٹ گئی دنیا وہ زلزلے آئے
مگر خرابۂ دل میں وہ شخص باقی ہے

فرازؔ آئے ہو تم اب رفیقِ شب کو لیے
کہ دورِ جام نہ ہنگامِ رقص باقی ہے

○

تجھ پر بھی نہ ہو گمان میرا
اتنا بھی کہا نہ مان میرا

میں دکھتے ہوئے دلوں کا عیسیٰ
اور جسم لہو لہان میرا

کچھ روشنی شہر کو ملی تو
جلتا ہے جلے مکان میرا

یہ ذات یہ کائنات کیا ہے
تو جان مری جہان میرا

تو آیا تو کب پلٹ کے آیا
جب ٹوٹ چکا تھا مان میرا

جو کچھ بھی ہوا یہی بہت ہے
تجھ کو بھی رہا ہے دھیان میرا

○

اک شب تھا وہ میہمان میرا
کچھ اور ہی تھا جہان میرا

تھے صحن میں خوشبوؤں کے خیمے
تھا رشکِ چمن مکان میرا

وہ شاخِ گلاب اور اس پر
ہر پھول تھا ترجمان میرا

وہ چاند تھا میرے بازوؤں میں
آغوش تھا آسمان میرا

یاد آتا ہے اب بھی اس کا کہنا
"میرا شاعر پٹھان میرا"

احمد سے فرازؔ ہو چکا ہوں
پر خوش نہیں خاندان میرا

کالی دیوار

کل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سارے جگ میں جس کی جے جے کار

ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سج دھج سچ مچ دلداروں کی مثل

روشنیوں کے رنگ بہیں یوں رستہ نظر نہ آئے
من کی آنکھوں والا بھی یاں اندھا ہو ہو جائے

بالا بام چراغاں رستے روپ بھرے بازار
جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خوابوں کا سنسار

ایک سفید حویلی جس میں بہت بڑی سرکار
بیٹھیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار

یہیں پہ جادوگر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے
ہر بستی ناگاساکی، ہیروشیما بن جائے

اسی حویلی سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار
لوگوں کی وہ بھیڑ لگی تھی چلنا تھا دشوار

اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے ہزاروں نام
ان ناموں کے بیچ لکھا تھا "شہدائے وِتنام"

دُور دُور سے جمع ہوئے تھے طرح طرح کے لوگ
آنکھوں آنکھوں ویرانی تھی چہروں چہروں سوگ

بیکل بہنیں گھائل مائیں کرلاتی بیوائیں
ساجن تم کس دیس سدھارے پوچھیں محبوبائیں

اپنے پیاروں دلداروں کا اوجھل مکھڑا ڈھونڈیں
اس کالی دیوار پہ ان کے نام کا ٹکڑا ڈھونڈیں

دلوں میں غم پلکوں پر شبنم ہاتھوں میں پھول اُٹھائے
اس ناموں کے قبرستان کا بھید کوئی کیا پائے

نا تربت نا کتبہ کوئی نا ہڈی نا ماس
پھر بھی پاگل نیناں کو تھی پیا ملن کی آس

کہیں کہیں دیوار پہ چسپاں ایک سفید گلاب
جیسے ماں کا کوئی آنسو جیسے باپ کا خواب

سبھی کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکے ایک سوال
کس کارن مٹی میں ملائے ہیروں جیسے لال

پیلے دیس پہ ہم نے کیا کیا اندھیارے برسائے
اس کے جیالے تو کٹ مر کر روشنیاں لے آئے

لیکن اتنے چاند گنوا کر ہم نے بھلا کیا پایا
ہم بدقسمت ایسے جن کو دھوپ ملی نا چھایا

مٹھ موتی دے کر حاصل کی یہ کالی دیوار
یہ کالی دیوار جو بس ہے اک خالی دیوار

یہ کالی دیوار جو ہے ناموں کا قبرستان
واشنگٹن کے شہر میں دفن ہیں کس کس کے ارمان

بنگلہ دیش

(ڈھاکہ میوزیم دیکھ کر)

کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی
مرے ہی لوگ تھے میرے ہی دست و بازو تھے
میں جس دیار میں بے یار و بے رفیق پھروں
یہاں کے سارے صنم میرے آشنا رُو تھے

کسے خبر تھی کہ عمروں کی عاشقی کا مآل
دلِ شکستہ و چشمِ پُر آب جیسا تھا
کسے خبر تھی کہ اس دجلۂ محبت میں
ہمارا ساتھ بھی موج و حباب جیسا تھا

خبر نہیں یہ رقابت تھی ناخداؤں کی
کہ یہ سیاستِ درباں کی چال تھی کوئی
دو نیم ٹوٹ کے ایسی ہوئی زمیں جیسے
مری اکائی بھی خواب و خیال تھی کوئی

یہ میوزیم تو ہے اس روزِ بد کا آئینہ
جو نفرتوں کی تہوں کا حساب رکھتا ہے
کہیں لگا ہوا انبارِ استخواں تو کہیں
لہو میں ڈوبا ہوا آفتاب رکھتا ہے

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن
عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں
مرے خدا مری بینائی چھین لے مجھ سے
میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمتِ یاراں

میں سر جھکائے ہوئے درد کو چھپائے ہوئے
پلٹ کر آیا تو ہر رہگزر اندھیری تھی
میں سوچتا ہوں ابھی تو چراغ روشن تھے
کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی

○

کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
اب کے موسم میں بھی عالم وہی ہُو کا نکلا

دستِ قاتل سے کچھ امیّدِ شفا تھی، لیکن
نوکِ خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا

عشق الزام لگاتا تھا ہوس پر کیا کیا
یہ منافق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا

جی نہیں چاہتا میخانے کو جائیں، جب سے
شیخ بھی بزم نشیں اہلِ سبو کا نکلا

دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آئے تھے
یہ شبستاں بھی اسی غالیہ مُو کا نکلا

ہم عبث سوزن و رشتہ لیے گلیوں میں پھرے
کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا

یارِ بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فرازؔ
جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا

○

غم رگ و پے میں نہیں جب سے شرارے کی مثال
شاعری روٹھ گئی ہے کسی پیارے کی مثال

جانے کب آئے نظر مصرعۂ تر کی صورت
جانے کب سانس چلے سینے میں آرے کی مثال

جانے کب ہاتھ لگے یاد کا موتی کوئی
جانے کب لفظ سجے نام تمہارے کی مثال

بے سبب کیسے طبیعت ہو سخن پر مائل
کوئی ترغیب تو ہو تیرے اشارے کی مثال

غمِ دنیا تو وہ قلزم ہے کہ دل کا مضمون
غرق ہوتا چلا جاتا ہے کنارے کی مثال

ہم بھی کیا ہیں کہ وہاں دل کی دوا پوچھتے ہیں
چارہ گر بھی ہو جہاں درد کے مارے کی مثال

ہم کہاں جائیں جہاں تجھ سے ستمگر نہ ملیں
اب تو ہر شہر ہوا شہر تمہارے کی مثال

○

ہونٹ ہیروں سے نہ چہرہ ہے ستارے کی مثال
پھر بھی لاوے تو کوئی دوست ہمارے کی مثال

مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہو
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

زندگی اوڑھ کے بیٹھی تھی ردائے شبِ غم
تیرا غم ٹانک دیا ہم نے ستارے کی مثال

عاشقی کو بھی ہوس پیشہ تجارت جانیں
وصل ہے نفع تو ہجراں ہے خسارے کی مثال

ہم کبھی ٹوٹ کے روئے نہ کبھی کھل کے ہنسے
رات شبنم کی طرح صبح ستارے کی مثال

ناسپاسی کی بھی حد ہے جو یہ کہتے ہو فرازؔ
زندگی ہم نے گزاری ہے گزارے کی مثال

○

دوستو یوں بھی نہ رکھو خُم و پیمانہ کُھلے
چند ہی روز ہوئے ہیں ابھی میخانہ کُھلے

اک ذرا رنگ پہ آئے تو سہی جوشِ بہار
اک ذرا ڈھنگ کا موسم ہو تو دیوانہ کھلے

روئے دلبر کی طرح ابر سے جھلکے مہتاب
کاکلِ شب کی طرح گیسوئے جانانہ کھلے

جس کے ہجراں میں کتابوں پہ کتابیں لکھ دیں
اس پہ گر حال ہمارا نہیں کھلتا نہ کھلے

مہرباں ایسی ہے تنہائی کہ پل بھر کے لیے
چشم بستہ ہو تو یادوں کا پریخانہ کھلے

ہم تو سچ مچ کے ہی کردار سمجھ بیٹھے تھے
لوگ آخر کو کہیں صورتِ افسانہ کھلے

جانے یہ پیار سکھاتے ہیں کہ انکار فرازؔ
ہم پہ بت خانہ و کعبہ و کلیسا نہ کھلے

من و تُو

قصیدہ

معاف کر مری مستی خدائے عزّ و جل
کہ میرے ہاتھ میں ساغر ہے میرے لب پہ غزل

کریم ہے تو مری لغزشوں کو پیار سے دیکھ
رحیم ہے تو سزا و جزا کی حد سے نکل

ہے دوستی تو مجھے اذنِ میزبانی دے
تُو آسماں سے اتر اور مری زمین پہ چل

میں پا بہ ِگل ہوں مگر چُھو چکا منارۂ عرش
سو تُو بھی دیکھ یہ خاک و خشارہ و جنگل

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ خاکداں میرا
یہ کوہسار یہ قلزم یہ دشت یہ دلدل

مرے جہاں میں زمان و مکان و لیل و نہار
ترے جہاں میں ازل ہے ابد نہ آج نہ کل

مرے لہو میں ہے برقِ تپاں کا جذب و گریز
ترے سبو میں مئے زندگی نہ زہرِ اجل

ترا بہشت ہے دشتِ جمود و بحرِ سکوت
مری سرشت ہے آشوبِ ذات سے بیکل

تُو اپنے عرش پہ شاداں ہے سو خوشی تیری
میں اپنے فرش پہ نازاں ہوں اے نگارِ ازل

مجھے نہ جنتِ گم گشتہ کی بشارت دے
کہ مجھ کو یاد ابھی تک ہے ہجرتِ اوّل

ترے کرم سے یہاں بھی مجھے میسّر ہے
جو زاہدوں کی عبادت میں ڈالتا ہے خلل

وہ سیر چشم ہوں، میرے لیے ہے بے وقعت
جمالِ حور و شرابِ طہور و شیر و عَسل

گناہگار تو ہوں پر نہ اس قدر کہ مجھے
صلیب روزِ مکافات کی لگے بوجھل

کہیں کہیں کوئی لالہ کہیں کہیں کوئی داغ
مری بیاض کی صورت ہے میری فردِ عمل

وہ تُو کہ عقدہ کشا و مسب الاسباب
یہ میں کہ آپ معمہ ہوں آپ اپنا ہی حل

میں آپ اپنا ہی ہابیل اپنا ہی قابیل
مری ہی ذات ہے مقتول و قاتل و مقتل

برس برس کی طرح تھا نفس نفس میرا
صدی صدی کی طرح کاٹتا رہا پل پل

ترا وجود ہے لاریب اشرف و اعلیٰ
جو سچ کہوں تو نہیں میں بھی ارزل و اسفل

یہ واقعہ ہے کہ شاعر وہ دیکھ سکتا ہے
رہے جو تیرے فرشتوں کی آنکھ سے اوجھل

وہ پرفشاں ہیں مگر غولِ شپرّک کی طرح
سو رائیگاں ہیں کہ جوں چشمِ کور میں کاجل

مرے لیے تو ہے سو بخششوں کی اِک بخشش
قلم جو افسر و طبل و علم سے ہے افضل

یہی قلم ہے کہ جس کی ستارہ سازی سے
دلوں میں جوت جگاتی ہے عشق کی مشعل

یہی قلم ہے جو دُکھ کی رُتوں میں بخشتا ہے
دلوں کو پیار کا مرہم سکون کا صندل

یہی قلم ہے کہ اعجازِ حرف سے جس کے
تمام عشوہ طرازانِ شہر ہیں پاگل

یہی قلم ہے کہ جس نے مجھے یہ درس دیا
کہ سنگ و خشت کی زد پر رہیں گے شیش محل

یہی قلم ہے کہ جس کی صریر کے آگے
ہیں سرمہ در گلو خونخوار لشکروں کے بگل

یہی قلم ہے کہ جس کے ہنر سے نکلے ہیں
رہِ حیات کے خم ہوں کہ زلفِ یار کے بل

یہی قلم ہے کہ جس کی عطا سے مجھ کو ملے
یہ چاہتوں کے شگوفے محبتوں کے کنول

تمام سینہ فگاروں کو یاد میرے سخن
ہر ایک غیرتِ مریم کے لب پہ میری غزل

اسی نے سہل کئے مجھ پہ زندگی کے عذاب
وہ عہدِ سنگ زنی تھا کہ دورِ تیغِ اجل

اسی نے مجھ کو سجھائی ہے راہِ اہلِ صفا
اسی نے مجھ سے کہا ہے پلِ صراط پہ چل

اسی نے مجھ کو چٹانوں کے حوصلے بخشے
وہ کربلائے فنا تھی کہ کار گاہِ جدل

اسی نے مجھ سے کہا اسمِ اہلِ صدق امر
اسی نے مجھ سے کہا سچ کا فیصلہ ہے اٹل

اسی کے فیض سے آتشکدے ہوئے گلزار
اسی کے لطف سے ہر زشت بن گیا اجمل

اسی نے مجھ سے کہا جو ملا بہت کچھ ہے
اسی نے مجھ سے کہا جو نہیں ہے ہاتھ نہ مل

اسی نے مجھ کو قناعت کا بوریا بخشا
اسی کے ہاتھ سے دستِ درازِ طمع ہے شل

اسی کی آگ سے میرا وجود روشن ہے
اسی کی آب سے میرا ضمیر ہے صیقل

اسی نے مجھ سے کہا بیعتِ یزید نہ کر
اسی نے مجھ سے کہا مسلکِ حسین پہ چل

اسی نے مجھ سے کہا زہر کا پیالہ اٹھا
اسی نے مجھ سے کہا، جو کہا ہے اس سے نہ ٹل

اسی نے مجھ سے کہا عاجزی سے مات نہ کھا
اسی نے مجھ سے کہا مصلحت کی چال نہ چل

اسی نے مجھ سے کہا غیرتِ سخن کو نہ بیچ
کہ خونِ دل کے شرف کو نہ اشرفی سے بدل

اسی نے مجھ کو عنایت کیا یدِ بیضا
اسی نے مجھ سے کہا سحرِ سامری سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا عقل تہہ نشینی ہے
اسی نے مجھ سے کہا ورطۂ خرد سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا وضعِ عاشقی کو نہ چھوڑ
وہ خواہ عجز کا لمحہ ہو یا غرور کا پل

اذیتوں میں بھی بخشی مجھے وہ نعمتِ صبر
کہ میرے دل میں گرہ ہے نہ میرے ماتھے پہ بل

ہیں ثبت سینۂ مہتاب پر قدم میرے
ہیں منتظر مرے مریخ و مشتری و زحل

تری عطا کے سبب یا مری انا کے سبب
کسی دعا کا ہے موقع نہ التجا کا محل

سو تجھ سا ہے کوئی خالق نہ مجھ سی ہے مخلوق
نہ کوئی تیرا ہے ثانی نہ کوئی میرا بدل

فرازؔ تو بھی جنوں میں کدھر گیا ہے نکل
ترا دیارِ محبت، تری نگارِ غزل

ق

ٹپک چکا ہے بہت تیری آنکھ سے خونناب
برس چکا ہے بہت تیرے درد کا بادل

کچھ اور دیر ابھی حسرتِ وصال میں رہ
کچھ اور دیر ابھی آتشِ فراق میں جل

کسی بہار شمائل کی بات کر کہ بنے
ہر ایک حرف شگوفہ ہر ایک لفظ کنول

○
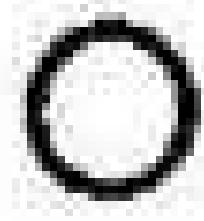
تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
تُو مری پہلی محبت تھی مری آخری دوست

لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
یہ تو دنیا ہے مری جاں کئی دشمن کئی دوست

تیرے قامت سے بھی لپٹی ہے امربیل کوئی
میری چاہت کو بھی دنیا کی نظر کھا گئی دوست

یاد آئی ہے تو پھر ٹوٹ کے یاد آئی ہے
کوئی گزری ہوئی منزل کوئی بھولی ہوئی دوست

اب بھی آئے ہو تو احسان تمہارا لیکن
وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست

تیرے لہجے کی تھکن میں ترا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست

بارشِ سنگ کا موسم ہے مرے شہر میں تو
تُو یہ شیشے سا بدن لے کے کہاں آ گئی دوست

میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط "آپ کی دوست"

○

تمام بزم تھی مشتاقِ حرف بابتِ دوست
سو میں نے اور بڑھا دی ذرا حکایتِ دوست

وفا تو اپنے سے ہوتی ہے دوسرے سے نہیں
سو اس بنا پہ کوئی کیا کرے شکایتِ دوست

یہ لوگ سرو و صنوبر کا ذکر کرتے ہیں
یہ استعارے نہیں حسبِ قدّ و قامتِ دوست

وہ بے نیاز بھی ہو گا مگر یہ بات سمجھ
ہر ایک عرض نہیں درخورِ سماعتِ دوست

ادھر ادھر نہ یونہی زندگی لٹاتے پھرو
کہ صرف دل ہی نہیں جاں بھی ہے امانتِ دوست

تمام وار کسی ایک مہرباں کے نہیں
کوئی ہے بخششِ دنیا کوئی عنایتِ دوست

تمہی بتاؤ کہ طے کس طرح کرو گے فرازؔ
یہ عمر بھر کا سفر اور بے رفاقتِ دوست

○
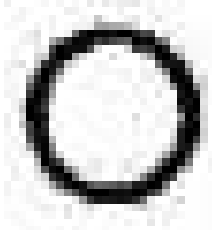
فقط ہنر ہی نہیں عیب بھی کمال کے رکھ
سو دوسروں کے لیے تجربے مثال کے رکھ

نہیں ہے تاب تو پھر عاشقی کی راہ نہ چل
یہ کار زارِ جنوں ہے جگر نکال کے رکھ

سبھی کے ہاتھ دلوں پر نگاہ تجھ پر ہے
قدح بدست ہے ساقی قدم سنبھال کے رکھ

فریب سے نہ مجھے صید کر وقار سے کر
سو اسقدر بھی نہ دانہ قریب جال کے رکھ

فرازؔ بھول بھی جا سانحے محبت کے
ہتھیلیوں پہ نہ اِن آبلوں کو پال کے رکھ

○
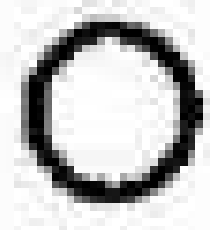
شبِ نشاط تھی یا صبحِ پُرملال تھی وہ
تھکن سے چُور تھا میں نیند سے نڈھال تھی وہ

میں اس کی ہمسفری میں بھی دل گرفتہ رہا
کہ ہر قدم پہ جدائی کا احتمال تھی وہ

ادھر ادھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے
مرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ

وہ پیرہن تھی مگر جسم و جاں رہی میری
کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسبِ حال تھی وہ

تمام عمر اگر زندگی نے زخم دیئے
تمام عمر کے زخموں کا اندمال تھی وہ

یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے
اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

فراز یاد ہے اب تک سپردگی اس کی
ز فرق تا بقدم خواہشِ وصال تھی وہ

○

تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پرِ کاہ ہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو نبا ہے تو میں ہوں

دل نے کب شیوۂ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پر نہ ہوا میں سرِ راہے تو میں ہوں

جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشان نگاہے تو میں ہوں

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فرازؔ
صاحبِ خرقہ و پیوند کلاہے تو میں ہوں

خوابوں کے بیوپاری

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
ہم راکھ لیے ہیں جھولی میں
اور سر پہ ہے ساہوکار کھڑا

یاں بوند نہیں ہے ڈیوے میں
وہ باج بیاج کی بات کرے
ہم بانجھ زمیں کو تکتے ہیں
وہ ڈھور اناج کی بات کرے
ہم کچھ دن کی مہلت مانگیں
وہ آج ہی آج کی بات کرے

جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُر سنگیت میں سوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے

کچھ خواب سجل مُسکانوں کے
کچھ بول کبت دیوانوں کے
کچھ لفظ جنہیں معنی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ نیر وفا کی شمعوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

پھر اپنی گھائل آنکھوں سے
خوش ہو کے لہو چھڑکایا تھا
ماٹی میں ماس کی کھاد بھری
اور نس نس کو زخمایا تھا
اور بھول گئے پچھلی رُت میں
کیا کھویا تھا کیا پایا تھا

ہر بار گگن نے وہم دیا
اب کے برکھا جب آئے گی
ہر بیج سے کونپل پھوٹے گی
اور ہر کونپل پھل لائے گی
سر پر چھایا چھتری ہو گی
اور دھوپ گھٹا بن جائے گی

جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
کچھ زخمی خواب تھے کانٹوں پر
کچھ خاکستر سے کجرے تھے
اور دور افق کے ساگر میں
کچھ ڈولتے ڈوبتے بجرے تھے

اب پاؤں کھڑاؤں دھول بھری

اور جسم پہ جوگ کا چولا ہے

سب سنگی ساتھی بھید بھرے

کوئی ماسہ ہے کوئی تولا ہے

اس تاک میں یہ اس گھات میں وہ

ہر اور ٹھگوں کا ٹولا ہے

اب گھاٹ نہ گھر دہلیز نہ در

اب پاس رہا ہے کیا بابا

بس تن کی گٹھڑی باقی ہے

جا یہ بھی تُو لے جا بابا

ہم بستی چھوڑے جاتے ہیں

تو اپنا قرض چکا بابا

○
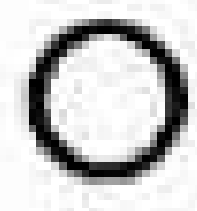
دُکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

بے طرح حالِ دل ہے اور تجھ سے
دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

ایک تُو حرف آشنا تھا مگر
اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

قاصدا! ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اے خدا دردِ دل ہے بخششِ دوست
آب و دانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اب تو اپنا بھی اس گلی میں فرازؔ
آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

○
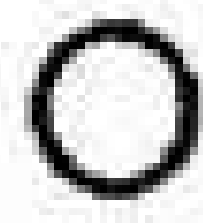
اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

تو کہ یکتا تھا بے شمار ہوا
ہم بھی ٹوٹیں تو جابجا ہو جائیں

ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں

ہم اگر منزلیں نہ بن پائے
منزلوں تک کا راستا ہو جائیں

دیر سے سوچ میں ہیں پروانے
راکھ ہو جائیں یا ہوا ہو جائیں

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

اب کے گر تُو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فرازؔ
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

وہ تری طرح کوئی تھی

یونہی دوش پر سنبھالے
گھنی زلف کے دو شالے
وہی سانولی سی رنگت
وہی نین نیند والے

وہی من پسند قامت
وہی خوشنما سراپا
جو بدن میں نیم خوابی
تو لہو میں رتجگا سا

کبھی پیاس کا سمندر
کبھی آس کا جزیرہ
وہی مہربان لہجہ
وہی میزباں وطیرہ

تجھے شاعری سے رغبت
اسے شعر یاد میرے
وہی اس کے بھی قرینے
جو ہیں خاص وصف تیرے

کسی اور ہی سفر میں
سرِ راہ مل گئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی

کسی شہرِ بے اماں میں
میں وطن بدر اکیلا
کبھی موت کا سفر تھا
کبھی زندگی سے کھیلا

مرا جسم جل رہا تھا
وہ گھٹا کا سائباں تھی
میں رفاقتوں کا مارا
وہ مری مزاج داں تھی

مجھے دل سے اس نے پُوجا
اسے جاں سے میں نے چاہا
اِسی ہمرہی میں آخر
کہیں آ گیا دوراہا

یہاں گمرہی کے امکاں
اسے رنگ و بو کا لپکا
یہاں لغزشوں کے ساماں
اسے خواہشوں نے تھپکا

یہاں دام تھے ہزاروں
یہاں ہر طرف قفس تھے
کہیں زر زمیں کا دلدل
کہیں جال تھے ہوس کے

وہ فضا کی فاختہ تھی
وہ ہوا کی راج پُتری
کسی گھاٹ کو نہ دیکھا
کسی جھیل پر نہ اُتری

پھر اک ایسی شام آئی
کہ وہ شام آخری تھی
کوئی زلزلہ سا آیا
کوئی برق سی گری تھی

عجب آندھیاں چلیں پھر
کہ بکھر گئے دل و جاں
نہ کہیں گلِ وفا تھا
نہ چراغِ عہد و پیماں

وہ جہاز اتر گیا تھا
یہ جہاز اتر رہا ہے
تری آنکھ میں ہیں آنسو
مرا دل بکھر رہا ہے

تُو جہاں مجھے ملی ہے
وہ یہیں جدا ہوئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی

○

چمن میں نغمہ سرائی کے بعد یاد آئے
قفس کے دوست رہائی کے بعد یاد آئے

وہ جن کو ہم تری قربت میں بھول بیٹھے تھے
وہ لوگ تیری جدائی کے بعد یاد آئے

وہ شعر یوسفِ کنعاں تھے جن کو بیچ دیا
ہمیں قلم کی کمائی کے بعد یاد آئے

حریمِ ناز کے خیرات بانٹنے والے
ہر ایک در کی گدائی کے بعد یاد آئے

ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے جانِ فرازؔ
کہ تجھ کو ساری خدائی کے بعد یاد آئے

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں

برس یا دو برس کی قیدِ تنہائی بھی گر ہوتی

تو پھر بھی زندگی لاچار ہو جاتی

محبت بے وفا اور دوستی بیزار ہو جاتی

مگر تم نے تو سارے ہجر کے بیمار موسم

بیکلی بیچارگی اور کرب کے

بوسیدہ بستر پر گزارے ہیں

سرِ بالیں

کسی کے ہاتھ میں چارہ گری کی شمعِ لرزاں

اور نہ آوازوں کے روشن داں

نشاطِ خواب کیا

جب وا رہے دروازۂ مژگاں

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں

پرانی داستانوں میں تو ہوتا تھا

کہ کوئی شاہزادی یا کوئی نیلم پری

دیووں یا آسیبوں کی قیدی

اپنے آدم زاد دیوانے کی رہ تکتے

شبیہہِ سنگ ہو جاتی

مگر وہ داستانیں تھیں

پھر ان میں بھی تو آخرکار

اس کا باوفا ساونت شہزادہ

سمندر پار کرتا

وار کرتا

کوہساروں کے جسد مسمار کرتا

ان طلسماتی حصاروں سے اسے آزاد کر کے

ساتھ لے جاتا

مگر تُو داستانوں کا کوئی کردار

یا پارینہ قصوں کا کوئی حصہ نہ تھی

تُو نے تو خود آزارگی اپنے تئیں ہی منتخب کی تھی

کئی دن پھر کئی دن پھر نئے دن

بدن کا دوزخی سیّال ایندھن

اور لہو کا آتشیں لاوا

رگوں میں دوڑنے پھرنے کا پھر قائل نہیں رہتا

تعلق کی چٹانیں ریت بن جاتی ہیں

دلداری کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں

ارماں آنسوؤں کا رزق بن جاتے ہیں

اور دل ایک ہی صورت پہ پھر مائل نہیں رہتا

وفاداری بشرطِ استواری کا چلن

پھر عاشقی کی راہ میں حائل نہیں رہتا

بدل جاتے ہیں خال و خد

پگھل جاتے ہیں جسم و جاں

یہ دکھ آساں نہیں جاناں

○

به اندازِ مثنویِ قدیم

تم کہ سنتے رہے اوروں کی زبانی لوگو
ہم سناتے ہیں تمہیں اپنی کہانی لوگو

کون تھا دشمنِ جاں وہ کوئی اپنا تھا کہ غیر
ہاں وہی دشمنِ جاں دلبرِ جانی لوگو

زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو

سامنے اس کے دِکھے نرگسِ شہلا بیمار
روبرو اس کے بھرے سرو بھی پانی لوگو

اس کی گفتار میں خندہ تھا شگفتِ گل کا
اس کی رفتار میں چشمے کی روانی لوگو

اس کے ملبوس سے شرمندہ قبائے لالہ
اس کی خوشبو سے جلے رات کی رانی لوگو

ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دنیا تھی مگر اس کی دوانی لوگو

عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے یوں بھی
کب رہا راز کوئی رازِ نہانی لوگو

ایک تو عشق کیا عشق بھی پھر میر سا عشق
اس پہ غالب کی سی آشفتہ بیانی لوگو

حیلہ جُو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اُس پہ آئی نہ ہمیں بات چھپانی لوگو

داستاں کوئی بھی ہو ذکر کسی شخص کا ہو
ہم نے اس نام سے تمہید اٹھائی لوگو

ہاں وہی نام کہ جس نام سے وابستہ ہے
ہر محبت وہ نئی ہو کہ پرانی لوگو

ہم ہی سادہ تھے کیا اس پہ بھروسا کیا کیا
ہم ہی ناداں تھے کہ لوگوں کی نہ مانی لوگو

ہم تو اس کے لیے گھر بار بھی تج بیٹھے تھے
اس ستمگر نے مگر قدر نہ جانی لوگو

کس طرح بھول گیا قول و قسم وہ اپنے
کتنی بے صرفہ گئی یاددہانی لوگو

جس طرح تتلیاں باغوں سے سفر کر جائیں
جیسے الفاظ میں مر جائیں معانی لوگو

اب غزل کوئی اترتی ہے تو نوحے کی طرح
شاعری ہو گئی اب مرثیہ خوانی لوگو

شمع رویوں کی محبت میں یہی ہوتا ہے
رہ گیا داغ فقط دل کی نشانی لوگو

○
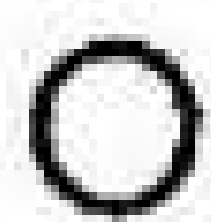
عشق نشّہ ہے نہ جادو جو اتر بھی جائے
یہ تو اک سیلِ بلا ہے سو گزر بھی جائے

تلخیٔ کام و دہن کب سے عذابِ جاں ہے
اب تو یہ زہر رگ و پے میں اتر بھی جائے

اب کے جس دشتِ تمنا میں قدم رکھا ہے
دل تو کیا چیز ہے امکاں ہے کہ سر بھی جائے

ہم بگولوں کی طرح خاک بسر پھرتے ہیں
پاؤں شل ہوں تو یہ آشوبِ سفر بھی جائے

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

شہرِ جاناں سے پرے بھی کئی دنیائیں ہیں
ہے کوئی ایسا مسافر جو ادھر بھی جائے

اس قدر قرب کے بعد ایسے جدا ہو جانا
کوئی کم حوصلہ انساں ہو تو مر بھی جائے

ایک مدت سے مقدر ہے غریب الوطنی
کوئی پردیس میں ناخوش ہو تو گھر بھی جائے

○
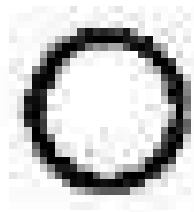
تُو کس طرح سے یہ احساں مگر اُتارے گا
عطا کرے گا جو دستار، سر اُتارے گا

نہ مانگ ایک بھی لمحہ خوشی کا دنیا سے
یہ قرض وہ ہے جسے عمر بھر اُتارے گا

یہ عمر بھر کی تھکن ایک دن تو اُترے گی
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اُتارے گا

یہ لگ رہا ہے ستاروں کی چال سے کہ فلک
کوئی عذاب مری خاک پر اُتارے گا

چمن کو زہر سے سینچا ہے باغباں نے فرازؔ
اجل گرفتہ ہی کوئی ثمر اُتارے گا

○

میں دھوکا ہوں تُو دھوکا ہے
ترک و طلب ہر دُو دھوکا ہے

تیری ہر مُسکان فریبی
میرا ہر آنسو دھوکا ہے

سارے گل بوٹے مصنوعی
رنگ، نمو، خوشبو دھوکا ہے

کون ہے یکتا کون یگانہ
مدحِ رخ و گیسو دھوکا ہے

لافِ محبت ہرزہ سرائی
دلبرِ غالیہ مُو دھوکا ہے

چاکِ جگر اک شعبدہ بازی
اُس پر کارِ رفو دھوکا ہے

مکر ہے عشق کا دیوانہ پن
حسن کا سب جادو دھوکا ہے

نالۂ قمری وہمِ سماعت
سروِ کنارِ جُو دھوکا ہے

رنگِ پرِ طاؤس نمائش
سحرِ رمِ آہو دھوکا ہے

عکس فقط نیرنگ نظر کا
ہر بُتِ آئنہ رُو دھوکا ہے

نشّہ کہاں ہے زخم کا مرہم
ساقی و جام و سبو دھوکا ہے

کاوشِ لوح و قلم افسانہ
قصۂ تیغ و گلو دھوکا ہے

کس نے خون کے آنسو روئے
دامن لہو لہو دھوکا ہے

مستوں کی مستی دکھلاوا
صوفی کی یا ہُو دھوکا ہے

مسجد میں بٹ مار ہے ملّا
مندر میں بھکشُو دھوکا ہے

کذب و ریا کی ڈفلی باجے
چیلا جھوٹ، گرو دھوکا ہے

جو پاگل تھے سو پاگل ہیں
حکمت کا دارُو دھوکا ہے

اُتر دکھن پورب پچھّم
اس جگ میں ہر سُو دھوکا ہے

○
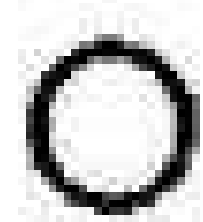
غنیم سے بھی عداوت میں حد نہیں مانگی
کہ ہار مان لی لیکن مدد نہیں مانگی

ہزار شکر کہ ہم اہلِ حرفِ زندہ نے
مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

بہت ہے لمحۂ موجود کا شرف بھی مجھے
سو اپنے فن سے بقائے ابد نہیں مانگی

قبول وہ جسے کرتا وہ التجا نہیں کی
دعا جو وہ نہ کرے مسترد، نہیں مانگی

میں اپنے جامۂ صد چاک سے بہت خوش ہوں
کبھی عبا و قبائے خرد نہیں مانگی

"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
جبھی تو گورکنوں سے لحد نہیں مانگی

میں سر برہنہ رہا پھر بھی سر کشیدہ رہا
کبھی کلاہ سے توقیرِ قد نہیں مانگی

عطائے درد میں وہ بھی نہیں تھا دل کا غریب
فرازؔ میں نے بھی بخشش میں حد نہیں مانگی

○
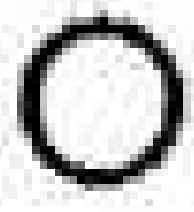
خود سے روٹھوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رو لوں

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے
تُو جو چاہے تو ترے واسطے دریا رو لوں

اور معیار رفاقت کے ہیں ایسا بھی نہیں
جو محبت سے ملے ساتھ اسی کے ہو لوں

خود کو عمروں سے مقفّل کیے بیٹھا ہوں فرازؔ
وہ کبھی آئے تو خلوت کدۂ جاں کھولوں

تجھے کیا خبر کہ جاناں

تُو نہ تھی کوئی سرائے
کہ میں رات بھر ٹھہر کے
سفر اختیار کرتا
میں نہ تھا کوئی مسافر
کہ جو گھر نگر کو تج کر
کہیں اور پیار کرتا

انہی بستیوں میں ورنہ
کئی دل کئی نگاہیں
کوئی نیند کا ہو رسیا
تو ہزار خوابگاہیں

کہیں کاکلوں کے بادل
کہیں قامتوں کی چھاؤں
کہیں شہر آرزو کے
کہیں حسرتوں کے گاؤں

کہیں خلوتیں دکانیں
کہیں جسم بیوپاری
نہ کسی صنم کو شکوہ
نہ دکھی کوئی پجاری

یہ عجب قمار خانے
یہاں ہار بھی کمائی
نہ کسی کا مان ٹوٹا
نہ کسی نے چوٹ کھائی

کوئی بے مآل قصہ
کوئی داستاں ادھوری
یہ سپردگی جدائی
تو وہ اختلاط دوری

یہاں شوق بھی تماشا
یہاں عشق بھی ملامت
نہ تو وصل خوبصورت
نہ فراق ہی قیامت

یہ ضرورتوں کے میلے
یہ قیام کے بہانے
یہ تھکن اتارنے کے
سبھی عارضی ٹھکانے

یہ ہمارے عہد و پیماں
تجھے کیا خبر کہ جاناں
یہ دنوں کی بات کب تھی
یہ رفاقتوں کی صدیاں

یہ جو درد ہے امر ہے
کہ وفا ہے حرفِ آخر
تو نہ تھی کوئی سرائے
نہ میں ہوں کوئی مسافر

O
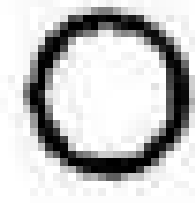
روزِ روشن بھی ترا لوحِ سیہ بھی تیری
پھر تو یارب مری رودادِ گنہ بھی تیری

ابرو باراں پہ نہ کر ناز کہ اے دستِ کریم
کشتِ بے دانہ و بے آب وگیہ بھی تیری

امتحاں دل کا نہیں طبل وعلم کا ہے تو پھر
جا یہ لشکر بھی ترا تیغ و زرہ بھی تیری

وہ بھی ہیں کہ تجھے تیرو کماں بخشے تھے
اوراب ڈھونڈتے پھرتے ہیں پنہ بھی تیری

واعظا منبر و مسند پہ نہ اترا اتنا
یہ بتا کیا کسی دل میں ہے جگہ بھی تیری

کیا کریں حرص محبت میں بھی در آتی ہے
ورنہ کافی تھی کبھی ایک نگہ بھی تیری

کیا اسی بھول کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب مجھے یاد نہیں سالگرہ بھی تیری

یونہی دو دن کی ملاقات پہ اترا نہ فراز
ہے کہیں یار کی محفل میں جگہ بھی تیری

بودلک

منظوم ڈرامہ

ڈاکٹر رفیق جان

کے نام

مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گُم
مری نظر میں تیرے خدّ وخال تیرے خواب تھے

وہ کافر جو......

بہت پہلے میں نے ایک افریقی ادیب (اب اس کا نام یاد نہیں) کا ایک کھیل The Oda Oak پڑھا تھا۔ مجھے یہ بہت پسند آیا اور میں نے چاہا کہ اسے اردو نظم میں منتقل کر دوں۔ تھوڑا بہت آغاز بھی کیا مگر پھر کتاب کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے ریڈیو پاکستان پشاور کے ڈائریکٹر جنرل جناب سجاد حیدر صاحب نے کہا کہ میں چترال جاؤں اور وہاں کافرستان وادی کے لوگوں کی بود و باش کے بارے میں کچھ مواد اکٹھا کروں۔ میری مدد کے لیے انہوں نے ایک انجینئر سعید اور ایک پروڈیوسر باسط سلیم صدیقی جو خود بھی ایک ممتاز ڈرامہ نگار ہیں' ہمراہ کر دیئے۔ میں نے اپنے طور پر اس قافلے میں اپنے دیرینہ دوست ضیاء الدین ضیاء کو بھی شامل کر لیا اور ہم سرکاری جیپ میں چترال کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ سفر کچھ تو ہمراہیوں کی وجہ سے اور کچھ ایک نئی دنیا کی دید کے شوق نے کافی Thrilling بنا دیا' ہم وہاں ہفتہ دس دن تک کافرستان کی مختلف وادیوں کیلاش بمبریت وغیرہ میں گھومتے رہے'' کافر'' لوگوں کے رہن سہن' رسم و رواج' زبان' رقص اور موسیقی کے بارے میں مشاہدات جذب اور مواد جمع کرتے رہے۔ یہ سفر بہت ہی زیادہ دلچسپ' معلوماتی اور کہیں کہیں انتہائی خطرناک بھی تھا۔ ہم وہاں کی کیلاشی زبان اور دوسری مقامی بولیوں کے لوک گیت اور ان کی دُھنیں اس طرح خوشی اور تجسس سے جمع کرتے رہے جیسے مغربی مہم جو افریقہ سے سونا اور قیمتی پتھر لایا کرتے تھے۔ بہر طور یہ سفر اپنی جگہ ایک سفر نامہ کا حق رکھتا تھا میرا ارادہ بھی تھا کہ میں کچھ لکھوں لیکن میں نے جو Notes تیار کیے تھے وہ کہیں ادھر ادھر

ہو گئے اور آج تک نہیں ملے۔ البتہ ایک شام جس کا پورا تاثر میرے دل و دماغ میں نقش ہو گیا وہ کافر دوشیزاؤں کا رقص تھا اور ان کی سرخیل کشان بی بی کا حسن اور دلفریب شخصیت تھی۔ یہیں مجھے غالب کا مصرعہ بار بار یاد آیا۔

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

چنانچہ پشاور پہنچتے ہی میری پہلی تخلیق کشان بی بی تھی جو میری کتاب نایافت میں شامل ہے۔ دوسری تخلیق بودلک کا منظوم ڈرامہ ہے جو کافرستان کے بعض روایتی کرداروں اور کچھ افریقی مصنف کے اوڈا اوک (Oda Oak) کا ملغوبہ ہے۔ میں اسے نہ تو ترجمہ کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی (Adaptation) جب ریڈیو پاکستان پشاور نے جشن تمثیل کے لیے منظوم کھیل کا تقاضا کیا تو میرے ذہن میں کافرستان کے کردار' وہاں کے رسم و رواج اور محبت و رقابت کے جذبات لشکارنے لگے۔ چنانچہ میں نے یہ منظوم کھیل لکھنا شروع کر دیا۔ کھیل کے آخری حصے تو اس طرح لکھے گئے کہ ادھر ریڈیو پاکستان کا نقل نویس کاغذ اور قلم لیے تیار بیٹھا ہوتا اور ادھر میں منظوم سطروں کی پرچیاں لکھ لکھ کر اس کے حوالے کرتا اور مسودے کی کاپیوں کے بنتے ہی ڈرامہ آرٹسٹ اس کی ریہرسل کرنے لگتے۔ اس عجلت اور افراتفری میں اس منظوم کھیل کی تکمیل ہوئی۔

جب یہ نشر ہوا تو خاصی Controversy چلی۔ بعض لوگوں نے اسے فحش اور قابل ملامت گردانا اور بعض سننے والوں نے اسے تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا۔

بہر طور یہ مسودہ پڑا رہا۔ پچھلے دنوں کہیں کباڑ خانے میں کسی اور مسودہ کی تلاش میں تھا کہ یہ پلندہ مل گیا۔ میں نے ایک نظر دیکھا پھر پڑھا۔ مجھے اچھا لگا اور اپنے پبلشر آصف محمود صاحب کے سپرد کر دیا۔ اور ان کا خیال یہ ہے کہ اسے چھاپ کر آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ میں اس کے بارے میں اور کچھ تو نہیں کہہ سکتا مگر صرف یہ کہ ہے پڑھنے کی چیز۔ کہ نہ مجھے اس تحریر پر فخر ہے اور نہ ہی ندامت۔

احمد فراز

کردار

بودلک……	وادی کا مضبوط بیٹا
قلش……	بودلک کا فلسفی دوست
ژگول……	بودلک کی منتخب دلہن
پیر دانا……	وادی کا روحانی بزرگ
پہلا بڑا	
دوسرا بڑا	وادی کے اکابرین
تیسرا بڑا	

پہلا منظر

بودلک...... قلش میرے ہمدم

کہو کوئی اچھی خبر لے کے آئے ہو

میں صبح سے مضطرب تھا

تمہیں کیا خبر

مجھ پہ یہ رات کتنی کڑی تھی

میں اک پل بھی سویا نہیں

اور پھر...... نیند آتی تو کیسے

جب اک خوبصورت دلہن کی

جواں گرم سانسوں سے

میرا بدن

ایک چیتے کی مانند وحشی بنا تھا

تمہیں میری بے صبر آنکھوں نے نخلِ مقدس

کی جانب سے آتے

ہزاروں امیدوں سے دیکھا

یقیناً کوئی مژدۂ جانفزا لے کے آئے ہو

کیا تم نے نخلِ مقدس کے درویش دانا سے

میرے لیے بات کی......؟

قلش...... بودلک پاک معبد کا درویش کب چاہتا ہے

کہ وہ تیرے بارے میں باتیں کرے

یا وہ مجھ سے ملے

کیونکہ اس کو یہ شک ہے

کہ میں غیر لوگوں کی مشکوک حکمت کا پرچار کرتا ہوں

تم جانتے ہو

یہاں تیری موجودگی پاک روحوں کی آسودگی میں

خلل ڈالتی ہے

...... تجھے علم ہے بودلک

اجنبی حملہ آور یہاں سے مجھے اور کچھ دوسرے بدنصیبوں کو

پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف لے گئے تھے

مگر میری قسمت

کہ میں ان کے چنگل سے خود کو بڑی مشکلوں سے چھڑا کر

یہاں جب سے آیا ہوں

بستی کے پیرانِ دانا کے ادراک میں

ناپسندیدہ ہوں
اور نخلِ مقدس کا بوڑھا پروہت
مجھے دیکھنا تک نہیں چاہتا
کیونکہ اس کو شبہ ہے
کہ میں غیر لوگوں میں رہ کر نئی طرز سے سوچنے لگ گیا ہوں

بودلک...... تو کیا اس کڑے وقت میں
تم بھی مجھ سے الگ ہو گئے ہو؟

مرے دوست
داناؤں نے سچ کہا ہے
کہ گرتا ہوا پیڑ کلہاڑیوں ہی کو آواز دیتا ہے
میں بھی اب ایسا ہی اک نخلِ افتادہ ہوں
اور سبھی ہاتھ میری فنا کو اٹھے ہیں
سبھی دوست میرے عدو ہیں
یہاں تک
کہ اجداد و آبا کی روحیں بھی مجھ سے خفا ہیں

قلش...... قبیلے کے فرزندِ اعلیٰ
تری بیقراری کو میں جانتا ہوں
اگرچہ قبیلے کا تو سب سے مضبوط بیٹا ہے
پھر بھی ترا قلب راتوں کو روتا ہے

تیری توانائی محرومیوں کی تپش سے پگھل کر فنا ہو رہی ہے

مگر بودلک یاد رکھ

تیرے اجداد و آبا کی ناراضگی

اپنے مُردوں کی دنیا کا اک واہمہ ہے

مگر ایک متروک عورت کی تلخی حقیقت ہے

اور اس حقیقت سے ڈر

گھر کے دیوار و در کو محبت کی شمعوں سے تابندہ کر

اے قبیلے کے مضبوط فرزندِ اوّل

مری ماں اور اپنی پیاسی دلہن کو

قوی بازوؤں میں جکڑ لے

کہ محروم عورت کی خواہش بھی وحشت میں

اک گربۂ مشتعل کی طرح ہی خطرناک ہوتی ہے

سن......

ابھی ایک لمحہ ہوا میں نے

تیری جواں سال بیوی کو دیکھا

جو پانی کی گاگر اٹھائے

چناروں کے چشمہ سے ہو کر عجب دلربا چال سے

جھومتی آ رہی تھی

مرے دوست

اس کے جواں جسم کے زیر و بم کا ترنم
......کسی پیاسے چیتے کی مانند تھا
بودلک
اس کا تشنہ بدن ہر جواں کی نظر کے لیے
ایک بھرپور دعوت ہے
جا اور اسے اپنی مضبوط باہوں کے حلقے میں لے لے
ترے گھر کے اندر سکوں ہو
تو شاید
کہ باہر کے طوفان بھی ختم ہو جائیں

بودلک...... شاید
قلش کس قدر بے یقینی ہے اس لفظ میں
میں اسی بے یقینی سے
اور اپنی پیاسی دلہن سے بغلگیر ہونے کی منہ زور خواہش سے
پاگل ہوا جا رہا ہوں

قلش...... مگر میں یہ پھر بھی کہوں گا
کہ تُو اس کے صحرا کی مانند پیاسے بدن کی تپش کو بجھانا

بودلک...... تو نے جو کچھ کہا ہے
وہ اپنے بزرگوں کے راسخ عقائد
نہ دانا پروہت کی حکمت کی رو سے غلط ہے

کہ یہ رسم انساں کی تاریخ سے بھی پرانی ہے
لیکن قلش

مجھ کو حیرت تو یوں ہے

کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو

قلش تم...... نئی حکمتوں کے پیمبر

اگر تم کو اس ہاتفِ غیب کے روبرو

بات کرنے کا یارا نہیں ہے

جو اپنے بزرگوں کی روحوں کی سب خواہشیں جانتا ہے

تو پھر میں بھی خائف ہوں

مجھ کو یہ شک ہے

کہ تو اپنے تازہ عقائد پہ ثابت قدم ہے

ہمارے بزرگوں کا یہ قول ہے

وہ پرندہ جو جرأت کے نغمے سناتا ہے

اس کی نگاہیں شکاری کے نیزے سے ڈرتی نہیں ہیں
قلش! تو بھی اک دانشِ نو کا پرچار کرتا ہے

جا..........

اور نخلِ مقدس کے درویش کا سامنا کر

تمھی نے ہمیشہ کہا ہے

کہ برتر صداقت وہی ہے

جو دکھتے دلوں کو پریشانیوں میں سکوں بخشتی ہے
قلش ...... جا
کہ میں بھی ترے جرأت آموز اقدام سے حوصلہ لوں

قلش ...... مرے جو بھی افکار ہیں جو عقائد بھی ہیں
اس کا اظہار درویشِ دانا کی نظروں میں
نا قابلِ درگزر جرم ہوگا
تو کیا تُو یہی چاہتا ہے
کہ باہر کے لوگوں سے خود کو بچا کر اگر میں یہاں آ گیا ہوں
تو اپنے ہی لوگوں کے نیزے مرا خون پی لیں
کہ ان کی نظر میں تو میں ایک کوہ گرفتہ ہوں

مانا
کہ میں اپنے لوگوں سے اب مختلف سوچنے لگ گیا ہوں
مگر مجھ پہ جن حکمتوں کا اثر ہے
میں ان کے لیے اپنی جاں تک گنوا دوں
نہیں ...... یہ نہ ہوگا
قبیلے کے مضبوط فرزند
لیکن تری بات ہی دوسری ہے
کہ تُو فخر اور سروری کی علامت ہے
تو جس نئے راستے پر چلے

لوگ ناخوش نہ ہوں گے

بودلک...... قلش میں بظاہر قبیلے کا سب سے توانا جواں ہوں

مگر سب سے مجبور...... سب سے فروتر

بزرگوں کی روحیں فقط جانتی ہیں

کہ میں

کیسے کمزوردل عورتوں کی طرح کرب سے چیختا ہوں

میں سب سے توانا سہی

اور یہ سب جانتے ہیں

کہ میں کیسے اپنے شکاری جوانوں کو لے کر

گھنے جنگلوں کے اندھیروں میں

خونخوار وحشی درندوں سے بے خوف لڑتا رہا ہوں

مگر میرے اسلاف کے کان

میرے دکھی دل کی چیخوں کو سننے سے عاری رہے ہیں

قلش...... سنو بودلک

اپنے جداد کی پاک روحیں تو ہم سے

فقط قوتیں اور قربانیاں چاہتی ہیں

یہ سچ ہے کہ میں

اپنے لوگوں میں سب سے زیادہ قوی ہوں

مرے سامنے ہیچ ہیں

یہ خطرناک دریا

یہ تاریک جنگل یہ مرگ آفریں دشت

وحشت فزا وادیاں

بدنما کوہسار

اور ان سے ادھر

دشمنوں کے پرے

پھر بھی میں کتنا بے بس ہوں لاچار ہوں

اے قلش ......ان عظیم آسمانوں کی وحشت بھری

گھن گرج سے

مرا دل لرزتا نہیں

نہ اس چمچاتے ہوئے ناگ کی آگ سے

جس کی پھنکار سے کوہساروں کے دل نیم پتوں کی طرح کانپتے

ہیں

قلش تم کو معلوم ہے

میں قبیلے کے اکثر جوانوں کو وحشی درندوں سے

لڑنا سکھاتا رہا ہوں

مجھے اپنی قوت پہ جتنا گھمنڈ اور تکبر ہو کم ہے

مگر اب میں اپنی دلہن کے بھڑکتے ہوئے جسم کو

اپنی باہوں میں لینے سے ڈرتا ہوں

کیونکہ مرے سامنے اس کا انجام ہے
وہ معصوم بچہ قبیلے کے مضبوط بیٹے کا فرزندِ اوّل
ہمیشہ کی مانند
روحوں کی آسودگی کے لیے لائقِ قتل ہوگا
یہی رسم صدیوں سے جاری ہے......لیکن......
نہیں اے نئی حکمتوں کے پیمبر قلش
یہ نہ ہوگا
قلش جب تلک پاک روحیں مرے زخم سے بے خبر ہیں
میں اپنی دلہن کو کبھی بازوؤں میں نہ لوں گا

قلش...... چڑھاوا......

بزرگوں کے مُردوں کی آسودگی بس یہی چاہتی ہے
کہ یہ رسم
انساں کی یادداشت سے بھی پرانی ہے
روزِ ازل سے چلی آرہی ہے
بہادر بن اے یودلک
اور اپنی دلہن کی بھڑکتی ہوئی خواہشوں کو بجھا
ورنہ اس کا جوان اور نشیلا بدن دوسروں کے لیے
ایک بے باک ترغیب بن جائے گا
جا اسے آہنی بازوؤں میں جکڑ لے جو ہوتا ہے ہونے دے

کل کے دکھوں کا مداوا بھی کل ہے

بودلک...... نہیں یہ نہ ہوگا قلش

میں اگر جھک گیا اب

تو نو چاند، نو ماہ بھی دور اتنے نہیں ہیں

کوئی برق پا ساعتوں کو نہیں روک سکتا

تو پھر یوں سہی

میری سرتاب خواہش مرے تلخ پتے میں ڈوبی رہے

اور ژگولہ کا یہ روگ

گھن کی طرح

اس کی الھڑ جوانی کو کھاتا رہے

اور مغرور روحوں کا ظالم تکبر

یونہی بغض سے چیختا ہی رہے

اے قلش خواہ کچھ ہو میں ہرگز اُسے میں بازوؤں میں نہ لوں گا

اگرچہ میں جی سے یہی چاہتا ہوں

مرے دوست، نو ماہ کا فاصلہ کچھ نہیں

اور پھر؟

قلش...... آنے والے زمانوں کا غم بزدلی ہے

نویلی دلہن کو نہ چھونا تو ایسا ہے

جیسے کسی قبر پر کوئی غنچہ کھلے

راہگیر اس کو اپنی ہوسناک نظروں سے دیکھیں
مگر اس کی رعنائیاں نارسا ہوں
نہیں یہ قبیلہ کے فرزندِ اعلیٰ کو زیبا نہیں

بودلک...... کیا کروں میں تو خود خواہشوں کے جہنم کا ایندھن بنا
پھنک رہا ہوں
مگر میں نہیں چاہتا
ایک معصوم جاں جس کا پیکر
مرے اور زگولہ کے خوں سے عبارت ہو
وہ صرف مُردوں کی کاذب مسرت کی خاطر فنا ہو
مری خواہشوں کی تڑپ مجھ کو اپنی دلہن کے لیے کھینچتی ہے
مگر آنے والے زمانوں کا دکھ جو مری روح کا خوف ہے
جو عذابِ نفس ہے
مجھے روکتا ہے
ہمارے لیے وصل کی لذتیں
گرم راتوں کی توصیل
طاعون کی اس بلا کو جگانا ہے جو
میری عورت کی ترسی ہوئی کوکھ میں جا بسے گی
قلش اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہوگا
کہ میں اور میری دلہن ساتھ رہ کر بھی

اک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں
یہی پیرِ درویش بھی چاہتا ہے
کہ میں اپنی خواہش کی دلدل میں دھنستا چلا جاؤں
اے دوست
بستی کے بوڑھے بڑوں کی شقاوت کا اندازہ کر
جن کے مُردہ ضمیر اور پتھر کے چہرے
مرے کرب سے لاتعلق ہیں
افسوس میری سبھی کاوشیں بے ثمر ہیں
...............وہ دیکھو
مری بدمقدر دلہن
سر پہ گاگر دھرے
اور سینے میں وحشی لہو کا سمندر لیے
اس طرف آ رہی ہے
قلش میں چلا
اس سے آنکھیں ملانا مرے واسطے اک جہنم ہے
ہر چند یوں اپنے خوابوں کے گلزار
فصلِ بہاراں میں ویران و بے رنگ و بو
دیکھنے سے تو بہتر یہی ہے
کہ میں اپنی ضد چھوڑ دوں

پر یہ مشکل ہے

میں جانتا ہوں

کہ اس کن مکن کے دوراہے پہ

میں لڑکھڑایا

تو نو چاند میرا تعاقب کریں گے

قلش میں چلا

(بودلک جاتا ہے اور ژگولہ قلش کے قریب آتی ہے)

ژگولہ...... قلش تُو نے دیکھا

مرے سورما کو

جو دن کے اجالوں میں آنکھیں چراتا ہے مجھ سے

تو شب کے اندھیروں میں میرے بھڑکتے تنفس سے ڈرتا ہے

اس کے تصور میں نو چاند زہرِ ہلاہل کے نو جام ہیں

اس کی سوچوں سے اس کا بدن یخ زدہ ہو گیا ہے

مگر میں جوانی کی تنہائیوں کے نتائج سے خائف ہوں

تم ہی کہو......اے نئی سوچ کے مدّعی؟

کیا تمہارا تدبر ہماری مدد کر سکے گا

کہ اس پیرِ دانا کا دل سنگِ خارا ہے

جو رحم و بخشش کے جذبات سے بے خبر ہے

قلش...... ژگولہ......مرے دوست کی منتخب ہم نفس

مجھ میں جرأت نہیں ہے کہ میں

پیرِ دانا سے اس سلسلے میں ملوں

ژگولہ...... مجھے اس کا پہلے ہی اندیشہ تھا

یہ تمہارے لیے سخت دشوار ہے

اور میرے لیے بھی کٹھن ہے

کہ میں اس سن و سال میں اتنی تنہا رہوں

پھر جہاں تک مری عمر کا ہے تقاضا

میں فطری ضرورت سے مجبور

نو ماہ کی مختصر عمر کو

خضر کی زندگی پر بھی ترجیح دوں گی

بہاروں کے نو پھول اجڑے ہوئے ان گنت موسموں سے کہیں

قیمتی ہیں

قلش...... تمہارا بہادر

بڑا ہی ہٹیلا ہے

ورنہ محبت کا جادو تو پتھر کو بھی موم کر دے

یہاں تک کہ جنگل پہاڑ اور بیاباں بھی

دامِ تمنا کے صیدِ زبوں ہیں

مگر بودلک......سنگدل

میری باتیں بھی سنتا نہیں

ژگولہ...... اے رفیقِ خردمند تُو جانتا ہے کہ وادی کی سب عورتیں
اپنی سرگوشیوں میں
مجھے طنز اور طعن سے بانجھ کہتی ہیں
ان کو مری بھوک اور میری وحشی طلب کی خبر ہی نہیں
کون ان کو بتائے کہ میرا بدن لمس کی لذتوں کو ترستا ہے
میرا ابلتا لہو اور مرے جسم کی لب کشادہ صدف
ابرِ نیساں کی بوندوں کی رہ دیکھتی ہے
عروسی کے لمحہ سے اب تک
قسم ہے جو میں ایک شب ایک دن بھی ہنسی ہوں
مجھے تم بھی شاید قلش
ایک بیکار عورت سمجھتے ہو

قلش...... ہرگز نہیں
اے قبیلے کے فرزندِ مجبور کی خوبصورت دلہن
کیونکہ میں دردِ تنہائی سے آشنا ہوں
مجھے اس کا احساس ہے
کیسے بادل کا سایہ برہنہ سلگتی ہوئی کھیتیوں سے لپٹتا ہے
میں جانتا ہوں
کہ کیسے گھنی جھاڑیوں میں نہفتہ کلی
گنگناتے ہوئے مست بھنورے کی رہ دیکھتی ہے

مجھے علم ہے
شام ہوتے ہی کیوں
واپسی کے مسافر کی نظروں کی مانند
سورج شعاعوں سے روئے افق چومتا ہے
میں تنہائی کے کرب سے آشنا ہوں ژگولہ
مگر مجھ کو یہ بھی خبر ہے
کہ تیرا جواں
احمقانہ اصولوں کے بندھن میں جکڑا ہوا ہے

ژگولہ...... یہی تو غضب ہے
کشاکش کے آرے سے دونوں کے پیکر دو نیم اور بسمل
ہمارے بدن بزدلوں کی طرح آپ اپنے گناہوں سے خائف
جو ہر سانس روزِ مکافات کے خوف سے کانپتے ہوں
ہم اک دوسرے سے سرک کر
اندھیروں کے ٹھنڈے ٹھٹھرتے کنوؤں میں
پنہ ڈھونڈتے ہیں
قلش اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہوگا
کہ بے خواب راتوں میں
کوئی جواں بازوؤں کی تمنا میں تڑپے
جو موجود ہوتے ہوئے بھی نہ ہوں

اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہوگا

قلش...... مجھے اس کا احساس ہے

اے دل افروز عورت

جوانی کے ایام محرومیوں کی فصیلیں بنے ہوں

تو دل......ایک سوزندہ صحرا کی صورت بھڑکتا ہے

جذبات کی آگ جب راہ پاتی نہیں ہے

تو اندر ہی اندر بدن کو جھلس ڈالتی ہے

ژگولہ...... تو پھر

کیا ہمارے بزرگوں کی روحیں یہی چاہتی ہیں

کہ میری جوانی کا یہ لہلہاتا شجر

تا ابد عشرتِ خوشہ چینی سے نا آشنا ہی رہے

اور بالآخر

سمِ صرصرِ نامرادی سے ہی سوکھ جائے

تو کیا اپنے آبا کے مُردے یہی چاہتے ہیں

کہ میرا یہ انگار سا جسم

شبنم کی بوندوں کو تا مرگ ترسے

نہیں اے قلش یوں نہ ہوگا

کوئی چشمِ پرشوق

جو مجھ کو احساسِ ہستی دلائے

کوئی صاحبِ دل

جو مجھ کو محبت کی میزاں میں تولے

کہ میں ایک محروم عورت ہوں

محروم عورت

قلش ...... ژگولہ یہ آساں نہیں ہے

کہ کوئی اکیلے مسافر کے غمگین رستوں کے صدمے

بیاں کر سکے

پر میں یہ جانتا ہوں

کہ تنہائی کا کرب کیا ہے

کہ جیسے کوئی رس بھرا پھل جو شاخوں سے گرنے کو ہو

اور کسی بھی پرندے کو اپنی طرف ملتفت کر نہ پائے

...... کہ جیسے کوئی گرم اندام اُستر

جو اپنے سلگتے ہوئے کھال کو خشک پیڑوں سے رگڑے

کہ جیسے کوئی چاند لاکھوں ستاروں کے جلتے ہوئے بن میں

تنہا کھڑا ہو

ژگولہ ...... مرے واسطے سب خلا ہے

صداؤں سے معمور دن ہوں

کہ کالی بلاؤں سے بھرپور راتیں

یہ سب بے حقیقت ہیں

ہاں صرف جذبات کے تند شعلوں کی سرگوشیاں ہی
صداقت ہیں
لیکن کوئی سننے والا تو ہو
اف یہ جانکاہ محرومیاں مجھ کو پاگل نہ کر دیں
خلا...... چار جانب...... خلا

قلش ...... بس اے وحشتِ حوا
کہ تیرا تکلم مرے ذہن میں زلزلے لا رہا ہے
یہ پانی کی گاگر اٹھا اور...... چلی جا
یہ شمشیر سا جسم، شمشاد سا قد
یہ ترغیب انگیز فتنے مری آنکھ سے دور لے جا
چلی جا...... یہ شفاف چشموں سی آنکھیں مرے سامنے سے
ہٹا لے
کہ میرے قدم ڈولتے ہیں
چلی جا ژگولہ تجھے اپنی ارواح کا واسطہ تو چلی جا

ژگولہ ...... تو کیا میرے محروم دل کی صداؤں کو تم بھی
سماعت کا رتبہ نہ دو گے

قلش ...... نہیں تُو نہیں جانتی اے کم اندیش عورت
وہ آواز بھی غور سے سن
کہ جو

اپنے آبا کی روحوں کے غیض وغضب اور سیہ آسمانوں
کی للکار کی ترجماں ہے

ژگولہ...... تف اے نامِ مردانگی
ایک کو آنے والے زمانوں کا غم
دوسرا پیرِ دانا کے چہرے سے خائف
کوئی بھی نہیں جو مری خواہشوں کے تقاضوں کو پورا کرے
اور تم تو قلش......
میری موجودگی سے بھی لرزہ براندام ہو

قلش...... اے قیامت کے فتنے......نہیں یہ
کہ میں تیری موجودگی سے ہوں خائف
مری استقامت میں اس وقت بھی کوئی لغزش نہ آئی
جب افلاک سے پانیوں کے سمندر
ہمارے سبک جھونپڑوں پر دنوں تک برستے رہے تھے
نہ اس وقت خائف ہوا
جب جنوبی ہوائیں ہماری طرف برچھیوں کی طرح
بڑھ رہی تھیں
کہ جب موجزن پانیوں پر ہمارے مکاں پتیوں کی طرح
ناچتے تھے
اور اب میں ترے دام سے بھی ہراساں نہیں ہوں

ژگولہ...... تو کیا تم میں اتنی سکت ہے کہ مُردوں کی ناراضگی
اور بستی کے بوڑھے بزرگوں کی رنجش کے باوصف
مجھ کو چرالو
قلش کیا یہ تم کرسکو گے؟

قلش...... اگرچہ یہ سب سے بڑا پاپ ہوگا
مگر اے قیامت کی جویا
میں ایسا کروں گا

دوسرا منظر

نویں چاند کا آغاز ہے۔ قلش، حاملہ ژگولہ کو سہارا دیتے ہوئے
نخلِ مقدس کے قریب کھڑا ہے تا کہ بوڑھے پروہت کے
سامنے اپنے پاپ کا اقرار کر کے روحوں کی بخشش کا سزاوار ہو

قلش ...... اٹھ اے کوتاہ اندیش عورت
سنبھل اور بارِ شکم کی اذیت سے دُہری نہ ہو
دیکھ پو پھٹ چکی ہے
مگر اب تلک روشنی
تہ بہ تہ بادلوں کے تلے دفن ہے
یہ نحوست کی فال اور غضب کی علامت ہے

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) بوڑھے پروہت کو آواز دو
جو ہواؤں کی مخفی زباں جانتا ہے
پکارو اسی مردِ دانا کو
جو ترجماں ان سیہ آسمانوں کی ہیبت کا ہے
جن کے آغوش میں اپنے آبا کی سفاک ارواح خوابیدہ ہیں

اس کو آواز دو

شدتِ کرب سے میں مری جا رہی ہوں

مرے خشک حلقوم میں برچھیوں کی طرح

میری سانسیں اڑی ہیں

...... تمھیں علم ہے

یہ نویں چاند کی آخری ساعتیں ہیں

قلش میرے اندر کی پروردہ ہستی مری کوکھ کو

چیر کر باہر آنے کو بے تاب ہے

مردِ دانا کو آواز دو

قلش ...... حوصلہ اے زیاں کار حوا کی بیٹی

کہ میں خوف و ہیبت سے لرزہ براندام ہوں

اس مقدس شجر کا تنا

بجلیوں نے جسے پھاڑ کر

غار کی شکل دی ہے

مجھے علم ہے

اس اندھیری گپھا

اس دریدہ شکم کرم خوردہ شجر سے ابھی

کون نکلے گا

میں اس لیے کانپتا ہوں

کہ جذباتیت کے اندھیروں میں
جس پاپ کے مرتکب ہم ہوئے ہیں
وہ اپنے بزرگوں کو برہم کرے گا
ہم ان کے لیے باعثِ ننگ ہیں
لائقِ سنگ ہیں
......اے گنہگار عورت
تری کوکھ
جس گوشت کے لوتھڑے کی امیں ہے
اسے بودلک کی بجائے مرے خون نے زندگی دی ہے
ذرا سوچ
اپنے بزرگوں کے مسلک کی رو سے
یہ کتنا بڑا سانحہ ہے
میں اس کی عقوبت سے لرزہ براندام ہوں
کیونکہ ہم اب سیہ آسمانوں کے
قہر و غضب کا نشانہ بنیں گے

ژگولہ...... نہیں اے قلش
اس سمے جب مرے جسم میں زچگی کی اذیت سے
بھونچال آیا ہوا ہے
عذابوں کی باتیں نہ کر

خاص کر اس مقدس شجر کے تلے

جو اماں مانگنے کی جگہ ہے

رسومِ کہن کے مطابق تو یوں ہے

کہ تُو اس بڑے پیڑ کے زرد پتوں کو

جو آسمانی صحیفوں کے سچے ورق ہیں

زمیں سے اٹھا کر

نہایت عقیدت سے دہلیزِ معبد پہ رکھے

تری بے ادب گفتگو کی تلافی یہی ہے

قلش تو مجھے اس لیے

اس جگہ لے کے آیا تھا

تا کہ دلی عجز اور روح کی انکساری سے

تو پیرِ دانا سے

اپنے کیے کے لیے سائلِ عفو ہو

اے نئی فکر کے مدعی

اب عقیدت سے جھک جا

وہ درویش جو ہاتفِ غیب ہے

خود بخود جلوہ افروز ہوگا

قلش ...... وہ درویش

جس کی نظر صرف بدیوں کو پہچانتی ہے

ژگولہ...... کہاں کی بدی؟

ہاں مگر ہم نے اتنا کیا ہے

کہ اک دوسرے کے سلگتے ہوئے جسم و جاں کی

حرارت کو آپس میں بانٹا

یہ تم مرد بھی کیسی مخلوق ہو

جو خمِ زندگی سے شرابِ مسرت کے خواہاں تو ہوتے ہیں پر اس

کی قیمت ادا کرنے سے جی چرائیں

اور آخر

ہمی بے مددگار مائیں

یہ قرضہ چکاتی ہیں

پہلے تو اس شرمساری کے انداز میں

جیسے اس وقت میں

اور پھر بعد میں

آنے والوں زمانوں کی اس بے یقینی کی صورت میں

جس کا مداوا اجل بھی نہیں ہے

قلش کیا حقیقی خوشی وہ نہیں

جس کے پانے میں ہم

کچھ گنوانے کو بھی دل سے تیار ہوں

قلش...... اے فسوں کار

اپنی مسرت تو
مرحوم اجداد کے زندہ سایوں کی برکت سے محروم تھی

ژگولہ...... پھر بھی سچی مسرت تو تھی

قلش...... توبہ توبہ گنہگار عورت
تری خودسری آسمانوں کے غصے کو بھڑکا رہی ہے
وہ بے رہروی جس کی ترغیب تو نے مجھے دی
اسے اب حقیقی خوشی کہہ رہی ہے
تری مثل تو اس مگس کی ہے
جو شاہِ گل کو پہلے محبت کا نغمہ سنا کر
اسے مست کر دے اسے دعوتِ وصل دے
اور پھر سارا الزام اس پر دھرے
......خیر مُردوں کی پرچھائیوں سے کوئی بھید مخفی نہیں ہے
یہاں تک کہ تیری وہ ترغیب بھی جس نے میری فراست کو
دھندلا دیا تھا
تری بے ادب گفتگو سے تو یہ لگ رہا ہے
کہ جیسے ترے جسم میں کوئی بدروح در آئی ہے
کوئی آسیب تیری تباہی کے درپے ہو
ورنہ یہ دیدہ دلیری کی باتیں
یہاں معبدِ پاک کے سامنے

ہاں……اگر تیرے دل میں بغاوت کی چنگاریاں جل اٹھی ہیں
تو چل
اس طرف بھاگ نکلیں
جہاں آسماں اس قدر زشت صورت نہیں ہیں
تری تہمتوں نے مری قوتیں چھین لی ہیں
اور اب مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں ہے
کہ میں پیرِ دانا سے آنکھیں ملاؤں

ژگولہ…… خموش اے تنگ ظرف بزدل
مجھے کیا خبر تھی
کہ وہ اجنبی حملہ آور
نئی حکمتوں کے عوض
تیری مردانگی لے گئے ہیں
بتا کیا تری دانشِ نو تری آگہی
اس قدر ہیچ ہے……اور ترا ذہن

قلش…… اگر تیری دانست میں آسمانوں کا ڈر
بزدلی ہے تو پھر واقعی میرا مسلک برا ہے
مجھے حکمتِ نو نے خود اپنی نظروں سے گرنا سکھایا
مجھے آگہی دی
کہ میں کس طرح نفرتوں کے جہاں میں

دلیر اور وحشی بنوں

اے بد اندیش عورت مری مان تو اور یہاں سے نکل چل

ژگولہ...... حیا کر

منافق!

تری زرد آنکھوں میں میں کاسنی مکر کی جھلکیاں دیکھتی ہوں

تجھے کیا خبر

ایک تنہا حزیں فاختہ

جو کھلے دن میں شہباز کی تمکنت سے

اگر کانپتی ہے

تو شب کی سیاہی میں

منحوس الو کے بے رحم پنجوں سے ہر دم پنہ مانگتی ہے

ستم ہے سراسر ستم اے قلش......

(کراہتی ہے) اف...... ذرا صبر اے میرے اندر کی مخلوق

میں ریزہ ریزہ ہوئی جا رہی ہوں

زمانے کی نظروں میں۔ میں فاحشہ ہی سہی

پر بزرگوں کی روحیں تو عادل ہیں

اور میری مجبوریاں جانتی ہیں

میں مجرم نہیں ہوں

قلش.... اگر تو بھی مجرم نہیں ہے

تو پھر کیوں سیہ بادلوں کے خطرناک چنگ
مقدس شجر کی طرف بڑھ رہے ہیں
کہ جیسے وہ تیرا گلہ گھونٹنا چاہتے ہیں
ہوس کار عورت
تجھے اپنی بدکاریوں کی سزا بھی بھگتنا پڑے گی
خطا کار وہ ہے جو ترغیب دیتا ہے
اور جو بدی کو حقیقی خوشی کہہ رہا ہے
تو پھر
اے بزرگوں کی حکمت کے وارث
مقدس شجر کے تنے سے نکل
جو ترا پاک مسکن ہے
اور اپنے مجرم کو پہچان
اے پیرِ دانا
کہ تیری نظر صدق و باطل کی میزان ہے
جاگ
اے اپنے مُردوں کے موجود سائے
کہ تو سرد پرچھائیوں کی زباں جانتا ہے
کہ تو ہم سے اندھوں کے مخفی گناہوں کو پہچانتا ہے
صداقت کے پیغام بر

جاگ......اور عدل کر

ژگولہ...... امن......اے میرے نخلِ بدن کے نہفتہ ثمر

امن

اے آفتِ جسم و جاں

تیری پاکوبیوں سے مری کوکھ چھلنی ہوئی جا رہی ہے

قلش...... تو پھر جاگ

اے پیرِ دانا

اور اپنے ہوس کار مجرم کو پہچان

(غار کے اندر سے بوڑھے کی آواز آتی ہے)

پیرِ دانا۔کون؟

کس نے مقدس شجر کے احاطے میں

بیدار روحوں کے خفتہ پروں کو ہلایا

(بوڑھا باہر آتا ہے)

سحر ہو چکی ہے

مگر روشنی کیوں نہیں

چار سو اک پراسرار چپ

پرندے بھی شاید کسی خوف سے

آشیانوں میں سہمے ہوئے ہیں

یہ کیسی خموشی ہے

سورج کی رنگت بھی مُردہ ہے
جیسے کوئی ابتدائے سفر میں ہی
صعبِ مسافت سے بیزار ہو
کیا ہوا ہے
کہ سورج بڑی سرد مہری سے پیش آ رہا ہے
(وقفہ)
عزیزو!
ذرا میرے نزدیک آؤ
مجھے اس سمے کے سماں نے
بہت مضطرب کر دیا ہے
کہ جیسے سیہ بادلوں کے لبادے میں لپٹی ہوئی صبح سے
طائرانِ سحر خوش نہیں
ہاں۔ یہی بات ہے
اس طرف کالے بادل کے اطراف سے جھانکتی روشنی
طنز سے دانت دکھلا رہی ہے
شعاعوں کی بے مہر دھندلی چمک
جس طرح چرخ کی نیم مردہ و بیمار آنکھوں سے
بجھتی ہوئی قرمزی روشنی پھوٹتی ہے
تپش سے تہی۔ زندگی کی حرارت سے خالی

ژگولہ...... (پیٹ کو سہلاتے ہوئے) ٹھہر

اے مرے خوابِ شیریں کی زہریلی تعبیر

مجھ کو پریشاں نہ کر

پیرِ دانا...... اے عظیم آسمانوں کی ارواح

تم کوہساروں کے سنگیں دلوں کو دھڑکتے ہوئے دیکھتی ہو

اور تم پہ باطن کے وہ چور گوشے بھی ظاہر ہیں جن میں

بدی اور نیکی کے سنگم میں

اپنے تنفس کی تلخی فضا میں ہوا کی طرح گھول دو

اور اونچے پہاڑوں کی ان چوٹیوں سے جہاں تم سدا سے

فروکش ہو...... اپنے ارادوں کا اظہار میری زباں سے کرو

تاکہ بستی کے لوگوں پہ کذب اور صداقت عیاں ہو

بزرگوں کی روحو

ہواؤں کے لہجے میں بولو

قلش...... تو کیا اپنے مُردوں کی پرچھائیاں

صرف غیض و غضب جانتی ہیں؟

فقط قہر ہی ان کی برحق عدالت کا دستور ہے

صرف ادبار کی بجلیاں جن کے نیزے سیہ آسمانوں کو بھی چیر دیں

ان کا سارا اثاثہ ہیں؟

وہ اپنی درگاہ کے سائلوں میں

ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں

ستم ہے

گنہگار لوگوں کے رہبر

ستم ہے

ژگولہ...... سکوں

اے مری کوکھ کی آفتِ بے محابا

پیرِ دانا...... کہو......اے مرے عفو کے سائلو

پیرِ دانا...... قلش

تو پھر تم یہاں کس لیے آئے ہو

کیوں تمہارے بدن خوف سے کانپتے ہیں

ہواؤں کی دہشت سے لگتا ہے

جیسے بزرگوں کے مُردے غضبناک ہیں

اور بستی پہ بے نور کہرا

کسی آنے والی مصیبت کا غماز ہے

......ہمیشہ بروں کی بداعمالیاں

بے گناہوں کو بھی

ہواؤں کی وحشت بڑھے جا رہی ہے

یہاں تک کہ نخلِ مقدس بھی جڑ سے اکھڑنے لگا ہے

مگر ہاں

تمہی تو کہیں اس کا باعث نہیں ہو

قلش...... تجھے غیب کا علم ہے

اے مقدس پروہت

میں ترغیب کے دام میں آ گیا تھا

ژ گولہ...... تحمل!

کہ میں دردِ زہ کی اذیّت میں ہوں

اور وہ معصوم جاں

جو مری کوکھ سے باہر آنے کو بیکل ہے

اندر سے مجھ کو کترنے لگی ہے

......میں عاصی ہوں......اے مردِ درویش

لیکن......یہ لغزش تو اس وقت مجھ سے ہوئی

جب مرے آدمی نے مرے جسم کی شعلگی پر توجہ نہ دی

ہاں جوانی کے تپتے ہوئے موسموں کے شب و روز میں

زندہ رہنے کی خاطر

مجھے دوسرے شخص کو خوشہ چینِ نہالِ تمنا بنانا پڑا

جو مری ہی طرح......اپنے پیکر کے زنداں میں محبوس تھا

پیرِ دانا...... ہوں......تو پھر اے قلش

تو نے اپنی نئی حکمتوں کے سبب

اپنے پاکیزہ مسلک کو رسوا کیا

اور ہم سب پہ افتاد لانے کا موجب بنا
کیوں؟

قلش ...... نہیں یوں نہیں
اے بزرگِ زمانہ
میں کمزور ہوں
اور ترغیب کے دام میں آ گیا تھا

پیرِ دانا...... قلش
جب تجھے اجنبی لوگ اوروں کے ہمراہ
قیدی بنا کر جزیرہ نما کشتیوں میں
کھلے پانیوں کے ادھر
ان سُنی بستیوں کی طرف لے گئے تھے
تو تم پر کسی سامری نے اثر کر دیا تھا
وہ آسیب جوان کی دانست میں
حرفِ اوّل ہے

قلش ...... میں...... میں تو

پیرِ دانا...... لیکن جب اپنے بزرگوں کی روحوں نے
خوابیدہ لہروں میں طوفاں اٹھایا
تو پانی پہاڑوں کی مانند اونچا ہوا
اس سمے

اجنبی کشتیوں کے نگہبان ملاّح نے
حرفِ اوّل پڑھا
جس کے جادو سے تو بدعقیدہ ہوا
قلش ...... ہاں مرے ہاتفِ غیب
میں ہو گیا تھا
کہ جب پانیوں کے پہاڑ آج کے بدنما آسمانوں
کی صورت ہمارے سروں پر کھڑے تھے
تو میں بے مددگار و بے بس مکینوں کے ہمراہ تھا
اور اپنے مکاں ڈوبتے جا رہے تھے
ہزاروں مکاں
ان گنت لوگ اے پیرِ دانا
جو تعداد میں اس مقدس شجر کے حنا رنگ پتوں سے بھی
تھے زیادہ
یہاں تک کہ
اس تند طوفاں کے آگے
ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی لاچار تھیں
اور مدد کو نہ آئیں
چنانچہ
ہزاروں کی تعداد میں ڈوبتوں کی صدائیں

پر آشوب موجیں بہا لے گئیں
اور ہزاروں کی آہ و بکا تہہ نشیں ہو گئی
اور پھر اجنبی کشتیوں کا زبردست ملاح بھی جس کے
وردِ زباں حرفِ اوّل رہا تھا
اچانک ہی چپ ہو گیا
لیکن اب تک مرے کان میں وہ صدا گونجتی ہے

پیر دانا...... قلش......تم جسے حرفِ اوّل سمجھتے رہے ہو
کسی اجنبی روح کا نام ہو گا

قلش...... مقدس شجر کے مکیں!
حرفِ اوّل کی تفسیر اس کے عقیدے کی رو سے انوکھی تھی

پیر دانا...... یعنی؟

قلش...... وہ کہتا تھا
اس بزمِ ہستی کے نقشِ کہن سے بھی پہلے
فقط ایک ہی لفظ موجود تھا
اس کی برکت سے انسان پیدا ہوا
پھر اسی لفظ سے رفتہ رفتہ ہزاروں کی تعداد میں
آدمی بن گئے
پھر یہ تعداد بڑھتی گئی
اور یہاں تک

کہ ہم بھی اسی لفظ ہی سے بنے ہیں
بزرگ اور دانا...... کمین اور اعلیٰ
سبھی

اور یہ لہروں پہ بہتے ہوئے جھونپڑوں کے مکیں بھی
جنہیں ہم...... رسن در گلو کر کے قیدی بنا کے لیے جا رہے ہیں

پیر دانا...... تو گویا
وہی حرفِ اوّل ترے ذہن و دل پر ابھی نقش ہے

قلش...... ہاں
مقدس شجر کے نگہباں
معافی...... بزرگوں کی روحو معافی

پیر دانا...... ذرا سوچ او بد عقیدہ
کہ جب تجھ کو لہریں بہائے لیے جا رہی تھیں
تو اس وقت اپنے ہی مُردوں کی روحوں نے
سرگوشیوں میں تری رہبری کی
تجھے یہ سُجھایا
کہ بہتے ہوئے جھونپڑوں کے کسی تختۂ چوب پر لیٹ جا
اور یوں ڈوبنے کی بجائے
تجھے اپنی بستی کا ساحل ملا
اے بزرگوں کے بدخواہ!

تیری مثال اس غلاظت کے کیڑے کی ہے
جو زمیں کے پسینے سے پیدا ہوا
اور اسی کی گِل و خاک پر گندگی تھوکتا ہے
قلش تو نے اپنے بزرگوں کی توہین کی
تو نے اپنی سمجھ بوجھ کو اس اندھیری گپھا کے حوالے کیا
جس میں غیروں کی پرچھائیاں رینگتی ہیں
یہی کچھ نہیں
بلکہ تو نے
قبیلے کے فرزندِ اعلیٰ کی بے عیب دلہن کی دوشیزگی بھی چرالی
کم اوقات بزدل
ستم ہے
کہ وہ کوکھ جس میں قبیلے کے فرزندِ اعلیٰ کی اولاد پلتی وہاں
ایک بدنسل کی
پرورش ہو رہی ہے
تری بدشعاری نے مُردوں کی ارواح کو مشتعل کر دیا ہے
ہوسناک!
تیرے گناہوں نے
بستی کو بے آبرو کر دیا ہے

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) تحمل

مری کوکھ کے بے پر و بال طائر
تو اپنے نشیمن سے کیوں تنگ دل ہے

پیر دانا...... صد افسوس
اے نا مبارک خیالوں کے پیرو...... قلش
تیرے بارے میں ہی مجھ سے اپنے بزرگوں کی ارواح
یہ کہہ رہی ہیں
کہ تُو مر گیا تو
تری روح
ابد تک اکیلی بھٹکتی رہے گی
اگر تُو سلامت رہا تو
دمِ مرگ تک
تیری بستی کی سب بدزباں عورتوں کی زبانیں
تجھے کوستی ہی رہیں گی
قلش
اور ہوائیں
جو مُردوں کی سانسیں ہیں
یہ کہہ رہی ہیں
کہ بستی کے لڑکے تری موت تک
تجھ کو نفرت سے دیکھیں گے

وادی کے بوڑھے بڑے تجھ سے بچ کر چلیں گے

ہوائیں

جو مُردوں کی سانسیں ہیں

یہ کہہ رہی ہیں

کہ مرکر تری روح

تیرے اجاڑ اور ویراں گھروندے پہ

آوارہ بے چین منڈلائے گی

اور ترے ڈھور ڈنگر بلاؤں کی دہشت سے ڈکرائیں گے

اور تری روح

کالے عذابوں میں ہر دم رہے گی

ہوائیں جو لاریب سچ بولتی ہیں سدا

اور تو اے ژگولہ...... قبیلے کی بے مثل دختر

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) ٹھہر

بزمِ ہستی کے ناخواندہ مہماں

مری التجا سن...... ذرا صبر کر

پیر دانا...... اور اے ہر کسی کے پسینے کی آسودگی

تُو بھی سن

تیرے اندر کی جاں کلبلاتی رہے گی

مگر عمر بھر اس حصارِ شکم سے نہ آزاد ہو گی

......کبھی بھی نہیں

اور ہوائیں

جو مُردوں کی آواز ہیں

اس طرح نوحہ گر ہیں

کہ اے بے وفا اے گنہگار عورت

تری کوکھ کے لوتھڑے کے مقدر میں سورج نہیں ہے

کہ یہ پاک روحوں کی نظروں میں ناپاک ہے......ناپسندیدہ ہے

اور مبارک چڑھاوے کے قابل نہیں

ہاں غصیلی ہوائیں

یہی کہہ رہی ہیں

تیسرا منظر

پیرِ دانا...... دو پہر ہو چکی

لیکن اب تک کہیں روشنی کی کرن تک نہیں

(دور سے قدموں کی چاپ آتی ہے)

یہ آواز کیسی ہے

شاید کہ بستی کے پیرانِ دانا کے ہمراہ

......ظارک کی بیٹی

ترا آدمی بودلک آ رہا ہے

......یقیناً وہی ہے

(بودلک تین بزرگوں کے ہمراہ ظاہر ہوتا ہے)

بودلک اور بستی کے بوڑھے بڑو

تم کو زندہ سلامت یہاں دیکھ کر

میں بہت خوش ہوا ہوں

اور اس کے لیے

آؤ پوری عقیدت سے ہم نیک روحوں کے ممنون ہوں

جن کے سایوں نے ہم کو
کڑے موسموں کے دنوں اور راتوں میں محفوظ رکھا
......کہو اے خرد مند لوگو
تمہیں کونسا سانحہ
اس مقدس شجر کی پنہ گاہ میں
لے کے آیا؟

پہلا بڑا...... ہواؤں کی باتوں کے عالم
مقدس پروہت
ہم آئے ہیں۔ تاکہ مقدس شجر کے وسیلے سے
مُردوں کی روحوں سے بخشش کے طالب ہوں
تیری وساطت سے
سورج کو اذنِ مسافت ملے......اور......

دوسرا بڑا...... ہم آئے ہیں تاکہ
تری مہربانی سے
روشن شعاعوں کے سینوں سے
منحوس اور بدنما بادلوں کی چٹانیں ہٹیں
اور بستی کی مخلوق پر امن برسے

ژگولہ...... ٹھہر اے مرے کیسۂ بطن کی کم عیار اشرفی

پیرِ دانا...... اور تو...... بودلک

تیری آمد کا باعث؟

بودلک...... مقدس پروہت

ہمارے مویشی نئی فصل میں روشنی کی تمازت سے محروم ہیں

اور ہمارے خنک جسم بچوں نے سورج کو دیکھا نہیں

اور ہماری سیہ بخت آنکھیں اجالے کی جوئیدہ ہیں

اور ہماری زمین اپنی چھاتی کے کشکول میں بیج

ڈالے ہوئے گرم کرنوں کی دریوزہ گر ہے

ژگولہ...... مگر اے مرے سورما

تُو کہ سورج کی حدت کا دریوزہ گر ہے

بتا

تُو مرے جسم کی آنچ سے کیوں رمیدہ رہا

تو نے مجھ سے کہ تیری زنِ منتخب تھی ہمیشہ کنارہ کیا

(کراہتی ہے) مجھ سے......اے میری ناموس و جاں کے امیں

جس نے اپنی جوانی کی بھرپور مستی تجھے پیش کی

اپنی معصومیت کی بہار

اپنی دوشیزگی کا نشہ

اے قبیلے کے بلوان

تو نے مگر اس کو بھی تج دیا

جو بزرگوں کی برکت سے تجھ کو ملا بودلک

بودلک...... بزرگوں کی روحیں تو ہاتف ہیں
اے میری بے اعتنائی کی شا کی دلہن
صرف اس سوچ سے
میرے جذبات کی آگ
میری جوانی کے تنور میں جل بجھی تھی
کہ جسموں کی قربت کا مفہوم
اک پیکرِ نو کی صورتگری ہے
اور انجام......؟
مُردوں کی آسودگی کے لیے
ایک معصوم کا قتل

پیرِ دانا...... ہوں۔ تو اسی واسطے بودلک
تو زنِ منتخب سے گریزاں رہا
تا کہ تیرے بزرگوں کا فرمان پورا نہ ہو

پہلا بڑا...... تو مُردوں کی ناراضگی کا سبب
بودلک ہے؟

دوسرا بڑا...... تو گویا اسی کی بغاوت سے
آبا کی پرچھائیاں اس قدر مشتعل ہیں
سیہ بادلوں کی گرج ان کے غصے کی غماز ہے

بودلک...... پر یہ کیوں لازمی ہے

قبیلے کے دانا بزرگو
کہ مُردوں کی ارواح
اس جانِ معصوم کو
اپنا لقمہ بنائیں
جو میرے توانا بدن کا عرق ہو

دوسرا بڑا...... ہمارے عقائد کی رو سے
(جو انساں کی تاریخ سے بھی پرانے ہیں)
مُردوں کی روحوں کا حق ہے
کہ وہ صرف خواہش کریں
اور زندوں کا فرض
ان کی تعمیل ہے
جب تلک
موت کا مہرباں ہاتھ اک دوسرے کو
سفید آسمانوں پہ یکجا نہ کر دے
یہی جبر اور صبر کا دائرہ ہے

تیسرا بڑا...... سنا......رہبرِ مہرباں؟
کس کو جرأت کہ روحوں کے انصاف پر شک کرے
ہاں مگر جس پہ آسیب سایہ کناں ہوں
کسے حوصلہ ہے کہ مُردوں کے قانون سے منحرف ہو

سوائے تنگ ظرف، کج فہم کو ہ گرفتہ دلوں کے

پہلا بڑا...... تو اے بودلک

پھر تماشہ کر آباؤ اجداد کی برہمی کا

ذرا اپنی وادی کی ویرانیوں پر نظر کر

ذرا دیکھ

کیسے زمستان کی ان زمہریری ہواؤں سے

ہر شاخ، ہر نخل بے برگ ہے بے ثمر ہے

ذرا سوچ پالے کے چنگل نے کیوں

ہر چراگاہ کے سبز ملبوس کو نوچ پھینکا

ژگولہ...... تماشہ کر اپنے بزرگوں کی برگشتگی کا

کہ میرے بدن کے قفس میں کوئی مضطرب جاں مقید ہے

اور خواہ کچھ بھی ہو

وہ اس گپھا سے نہ آزاد ہوگی

یہاں تک کہ وہ خول کو توڑ کر بھی

ہواؤں کے انفاس سورج کے نغمے

ابد تک نہیں سن سکے گی

دوسرا بڑا...... ستم ہے

وہ کرنیں جو غربالِ نخلِ مقدس سے چھن چھن کے

ہم تک پہنچتی ہیں

ان کو بھی تاریک سائے نگلتے چلے جا رہے ہیں

غضب ہے غضب

بودلک...... جاگ

اے میری ظالم جوانی کے بے آرزو دل

کہ جس کی امیدیں

گئے موسموں کی حزیں اور خنک دھند میں سو چکیں

اے بری ساعتو

میری ویران آنکھیں جوانی میں ہی

میرے چہرے کی دیوار میں دھنس گئی ہیں

مرے گرم جذبات اوہام کی برف میں دب گئے ہیں

اگر میں خوش اندام دلہن کو وارفتگی میں

گلے سے لگاتا

تو اے میرے اجداد کے جانشینو

وہ پیکر جو میری محبت سے بنتا

یہاں کے عقائد کی رُو سے

سزاوارِ تیغِ اجل تھا

کہ میری مرادوں کی پہلی کلی پر

حقِ دامنِ رفتگاں ہے

بزرگو!

کبھی تم نے سوچا

کہ اس طفل کی موت

میری صلابت کی غارتگری تھی

اگر میرا جوہر فنا کر دیا جائے...... اے برگزیدہ بزرگو

تو پھر میں...... کہ وادی کا مضبوط بیٹا ہوں

یوں سخت جاں رہ سکوں گا؟

کسی دل دریدہ کو پامرد کہنا کہاں کی صداقت ہے

اے ہوشمندو

جوانی کی شیریں مسرت سے بڑھ کر

وہ مظلوم انسانیت ہے

جو اب تک مرے خون میں موجزن ہے

اگرچہ قدامت پرستی کے زنگار سے گل رہی ہے

مگر اے قبیلے کے اعلیٰ پسر

قلش......

تو نے جو کچھ کیا

میں اسے بھر رہا ہوں

جو بویا تھا تو نے

مجھے کاٹنا پڑ رہا ہے

مجھے دیکھ میں کس بلا میں گرفتار ہوں

میرا ناخواستہ طفل...... اے بودلک

جو ابھی بطنِ مادر میں ہے
اس قدر باعث ننگ سمجھا گیا ہے
کہ مُردوں کی آسودگی کے لیے بھی
سزاوارِ صدقہ نہیں
میں وہ معتوب ہوں
جس کو بن باس اس کے لیے مل رہا ہے
کہ جس کا خطاکار تُو ہے
یہ عورت؟
جسے تو نے تشنہ و محروم رکھا تھا
میری تباہی کا باعث بنی
اب بتا بودلک
کون شاکی ہو؟
کس کو شکایت کا حق ہے؟
اسے جس نے بویا
کہ اس کو
جسے کاٹنا پڑ رہا ہے؟
بتا کون مجرم ہے؟
اور کون مُردوں کے انصاف کا مستحق ہے
سزا تو مجھے دی گئی......

پروہ تُو ہے
کہ جو اپنے آبا کے مسلک سے باغی ہوا

دوسرا بزرگ...... ظلم ہے ظلم
وادی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی نحوست ہے
اور مرد و زن ڈھور ڈنگر سبھی بھوک سے ادھ موئے ہو رہے ہیں
چراگاہ پالے کی شدت سے سوکھی پڑی ہے
اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں کی خونخوار آنکھیں
ہمیں حرص سے دیکھنے لگ گئی ہیں

قلش...... سنا بودلک؟

پیرِ دانا...... اور ابھی یہ تو کچھ بھی نہیں ہے
ڈر وان بلاؤں سے جو
وقت کے گنبدِ بدنما سے اترنے کو ہیں
حیف!!

بودلک...... اف یہ بدانصافیاں
جن کا کوئی جواز اور چارہ نہیں
اے بزرگوں کی بے مہر پرچھائیو
مجھ سے کیا چاہتی ہو
تمہیں اپنے اس بطلِ اعلیٰ سے کیا چاہیے
جس کا نخلِ جوانی کشاکش کے آرے سے کٹتا رہا

جس کا دل مر چکا......

حیف اے میری پیاری دلہن

جس کے تنور سے گرم اندام کو

میں نے چھونے کی ہمت نہ کی

اور جس کے شکم میں وہ بچہ ہے

جو میرا ہوتا......

پر افسوس میرا نہیں

حیف اے میرے آبا کی ذیشان وادی

کہ میں جس کا بطلِ جری قابلِ فخر فرزند ہوں

آج معبد میں

مُردوں کی ارواح کے روبرو

مجرموں کی طرح ایستادہ ہوں

اے داعیانِ مکافات

تم مجھ سے کیا چاہتے ہو

مجھے کس سزا کا سزاوار گردانتے ہو

مقدس پروہت!

تجھے اہلِ بستی کے مضبوط بیٹوں سے کیا چاہیے

استقامت...... دلیری...... شجاعت

تو پھر سن

کہ وہ

جس کا دل ریزہ ریزہ ہو

اور رخشِ چوبی کا راکب ہو

اس سور ما سے صلابت کی امید...... بے سود ہے

بس یہی حال میرا ہے

اب جو بھی چاہو سزا دو مجھے

اے فقیرانِ فرتوت

پہلا بڑا...... بن باس

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) ذرا دم تو لے اے مرے خول کی

نارسائی کے ارمان دم لے

دوسرا بڑا...... نہیں صرف بن باس کچھ بھی نہیں

میں یہ کہتا ہوں

جس نے بزرگوں کی توہین کی

اس کی پاداش بس موت ہے

تاکہ مُردوں کی تسکین ہو

پہلا بڑا...... اے بزرگوں کے اذہان کے ترجماں

بودلک کے لیے جو سزا

تیری حکمت کی رو سے مناسب ہے

تو اس کا اعلان کر

پیرِ دانا...... ہاں......تو

بن باس یا موت

اے اہلِ بستی کے پیرانِ دانا

سنو؟

پاک معبد کی نظروں میں

دونوں گنہگار ہیں

ایک باغی ہے اور دوسرا سازشی

اور بزرگو

ہوائیں یہ کہتی ہیں

اک تو گنہگارِ کفرانِ نعمت ہوا

جو قبیلے کا فرزندِ اعلیٰ تھا

اور دوسرا دُزد

جس نے پرائی دلہن کی محبت چرائی

وہ دونوں گنہگار

پہلے تو

اک دوسرے سے نبرد آزما ہوں

یہاں تک کہ ان میں سے اک

موت کا جام پی لے

جو زندہ بچے

اس کو ظارک کی بیٹی ......ژگولہ

کہ اب زچگی کی اذیت میں ہے

تازیانے لگاتی ہوئی

اُن گھنے جنگلوں کی طرف لے چلے

جن میں وحشی درندوں کے مسکن ہیں

یہ فیصلہ پاک روحوں کا ہے

جن کا میں ترجماں ہوں

قلش ...... تو یونہی سہی

یودلک! سامنے آ

کہ تقدیر کا فیصلہ جو بھی ہے

وہ اٹل ہے

مرے دوست نیزہ اٹھا

میں تری آبرو تیری ناموس تیری حمیت کو للکارتا ہوں

میں تیار ہوں اور......

بودلک ...... مگر میں نہیں خواہ کچھ بھی ہو

قلش ...... کیوں؟

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) مجھے مت کہو

اے مری کوکھ کے جانور صبر کر

بودلک...... تُو مرا دوست ہے

اور میں بھائیوں سے بڑھ کر تجھے چاہتا ہوں
قلش تم نے وہ اجنبی علم مجھ کو سکھایا
مجھے وہ سکوں بخش حکمت سکھائی
مجھے تو نے وہ حرفِ اوّل بتایا
کہ جو عشق ہی عشق ہے پیار ہی پیار

قلش ...... خاموش
میں نے کب ایسی کوئی بات تجھ سے کہی

تیسرا بڑا...... ہوں......سنا پیرِ دانا
یہ کتنی خطرناک سازش تھی
اب جس کا اظہار یہ کر رہے ہیں

قلش ...... نہیں بودلک جھوٹ کہتا ہے
سب افترا ہے

بودلک...... تو گویا قلش تو اسی علم سے
جس کا داعی تھا تُو
دستبردار ہوتا ہے
یہ تیرے آدرش کا ضعف ہے
یا تری بزدلی ہے

قلش ...... میں بزدل نہیں بودلک
پر وہ حکمت جو غیروں کی بخشش تھی

بے روح تھی

یہ جدا بات ہے اب تلک میرے کانوں میں

اس حرفِ اوّل کی جھنکار سی گونجتی ہے

عجب لفظ تھا وہ

ہزاروں معانی کا حامل

عجب خواب تھا وہ

کہ جیسی بھی تعبیر چاہو نکالو

مگر جیسے...... وہ لفظ

ان کی زبانوں پہ تھا

لوحِ دل پہ منقش نہیں تھا

بودلک...... قلش تیری سب خوبیاں

تیری نفرت کے کہرے سے دھندلا گئی ہیں

اور اب تجھ کو وہ علم بھی کھوکھلا لگ رہا ہے

جسے تو نے درسِ مقدس کہا تھا

قلش...... یقیناً

کہ وہ اجنبی، حرفِ اوّل کی تقدیس کو

اس علاقے کی خوش گل حسیناؤں

اور خوش نما پتھروں کے عوض بیچتے تھے

مگر اس کے باوصف

وہ اپنی دانش کے معیار سے
مجھ کو اور میری بستی کے لوگوں کو
تیرہ دماغ اور ضعیف العقائد سمجھتے تھے
اے بودلک
میرا ایمان اس لفظ سے اٹھ گیا ہے
جوان کے وطیرے میں
جنسِ تجارت سے بڑھ کر نہیں تھا

پہلا بڑا...... بدی سے جوازِ بدی زشت تر ہے

دوسرا بڑا...... دغاباز تو نے قبیلے کی ناموس بیچی
تو اب اس کی قیمت خود اپنے لہو سے ادا کر
بڑھ اور بودلک سے نبرد آزما ہو
یہاں تک کہ دستِ اجل
تیرے کوہ گرفتہ بدن کو سلا دے

بودلک...... مرے بے وفا دوست
میں تجھ سے کیسے لڑوں
کس طرح میرا نیزہ
ترے جسم کو اپنے واروں سے غربال کر دے

قلش...... مگر میں تو تیار ہوں
بلکہ تیار سے بھی زیادہ

ژگولہ...... سکوں میرے پیکر کی دھڑکن سکوں

پہلا بڑا...... لوقلش بھیڑیے کی طرح حملہ آور ہوا

(بودلک قلش کا وار روکتا ہے)

قلش میں اگر تجھ سے لڑنا نہ چاہوں......تو پھر بھی......

قلش...... میں تجھ سے لڑوں گا

وگرنہ مجھے اپنی بستی کی سب عورتیں

طنز کے ڈنک سے ماردیں گی

مری روح تنہائیوں کے خرابوں میں

بدحال تنہا بھٹکتی پھرے گی

تیسرا بڑا...... لڑو بزدلو

تا کہ دونوں کا ناپاک خوں

اس وبا کا مداوا بنے

اس گنہگار روادی کے داغوں کو دھودے

جس نے وادی کو گھیرا ہوا ہے

بودلک...... تو پھر اے مرے دوست......ہُشیار!

میں وار کرنے لگا ہوں

پہلا بڑا...... مرحبا بودلک

دوسرا بڑا...... جیسے چیتا ہرن پر لپکتا ہے

تیسرا بڑا...... دونوں ہی کڑیل جواں ہیں

پہلا بڑا...... قلش وار کو روکنے میں ہے ماہر

دوسرا بڑا...... مگر بودلک اپنی طاقت میں برتر ہے

پہلا بڑا...... اب دیکھنا دونوں وحشی درندوں کے انداز میں گتھ گئے

ژگولہ...... اے مرے روح کے ہم سفر! صبر کر!

پہلا بڑا...... ان کی جاں دادگی سے قبیلے کو طاقت ملے گی

دوسرا بڑا...... بجا۔ اور وادی میں امن وسکوں کی بہاریں پلٹ آئیں گی

تیسرا بڑا...... دیکھنا بودلک وار کرنے لگا ہے

پہلا بڑا...... ضرب کاری تھی وہ مر رہا ہے

(قلش کراہتا ہے)

ژگولہ...... سکوں اے مرے جسم کے زلزلے

میری ہستی کی دیوار گرنے کو ہے

قلش (نزع میں) بودلک۔ تُو مرا دوست تھا

ہم لڑے تاکہ روحوں کی منشا کو پورا کریں

اور اب جبکہ میں مر رہا ہوں

مری آخری التجا ہے

کہ تو...... میرا مردہ بدن دوش پر ڈال کر

ان سیہ جنگلوں کی طرف لے نہ جانا

جہاں بدنما چیونٹیاں

میری بے آسرا لاش کی منتظر ہیں

کہ میں ان سے خائف ہوں
اور ہاں...... قبیلے کے فرزندتُو
اس طرف بھی نہ جانا
جہاں اجنبی لوگ رہتے ہیں
اے بودلک...... (دم توڑ دیتا ہے)

پہلا بڑا...... قلش مرگیا
ژگولہ (کراہتے ہوئے) اف مری جان کتنی اذیت میں ہے

دوسرا بڑا...... اب بزرگوں کی روحوں کی آسودگی
پھر سے لوٹ آئے گی

پیرِ دانا...... جاؤ۔ اے ساری وادی کے دانا بڑو!
اور بستی کے لوگوں کو مژدہ سناؤ
کہ اب سے وہ کالے عذابوں سے خائف نہ ہوں
جن کے سایوں نے سورج کو گہنا دیا تھا
کہ ہم ان کی قیمت ادا کر چکے
جاؤ اور غمزدوں کو ہدایت کرو
تاکہ وہ دامنِ کوہ میں جمع ہو کر
قبیلے کے باغی کا انجام دیکھیں
تماشا کریں۔ اس کے بن باس کا
جس کی گمراہیوں کی سزا ساری مخلوق کو مل رہی تھی

تینوں بڑے...... بجا اے ہمارے نگہبان ہم جا رہے ہیں

(بوڑھے رخصت ہوتے ہیں)

پیرِ دانا...... اور تم بودلک

اپنے مقتول کی لاش اٹھائے ہوئے

ان گھنے جنگلوں کی طرف چل پڑو

......اور اے دردِ زہ میں گرفتار

ظارک کی بیٹی

اٹھ' اور اپنے شوہر کو

کوڑے لگاتی ہوئی

پاک ارواح کی سرزمیں سے نکل

تاکہ آبا کی روحوں کو تسکیں ملے

اٹھ گنہگار عورت

ژگولہ...... (تکلیف میں اپنے بچے کو مخاطب کرتے ہوئے)

نہیں......امن اے میری بیچارگی کی محبت کے پھل

......امن......

چوتھا منظر

(ژگولہ درد سے دوہری ہو رہی ہے ایک طرف بودلک' قلش کی لاش کو کندھے پر ڈالے کھڑا ہے اور دوسری طرف پیرِ دانا ہاتھ میں کوڑا لیے نظر آتا ہے......)

ژگولہ...... (کراہتے ہوئے) نہیں اے خردمند درویش
ایسا نہ ہوگا
کہ اس پر مرا ہاتھ اٹھے جو مرا مرد ہے
جس کا نان و نمک میں نے کھایا
اگر میں نے ایسا کیا تو
مرے اس وطیرے سے بستی کی سب عورتیں
مجھ پہ پھٹکار بھیجیں گی
اور پھر یہ اپنے عقائد کی رو سے بھی زیبا نہیں
اے مقدس پروہت

پیرِ دانا...... عقائد......؟
قبیلے کی رسموں کو تو مجھ سے بہتر نہیں جانتی

دیکھ کب سے ترا آدمی لاش اٹھائے

ترا منتظر ہے......

اسے تازیانے لگاتی ہوئی جنگلوں کی طرف

ہانکتی جا

کہ یہ لاش مسکن ہے اس روح کا

جو ہمارے لیے اور ہمارے بزرگوں سبھی کے لیے

اجنبی ہے

تری تازیانہ زنی تیری بخشش کا موجب بنے گی

وگرنہ تری کوکھ میں کلبلاتی ہوئی جان

مردہ رہے گی

نہ صدقے کے قابل

نہ جینے کے لائق

ژگولہ...... (اپنی کوکھ سے مخاطب ہو کر) تو کیا میں اسی روزِ بد کے لیے

اے مرے نخلِ جاں کے نہفتہ ثمر

تیری نشو و نما میں...... اذیت اٹھاتی رہی ہوں

تو کیا

میں کبھی تیری پیدائشی چیخ کی نغمگی کو نہیں سن سکوں گی؟

پیرِ دانا...... نہیں

جب تلک ان پہاڑوں کے تشنہ بدن

پانیوں کے لیے چیختے ہیں
نہیں
جب تلک اپنے دریاؤں کی خشک اجڑی ہوئی سیج
بے فیض اور بدنما آسمانوں سے شکوہ کناں ہے
نہیں
جب تلک ادھ موئے ڈھور ڈنگر ہلاکت کی وادی میں
ڈکرا رہے ہیں
نہیں
جب تلک اپنی بنجر زمینوں کے سینوں میں
اک عمر کی تشنگی سے دراڑیں پڑی ہیں
نہیں اس سمے تک نہیں
جب تلک اپنی بستی میں کالی بلا بال کھولے کھڑی ہے

بودلک...... تو پھر اے مری بدمقدر دلہن
بھول جا میں ترا کون ہوں
تازیانہ اٹھا
اور مرے جسم پر اپنی ضربوں سے لہریں بنا
کیونکہ مُردوں کی روحوں کے ہمراہ
زندوں کے ارمان بھی منتظر ہیں

پیرِ دانا...... قلش کی ہلاکت سے اور تیرے شوہر کے

بن باس سے ہر نحوست چلی جائے گی
اور تو اس نئے بطل کی ماں بنے گی
کہ جو شان میں اور توانائیوں میں
جواں سال چیتے کی مانند ہو گا
جو اپنے قبیلے کا سب سے بڑا جانثار اور جانباز ہو گا
......اٹھ اور تازیانہ اٹھا
تاکہ بستی پہ پھر امن برسے
بزرگوں کی روحوں کی آسودگی لوٹ آئے
اور اس پاک وادی کی مٹی سے وہ کونپلیں پھوٹ نکلیں
کہ جن کی جڑیں اپنے اجداد کی خاک میں جاگزیں ہیں
اٹھ اے دردِ زہ میں گرفتار عورت

بودلک...... ژگولہ۔
فقط اس توقع پہ
بن باس میں نے قبولا
کہ یوں تیرا بچہ
عقائد کے سفاک پنجوں سے بچ جائے گا
(شور کی آواز)
دیکھ ادھر دیکھ
اک پیرِ فرتوت

مجمع کی جانب بڑھا ہے
ہماری زبوں قسمتی کے تماشائیوں کو
تری کشمکش مشتعل کر رہی ہے
سیہ آسمانوں پہ آبا کی روحیں گرجنے لگی ہیں
ژگولہ اٹھ اور مجھ کو کوڑے لگا
اٹھ کہ میں لاش کے بوجھ سے تھک گیا ہوں

دوسرا بڑا...... ہواؤں کی آیات کے ترجماں
سن!
یہ لوگوں کا شور ان کی ناراضگی کی علامت ہے
وہ دم بہ دم مضطرب ہو رہے ہیں
وہ مجرم پہ کوڑے برسنے کی آواز کے منتظر ہیں
اسے اتنا مارو
کہ اس کی قوی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں
اے قبیلے کی بد بخت بیٹی
اٹھا تازیانہ
کہ یہ شور و غل دم بہ دم بڑھ رہا ہے
ہمارے قبیلے کی......؟

بودلک...... ژگولہ کرم کر
کہ میں بوجھ سے مر رہا ہوں

اگرچہ تری تازیانہ زنی کے لیے
اب بھی تیار ہوں میں
ژگولہ...... تو یونہی سہی
الوداع اے مری زخم خوردہ امیدو
بزرگوں کی روحو
مجھے حوصلہ دو
کہ میں اپنے ہی مرد کو تازیانے لگاتی ہوئی
ان نئی بستیوں کی طرف لے چلوں
جن کی حکمت......
کے اسرار سب حرفِ اوّل کے تابع ہیں
لیکن وہاں بھی تو
ظلم اور وحشت کے عفریت آزاد ہیں
ہاں تو یونہی سہی
میں اسے تازیانے لگاؤں گی
جو اپنے مقتول کی لاش کندھے پہ ڈالے
مری ضرب کا منتظر ہے
اسی میں ہی مُردوں کی آسودگی ہے
تو پھر الوداع۔ اے مری ناتمام آرزوؤ
دل افگار خوابو

مجھے حوصلہ دو کہ میں

اپنے ہی مرد پر ہاتھ اٹھاؤں

ژگولہ...... (بودلک کو مارنے کے لیے تازیانہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے کہ کرب سے دوہری ہو جاتی ہے اور تازیانہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے)

بودلک...... مری منتخب آرزو...... حوصلہ حوصلہ

ژگولہ...... اف نہیں۔ کوئی اندر کی طاقت مجھے روکتی ہے

مرے دل کا دھڑکا

مرے خون کو منجمد کر رہا ہے

نہیں...... یہ نہ ہوگا کہ وہ

جو مرا آدمی ہے

مرا ہاتھ اس پر اٹھے

(کراہتی ہے)

امن...... اف

کوئی جیسے مرے خول کو توڑتا پھوڑتا جا رہا ہے

(کراہتے ہوئے گرنے لگتی ہے)

دوسرا بڑا...... اللہ وہ تڑپنے لگی ہے

بودلک...... سنبھالو...... کہ وہ نزع میں ہے...... مدد

پیرِ دانا...... حوصلہ

دوسرا بڑا...... یہ سانسوں کی وحشی صدائیں

کہ جیسے کوئی جانور زیرِ خنجر کراہے

بودلک...... مدد...... ظلم...... وہ مرگئی

(بچے کی پیدائشی چیخ ابھرتی ہے)

پیر دانا...... مرگئی۔ پر یہ بچہ تو زندہ ہے

دوسرا بڑا...... دانا رفیقو...... ذرا آگ نزدیک لاؤ

(دونوں بڑے قریب آجاتے ہیں)

پہلا بڑا...... مقدس پروہت

ہجوم اس طرف بڑھ رہا ہے

دوسرا بڑا...... چڑھاوا

تیسرا بڑا...... کہ بچہ تو زندہ ہے اے پیرِ دانا

دوسرا بڑا...... چڑھاوا کہ لوگوں کی ناراضگی ختم ہو

تیسرا بڑا...... انتقام...... اے مقدس پروہت

بودلک...... مگر یہ تو سوچو بزرگو

کہ صدقہ اگر ایک جاں کا زیاں ہے

تو وہ ہو چکا ہے

تیسرا بڑا...... صد افسوس اے بودلک

وہ...... جسے تجھ کو کوڑے لگانے کا حق تھا

وہی مر چکی

دوسرا بڑا...... اور یہ بچہ ابھی اس کے قابل نہیں ہے

پیرِ دانا...... ستم ہے

پہلا بڑا...... تو پھر ایسی صورت میں بچے کو قربان کرنا بہت لازمی ہے

بودلک...... یہ بچی جو آشوبِ جاں میں بھی زندہ رہی

دخترِ امن ہے اے مرے برگزیدو!

پیرِ دانا...... حیا کر قبیلے کے بدنام بیٹے

بودلک...... تو کیا اس نئی زندگی سے یہ ثابت نہیں ہے

کہ مُردوں کی ارواح بچے کا صدقہ نہیں چاہتی ہیں

بتاؤ؟

چڑھاوے پہ مُردے مصر ہیں

کہ زندہ؟

پیرِ دانا...... تو پھر اے ہواؤ

کہ تم برگزیدہ بزرگوں کی روحوں کی سب خواہشیں

جانتی ہو

کہ تم پر دوامی صداقت عیاں ہے

ہدایت کرو

(نومولود بچے کی آواز)

بودلک...... تو پھر چیخ اے دخترِ امن

اے جانِ معصوم

اے صوتِ شیریں
کہ تُو بھی تو
اس حرفِ اوّل کی تصویر ہے
جس سے دنیا عبارت ہے
(بچے کے رونے کی آواز)
اے آشتی کی زباں...... چیخ
اے حق وانصاف کی ترجماں
برکتوں کی علامت
کہ تیری بقا کے لیے
تیری ماں اور ترا باپ
دونوں فنا ہو گئے ہیں
فغاں کر
کہ تیری صدا
ان سیہ آسمانوں کو بھی
چیر جائے
فغاں کر
......کہ تُو حرفِ اوّل کی تفسیر ہے
جو عظیم اور برتر ہے

دوسرا بڑا...... اے پیرِ دانا

قبیلے کی توقیر خطرے میں ہے
اور لوگوں کا انبوہ وحشت سے پاگل بنا
ایک جنگل کی مانند
حرکت میں آنے لگا ہے

پیرِ دانا...... تو اے وادیٔ مرگ کے ساکنو
جن کی حکمت زمانوں کے زنگار سے بھی نہ دھندلا سکی
اب ہواؤں کی آواز میں
مجھ پہ ظاہر کرو
کس لیے دخترِ امن بھیجی گئی
اے ہواؤ بتاؤ

بودلک...... پکار اے صداقت کی آواز
امن وسکوں کے لیے چیخ......فریاد کر
تا کہ یہ سب بھی اس حرفِ اوّل کے پیرو بنیں
جس کی تفسیر تُو ہے
(بچی چیختی ہے)

پہلا بڑا...... یہ کیا......
لوگ اچانک ہی چپ ہو گئے
جیسے ان کی زبانیں ہی شل ہو گئیں
ہر طرف اک سکوتِ لحد چھا گیا

اور قبیلے کے سب مرد و زن جیسے سکتے میں ہوں

آسمانوں پہ اب بادلوں کی گرج تک نہیں

اور پرندوں کو دیکھو کہ......

پیرِ دانا...... ہاں......

کیونکہ سورج کی چھنتی ہوئی روشنی

ان پہاڑوں کو پھر چومنے لگ گئی ہے

جو روحوں کے مسکن ہیں

اور دھوپ کی تابناکی سے

وادی چمکنے لگی ہے

بودلک...... یہ سب دخترِ امن کی

پاک و معصوم فریاد کا معجزہ ہے

یقیناً اسی دخترِ امن کا معجزہ

جس کے ماں باپ

اسے زندگی بخش کر مر گئے

یہ کرشمہ اسی حرفِ اوّل کا ہے

جس سے سارے زمانے عبارت ہیں

جس کی صدا

بدنما آسمانوں کو بھی چیر سکتی ہے جن کا کرشمہ فقط قہر ہے

اے مقدس پروہت

پیرِ دانا...... فغاں

میں فقط قہر کا ترجماں

اور یہ بودلک ان عقائد کا دشمن

جو ہم نے بزرگوں سے حاصل کیے

......توبہ......توبہ

یہ حد سے بری ساعتیں بھی ہمیں دیکھنی تھیں

کہ باغی بزرگوں کی موجودگی میں

مقدس عقائد کو جھٹلا رہا ہے

پہلا بڑا...... میں کہتا ہوں

یہ شخص کو ہہ گرفتہ ہے باغی ہے سرکش ہے

تیسرا بڑا...... اے پیرِ دانا غضب ہے

کہ اک ذی شرف

سفلہ و کمتریں ہو گیا

دوسرا بڑا...... شرم کر بے حیا شرم کر

دوسرا بڑا...... لوگ ادھر بڑھ رہے ہیں

غضبناک اور مشتعل

ان کے نیزوں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں

پہلا بڑا...... بڑھے ہی چلے آ رہے ہیں

دوسرا بڑا...... قبیلہ چڑھاوے کا خواہاں ہے۔ اے پیرِ دانا

تیسرا بڑا...... اجازت کہ یہ مشتعل لوگ

باغی کے ٹکڑے اڑائیں

دوسرا بڑا...... اجازت۔ کہ مُردوں کی منشا کو پورا کریں

اور قبیلے کے سب مرد و زن

اس گنہگار پر بھیڑیوں کی طرح پل پڑیں

پیرِ دانا...... اور ہوائیں یہی کہہ رہی ہیں

کہ تُو بودلک

اس غضبناک انبوہ کا سامنا کر

ہمارے قبیلے کے غدار فرزند

میں حکم دیتا ہوں

جا......اور اس شرم کے لوتھڑے کو لیے

جان پر کھیل جا

(بچہ روتا ہے)

بودلک...... رو۔ کہ ہم بدنصیبی کے نخچیر ہیں

رو کہ ہم جرمِ انسانیت کے گنہگار ہیں

پہلا بڑا...... اے زمانوں کے ہادی

گناہوں کی حد ہے

کہ یہ بے حیا اپنے آبا کے قانون کا منہ چڑائے

پہلا بڑا...... تو کیا......اے بری ساعتو!

وہ سبھی حکمتیں جو بزرگوں کی برکت سے ہم
سب پہ نازل ہوئیں...... وہ اکارت گئیں
...... کیا مقدس شجر کی وہ روحیں کہ
جن پر زمانوں کی برکت اتاری گئی
اپنی توہین برداشت کرتی رہیں گی
نہیں۔
اے مقدس پہاڑوں کی پرچھائیو
یہ نہ ہوگا
کہ اپنے عقائد پہ باغی ہنسیں
اور بزرگوں کی وادی میں زندہ رہیں
اپنے آبا کی تقویم خطرے میں ہے
(بچہ روتا ہے)

دوسرا بڑا...... پھر سے تاریکیاں چھا گئیں
آسمانوں پہ بادل گرجنے لگے

تیسرا بڑا...... پھر سے مجمع میں جنبش ہوئی

پہلا بڑا...... انتقام۔ اے مقدس پروہت
قبیلے کے سب مرد و زن مشتعل ہو رہے ہیں

بودلک...... مگر اے بڑو
کیا وہ معصومیت کی فغاں

تم نہیں سن سکے

جس نے اونچے پہاڑوں کو دہلا دیا

دوسرا بڑا...... کفر کی انتہا ہے

بودلک...... سودو

اے اندھیروں کی وادی میں سچ کی اذاں

روکہ برتر صداقت کی آواز

اس خطۂ جدل میں بے ثمر رائیگاں جائے گی

آ کہ اب موت ہی زندگی کی پناہ گاہ ہے۔

(ہجوم کا شور اور بچے کا بلکنا)

گائے جا

دخترِ امن......تُو گائے جا

تیری ماں زندگی سونپ کر تجھ کو

خود مر گئی

اور ترا باپ ممنوع سچ کا نشانہ بنا

گائے جا......دخترِ امن......تُو

گائے جا......گائے جا......اے جہالت کی ظلمت میں پہلی

کرن گائے جا......گائے جا......گائے جا۔

(ہجوم کا شور بچے کی آواز پہ غالب آ جاتا ہے)

رحیم گل

فراز

گھنے گھنگریالے بال۔ وجیہہ و شکیل فراز۔ شاعر ایسے تو نہیں ہوتے؟

اسے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا گریگری پیک اور راک ہڈسن کے مقابل الزبتھ ٹیلر کے پہلو بہ پہلو۔!

یہ نہ ہوتا تو اسے اقوام متحدہ میں ہونا چاہیے تھا کہ سلامتی کونسل کے ہر ریزولیشن کو ''ویٹو'' کرنے کا شغل جاری رکھتا۔

مگر وہ تو شاعر نکلا شاعر بھی یکتا بے مثال۔ خوبصورت آدمی خوبصورت شاعر۔

یہ خدا بھی عجیب ہے دینے پر آتا ہے تو سب کچھ دے دیتا ہے۔

نور جہاں کو دیکھیے سرورِ جاں شکل و صورت رشکِ چمن، چھب نرالی، چال مستانی اور آواز ایسی کہ سنتے جاؤ سنتے چلے جاؤ۔

یہی غلط بخشی فراز کے ساتھ ہوئی مردانگی اس میں، وجاہت اس میں، شوخی اس میں ظرافت اس میں اور شعر گوئی اس پر سوا اور ضدی وہ ایسا کہ برق کوہاٹی مرتے مر گیا فراز نے اس کا دیوان چھپنے نہ دیا۔

آغا برق اس کے والد کا نام ہے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا فراز کو ان کی فارسی شاعری پسند تھی غالباً یہی وجہ تھی کہ حیلوں بہانوں سے ان کا اردو دیوان شائع نہ ہونے دیا۔

تو پھر۔ شاعرانہ تعلی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ رد اسناد کا سفر گھر کی دہلیز سے شروع ہو پھر کوئی دوسرا کیسے شکوہ کر سکتا ہے کہ فراز نے جی کو جی نہ کہا۔

وہ بے حد سر پھرا آدمی ہے اچھا ہے تو بہت اچھا ضد میں آ گیا تو ساری بساط الٹ دیتا ہے

فراز نے بھی میرے کوہاٹ کی مٹی سے جنم لیا ہے اس لئے ہمیں تو اس کی سرکشی بھی گراں نہیں گزرتی اس کی شاعرانہ ہٹ اپنی جگہ کہ یہ تو ہر شاعر کو ودیعت ہوتی ہے فراز کی تندی اور خودی کچھ قبائلی روایات کی بھی مرہونِ منت ہے وہاں کا آدمی کتنا بھی تعلیم یافتہ اور مہذب ہو جائے انا کی شکست کبھی قبول نہیں کرتا۔ ٹوٹ پھوٹ جائے گا مر جائیگا سر نہیں جھکائے گا!

وہ وقت کو سلام نہیں کرتا کج کلاہوں کی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتا ہے لوگ اس کے رویئے کو گستاخی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ یہی رویہ اسے دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔

ایک بار جناب احمد ندیم قاسمی نے میری موجودگی میں ایک ٹی وی پروڈیوسر سے کہا رحیم گل نے شاہکار ناول لکھے ہیں یہ خوبصورت ڈرامہ نگار بھی ہے لیکن اس کی پٹھانیت اسے ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔

یہ بے حد نپا تلا تجزیہ ہے یہ تجزیہ مجھ پر ہی نہیں احمد فراز پر بھی صادق آتا ہے بلکہ مجھ سے کچھ زیادہ!

وہ سمجھوتا نہیں کرتا مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتا وہ بے حد سخت جان ہے بے حد مستقل مزاج ہے انتہائی حوصلہ مند ہے اس کے سینے میں شاعرانہ گداز دل ہے لیکن اس کے رویئے میں کوہاٹ کے سنگلاخ پہاڑوں کا عزم ہے۔

وہ دوستوں میں غیر سنجیدہ برتاؤ رکھتا ہے لیکن بات اصول کی ہو تو بے حد سنجیدہ انسان بن جاتا ہے بے حد ٹھوس انتہائی اٹل!

احمد فراز کا پہلا تخلص شرر برقی تھا ایک بار کسی دوست نے کہا......!

''آج رات بھر نیند نہیں آئی نلکا کھلا ہوا تھا اور ساری رات پانی ''شرر شرر'' بہتا رہا فراز کی حسِ لطیف کو ''شرر شرر'' کی ساؤنڈ ایسی بری لگی کہ اگلے دن ''شرر برقی'' احمد فراز بن گیا تھا!

وہ ہنستا ہے تو بے تحاشہ ہنستا ہے تب وہ احمد فراز نہیں ہوتا لیکن اس کا دوسرا روپ بالکل ارسطو کریٹ کا ہے اس کے کالر پر کوئی داغ نہیں ہوتا اس کے سوٹ میں کوئی شکن نہیں ہوتی اور گرد کے

ذرات اس کے ہونٹوں پر بیٹھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں بلا کی شرارت ہوتی ہے۔

اس کے جسم میں اس کی آنکھیں سارے فساد کی جڑ ہیں وہ ہنستا ہے تو اس کی آنکھوں سے سات سر نکلتے ہیں جوان لڑکیاں ان مہکتے سروں کے طلسم میں اس طرح جکڑ جاتی ہیں جیسے سانپ کی آنکھوں کی کشش سے مینڈک اچھل کر حلق میں جا پڑتا ہے۔

احمد فراز پاکستان کا واحد شاعر ہے جو سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے سب سے زیادہ چھپتا ہے اور سب سے زیادہ بکتا ہے وہ فیض سے بڑا شاعر نہیں ہے لیکن ایک اطلاع کے مطابق فیض سے زیادہ رائلٹی لیتا ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں کتاب چھاپنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے وہاں احمد فراز کی کتاب پر ناشر بڑی سے بڑی بولی لگانے کے لیے تیار ہے۔

اور پھر یہ کہ احمد فراز کو اپنی قیمت کا علم ہے اور وہ اسے وصولنا بھی جانتا ہے اس کے باوجود اپنے آپ میں رہتا ہے اساتذہ کا احترام کرتا ہے اور ہم عصروں کی نفی نہیں کرتا لیکن پھر بھی اس کی شخصیت بے حد متنازعہ ہے۔

جو لوگ اس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر کرتے ہیں اور جو مخالفت کرتے ہیں تجاوز کر جاتے ہیں لیکن اس کی شخصیت اتنی پرکشش ہے کہ آمنا سامنا ہو جائے تو اسیرِ دشنام پابندِ سلام نظر آتے ہیں۔ میں جو کٹر مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن خدا کا منکر بھی نہیں ہوں لوگ مجھے دائیں کیمپ کا آدمی سمجھتے ہیں تو مجھے اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا لیکن فراز جو قطعی بائیں کیمپ کا آدمی ہے مجھے کبھی اجنبی نہیں لگا کبھی غیر نہیں لگا اس میں اپنائیت ہے یقین ہے اس میں شدید قربت کا احساس ملتا ہے وہ جو چھٹی حس ہوتی ہے اور آدمی کی پہچان کراتی ہے۔

وہ وجدانی تعارف، وہ عرفان مخلوق کا ذائقہ اور وہ فطری ربط و رشتہ چپ و راست کی سطح پر سوچنے والے دانشوروں سے زیادہ عالی ظرف ہے۔

لاہور میں اس سے جب بھی ملاقات ہوئی ہوٹل میں سڑک پر یا کسی ادبی تقریب میں کشور ناہید اور یوسف کامران کی معیت میں۔

ایک اس کے دائیں ہوتا ہے اور دوسرا اس کے بائیں ایک کا رنگ سانولا اور دوسرے کا رنگ گندمی اور تیسرے کا گورا دو شاعر ایک تنقید و تبصرہ کا آدمی یہ اتحاد ثلاثہ خوب ہے!

فراز جہاں بھی جاتا ہے رنگ اس کے قدموں میں بکھر جاتے ہیں ہر شہر میں اس کے چاہنے والوں کے ہجوم رہتے ہیں۔

سنا ہے فراز کی زندگی بنانے اور اس کی فطرت میں سیمابی کیفیت بھرنے میں اس کے پہلے عشق کا بڑا دخل ہے جو اس نے کم عمری میں کیا۔ جس کی کسک وہ آج تک دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔

لیکن اب۔؟

بقول محسن احسان اب مستقل عاشق ہے۔ پچھلی ربع صدی میں اس کی زندگی میں شائد ہی کوئی لمحہ ایسا آیا ہو جب وہ کسی زلفِ گرہ گیر کا اسیر نہ رہا ہو۔ ایک رومان اختتام کو نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

غزل بہانہ کروں

ڈاکٹر مہندر

کے نام

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

ترتیب

آتش فشاں

احمد فراز کے تذکرے کے لئے ...... کہ جواب کتابوں میں نہ سما سکے...... تفصیل تو کجا' مجھ سے آپ کسی ترتیب کی بھی توقع نہ رکھیں۔ قدرت نے' اپنی بے شمار نوازشات میں ایک کرم مجھ پر یہ بھی کر رکھا ہے کہ میں غلط فیصلے بھی ٹھیک وقت پر کرتا ہوں۔ سو' میں نے پہلے فراز کی ذات پر بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ فراز کی شاعری کا تذکرہ مجھ پر نسبتاً سہل بھی ہوگا۔ سہل اس لئے کہ مجھے تجزیاتی سمندروں کے پانیوں میں نہیں اترنا۔ اس کی شاید ضرورت بھی نہیں کہ فراز تو اب شاعری کے اس مقام پر ہے جہاں وہ اپنے معیار خود بنا سکتا ہے۔

فراز سے پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ایبٹ آباد کی پہاڑی پر...... خان فقیرا خان جدون کے حجرے میں ہوئی جو صوبہ سرحد کی ایک اہم دلچسپ اور پراسرار صحافتی' سماجی اور سیاسی شخصیت تھے۔ محسن احسان بھی ساتھ تھے۔ موسم برسات کی یہ شام باہر کی طرح اندر بھی خاصی بھیگی رہی۔ یہ دونوں ان دنوں' اپنی جوانی اور شاعری کی دہلیز پر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ دونوں کے چہروں کی طرح دونوں کی شاعری بھی چونکا دینے والی تھی۔ میٹھے دونوں تھے مگر محسن احسان دھیما اور شرمیلا۔ فراز' شوخ و شنگ...... شگفتہ۔ چھب دلبرانہ' ڈھب جارحانہ۔ آدمی اس سے مل کر بھول نہ سکتا۔ نہ اس کو نہ اس کی شاعری کو۔ فراز ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے' جو پروفیسر شوکت واسطی اور راقم نے ''کشمیر فنڈ'' کے لئے برپا کیا تھا ایبٹ آباد آئے تھے۔ مشاعرے میں دو شاعروں ہی سے سامعین کے اصرار پر کشمیر کے موضوع کے علاوہ ان کی مقبول نظموں کی فرمائش کی گئی۔ ابوالاثر حفیظ

جالندھری سے ''بوڑھی رقاصہ'' کی اور احمد فراز کی نوجوان ''لختی ء'' کی۔

اس مشاعرے کا یہ حیران کن منظر بھی مجھے یاد ہے کہ مشاعرے کے اختتام پر ''آٹوگراف'' لینے کا جتنا ہجوم حفیظ صاحب کے گرد تھا اتنا ہی ہجوم فراز کے گرد تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس لڑکے کو زیادہ تر کالج کی طالبات نے گھیر رکھا تھا۔ غالباً اس کی شاعری کے ساتھ اس کی شکل بھی سامعین کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

اگلے دن نمبر ۹ فرنٹیئر ڈویژن کے ہمارے جنرل آفیسر کمانڈنگ (GOC) اور صدر مشاعرہ جنرل نذیر احمد بھی خاصی دلچسپی کے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر میں چائے پر اپنے گورے ''جی ون'' (G-1) کرنل بلیک اور ہم دیسی سٹاف افسروں میجر ذیبن الدین اور کیپٹن (اب ریٹائرڈ بریگیڈیئر) قیوم کے سامنے فراز کا تذکرہ کرتے رہے۔ گویا طالبات ہی نہیں جرنیل بھی اس سے متاثر ہوا۔ جنرل صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بھی جرنیلوں کو متاثر کرے گا مگر کچھ دوسرے قرینے سے۔

احمد فراز سے ہمارے تعلقات نشیب و فراز سے خالی نہیں۔ ابتدا محبت سے ہوئی۔ پھر کچھ فاصلے حائل رہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ دھند کبھی دیوار نہ بن سکی۔ میرے لئے تعلقِ خاطر کا یہ عجیب کربناک سا رشتہ تھا۔ جیسے بھیگی ہوئی لکڑی سلگ رہی ہو۔ اس کی کوئی رومانی تخلیق نظر پڑتی تو نظر چہک اٹھتی۔ کوئی ''طوفانی چیز'' دیکھتا تو دل بیٹھ جاتا۔ نظر ملتی تو نظریات ٹکرانے لگتے' نہ اس کو جیب میں رکھ سکتے نہ جیل میں۔ قدم اس کے ساتھ نہ چل سکے' مگر دل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جس طرح دوسری عالمی جنگ میں ہم ہندوستانی سپاہی...... انگریز کی فوج میں جرمنی کی فتح کے لئے لڑتے رہے۔ ایک مرتبہ اوسلو (ناروے) کی ایک تقریب میں...... افغانستان کے مسئلے پر...... ہماری جھڑپ بھی ہوگئی۔ میں نے اس کو ''روس'' سمجھا اور اس نے مجھے ''دقیانوس'' مگر جب غلط فہمی رفع ہوئی تو دونوں نے اپنا غصہ ''اوقیانوس'' میں تھوک دیا تھا۔ کسی مسئلے پر اختلافات کا یہ مطلب نہیں کہ محاسن کی گواہی بھی نہ دی جائے۔

فوج کے حوالے سے فراز کی ایک نظم کا بڑا چرچا ہوا۔ ہم بھی اس پر بڑے ''لال پیلے'' ہوئے۔ مگر جب میں نے اس کے لختِ جگر سعدی کو کپتانی کی وردی میں پاکستان کی سرحدوں پر سینہ سپر دیکھا' تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اگر فوج کے خلاف ہوتا تو اپنے بیٹے کو فوج میں کیوں بھیجتا۔ وہ دراصل مارشل لاء کے خلاف تھا۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کے ''مارشل لاؤں'' میں بھی اگرچہ وہ ''غزلیہ چٹکیاں'' لیتا رہا۔ مگر ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس کے صبر کا پیمانہ اس طرح چھلکا کہ وہ خود بھی چھلک کر برطانیہ میں جا پڑا۔ فراز اور میں ...... ان دنوں ...... پاکستان نیشنل سنٹر کے سرِشتے میں ...... رفیقِ کار تھے' جس کی نوعیت ابلاغی تھی یعنی

ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

فراز کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ محکمے کے ''میڈیائی فرائض'' سے واضح طور پر ''الرجک'' اور ''ڈونگ ٹپاؤ'' نظر آتا تھا۔ مارے باندھے اگر کوئی کام کرتا بھی تو اس میں ضرور ''مینگنیاں'' ڈال دیتا۔ محکمے کے سربراہ جناب احمد حسن شیخ سے اکثر کہا کرتا ''شیخ صاحب! مجھے سامنے سے اٹھا کر کسی کونے کھدرے میں ڈال دیجئے!'' ...... اسی کشمکش میں اس کی برطرفی کی نوبت آ گئی۔ اور اس نے برطانیہ میں جا کر ''مارشل لاء'' کے خلاف محاذ کھول لیا۔

فراز کی حب الوطنی کے ایک مظاہرے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محب الوطن ہے۔ یہ نومبر ۱۹۹۳ء کی بات ہے ہم لوگ اسلام آباد کے ایک ادبی اجتماع میں کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد کی حمایت میں اہلِ قلم کے دستخط حاصل کر رہے تھے۔ قرارداد میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سے مجلسِ اقوامِ متحدہ کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کے تصفیے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

فراز کے بارے میں بعض دوست متذبذب تھے۔ میں کاغذ لے کر فراز کے پاس گیا تو اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ تقریباً چنگھاڑتے ہوئے بولا ...... ''یہ کیا لکھ لائے ہو بابا۔ قراردادوں سے کچھ نہیں ہوگا میں دستخط نہیں کرتا۔'' میں سمجھا وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مگر پھر

جب یہ کہتے ہوئے ...... ''یہ قرارداد بڑی بے جان ہے۔ لہجہ معذرت خواہانہ ہے۔ ہمیں کشمیر کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ ''اسرٹ'' (Assert) کرنا ہوگا۔'' ...... تو اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہیں ایک صاحب نے بتایا کہ فراز نے اس مسئلے پر بمبئی میں ...... Zee.T.V پروگرام ''سرحد'' میں اپنے مدِ مقابل ہندوستان کے وکیلوں (سنیل دت' کلدیپ نیئر' کرتار سنگھ دگل اور عارف محمد خان) کو کھری کھری سنائیں۔ یہ ''لال پیلا انٹرویو'' ...... دیکھنے سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ...... کہنا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی حب الوطنی کے بارے میں سوئے ظن کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں اور اس عمل میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔

فراز سے بہت لوگ دراصل اس لئے بھی خفا ہیں' جن میں مَیں بھی شامل رہا کہ یہ آتش فشاں کیوں ہے۔ ''ایش ٹرے'' (Ashtray) کیوں نہیں' ''موم بتی'' کیوں نہیں۔ اس کے بعض نظریات سے نظریاتی بنیادوں پر اختلاف بھی ہو تو کم از کم اس بات کا تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے مقام پر بڑی استقامت کے ساتھ کھڑا رہا۔ اور بولنے کے وقت خاموش نہیں رہا۔ ایسے لوگوں کو ...... اختلافات کے باوجود ...... احترام کا خراج دینا پڑتا ہے۔ آدمی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا' لوگ فراز سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ وطن کا درد خاموشی سے برداشت کر لیتا۔ فراز کچھ ایسا صحیح نہ سہی' مگر اس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تھے۔

فراز کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نیشنل سنٹر کی ''ہم دفتری'' کے زمانے میں ملا۔ وہ مجھے اپنا ''برادر'' ہی معلوم ہوا کہ گویا ملازمت کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا۔ مگر اس کو معمولات کا حیرت انگیز حد تک پابند پایا۔ اس کی دفتری تحریر کے الفاظ روشن۔ مستحکم اور دوٹوک ہوتے۔ انگریزی کے بیچوں بیچ اردو فارسی اشعار کا ترشح خشک دفتری مثلوں کو ایک ادبی چاشنی بخش دیتا۔ محکمے کی ''کوارٹر ماسٹری'' میرے سپرد تھی۔ دفاتر کو ...... کاغذ' قلم' دوات' میز' کرسیوں سے لیس رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ فراز نے کچھ چیزیں طلب کیں۔ میں نے لکھ بھیجا۔

تن ہمہ داغ داغ شد   پنبہ کجا کجا نہم

فائل پر چپڑاسی کے بواپسی ہاتھ لکھا ہوا جواب ملا

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

گفتگو میں اس کے چٹکلوں اور پھلجھڑیوں سے' جو ادب کی چاندنی سے تابدار ہوتیں' دفتر کی بساط واقعی زعفران زار بنی رہتی۔ فراز کے پر رعب ''مشاعراتی آوازوں'' سے تو ملک بھر کے ادبی حلقے واقف ہیں مگر اس کے معرکہ کے ادبی لطیفے جو دفتروں کی فائلوں میں ہی دفن ہو گئے' ان کی برجستگی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا مشاعراتی جملہ' ہم نے ایبٹ آباد ہی کے مشاعرے میں سنا۔ حفیظ صاحب اپنی طویل نظم ''رقاصہ'' سنا رہے تھے۔ نظم ختم ہونے میں نہ آئی تو ناگاہ فراز کا آوازہ ابھرا...... ''حفیظ صاحب اٹھتر واں شعر مکرر ارشاد ہو'' اور...... اکتائے ہوئے سامعین کے قہقہے کا کول تک گونج گئے...... لوگ باگ حفیظ صاحب جیسے تنک مزاج سینئر شاعر کے ساتھ اس لڑکے کی جسارت پر حیران تو ہوئے مگر اس کی شکر آفرین ذہانت پر نہال اور ممنون بھی ہوئے۔

اس کی گفتگو بے حد دلچسپ' نکتہ آفرینی کی ایک رنگین خوبصورت پھلواری ہوتی ہے۔ صحیح بات عموماً صحیح عمل پر کہتا ہے لیکن کبھی کبھی غلط بات کو صحیح وقت پر چھوڑنے میں تاخیر بھی کر دیتا ہے۔ احمد فراز کے رومانوں کا بڑا چرچا ہے مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دراصل اپنے آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔

فراز کی شاعری پر میں کوئی لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے نقادوں کی طرح بات کرنی آتی ہی نہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں بنیادی طور پر یہ سیدھی بات کہنی ہے کہ ہم نے اپنے زمانے میں جن دو چار شعرا کو بچشمِ خود قطرے سے سمندر اور ذرے سے ''راکاپوشی'' اور ''کے ٹو'' وغیرہ بنتے دیکھا ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے۔ اور بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لئے کہا ہے کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کے لئے بہترین سفارشی خط ہوتی ہے۔ فنی موشگافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا

الاؤ بھی۔صوفیا کی طرح اس کی شاعری کا پیرہن ہلکا اور خیالات وزنی ہوتے ہیں...... وہ آنکھ کی شاعری بھی کرتا ہے اور دماغ کی بھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی آنکھ والی شاعری زیادہ مرغوب ہے کہ یہ درخت کی طرح...... دل کی زمین سے اگتی...... ذہن میں مہکتی...... زندگی میں پھیلتی اور زبانوں پر پھلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔

اس کی شاعری زندہ دلوں سے زیادہ مردہ دلوں کے لئے ضروری ہے۔ یہ توانائی اور تنوع کے اعتبار سے...... مختلف ذائقوں کے پانیوں کا ایک وسیع سمندر ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو کس ڈھج سے زندہ رہنا چاہیے۔

مجھے اس کی شاعری سے تسکین نہیں ملتی...... خواہشات میں تحریک اور تجدید کا احساس ہوتا ہے...... خون میں دفعتاً کچھ نئی چنگاریاں لشکارنے لگتی ہیں...... اس کے فن میں ٹھہراؤ نہیں۔ ٹھہراؤ آئے بھی کہاں سے کہ وہ تو اب اس عمر میں بھی وہی اٹھارہ بیس برس کا لبرل۔ انقلابی انڈر گریجویٹ ہے۔ نوجوان ہے' جو دماغ سے کچھ آگے ہی چلتا ہے۔ کیونکہ وہ ماضی کی تاریخ کے بجائے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے نچلے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لئے اونچے طبقے میں جگہ خالی کروا رہا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مصرعوں کو انگور کی بیلوں کی طرح تراشتا ہے تا کہ پھل زیادہ اترے اور ذائقہ زیادہ ''سوادلا'' ہو۔ یہ تو اس کے فن کا اعجاز ہوا' جس نے اس کی شاعری کو شہد کی طرح میٹھا اور چائے کی طرح تیز اور پُر حرارت کر دیا ہے۔ فکر کے اعتبار سے اس کو دنیا کے ان شعراء کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے بنی نوع انسان کی غلامی کو کم کیا ہے۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر شاعری میں ''سچ'' زیادہ ہو تو ادب (آرٹ) کم ہو جاتا ہے مگر فراز کے کمال فن نے ''سچ'' اور ''آرٹ'' دونوں کو انتہائی خوبصورتی سے شیر وشکر کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر یہ سچ ہے کہ زندگی کی جنگ لفظوں سے لڑی جاتی ہے تو...... مزاحمت اور آسودگی...... زندگی کے

دونوں محاذوں پر فراز کی پیش قدمی میں کوئی کلام نہیں۔ اس کی شاعری کا ایک رنگ کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرا رنگ اگرچہ کام تو کرتا ہے مگر کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ زندگی کا فوٹو گرافر نہیں؛ مصور ہے۔ مجھے تو اس کی شاعری شبہات کا ایک مفصل سوالیہ سفر معلوم ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اس کی وہ کلیدی انفرادیت ہے۔ جس نے فراز کی شاعری کو اس عصر کے اجتماعی شعور کا عہد نامہ بنا دیا ہے۔

ایسے شعراء تو بہت ہیں کہ لوگ ان کا لکھا ہوا چاؤ سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر فراز کو...... فیض اور جالب کی طرح...... جو بات دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسے کام بھی کر گیا کہ لوگ اس کو محبت سے یاد بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں میں اپنے ایک تاثر کو واضح طور پر بیان کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ فراز اسی قسم کی شاعری کرتا ہے جس کے لئے خود شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ تاریخ میں اس کا شمار ان شعراء میں ہوگا۔ ''جن کے دل سے'' علامہ اقبال کے ایک قول کے مطابق...... قومیں جنم لیتی ہیں...... اس عہد کے ایک بے حد مقبول اور اتنے ہی متنازعہ شاعر کی حیثیت سے فراز کی حمایت اور مخالفت میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ ملک میں نہ اس کے پرستاروں کا شمار ممکن ہے نہ اختلاف کرنے والوں کی کمی ہے...... بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے اختلاف بھی رکھتے ہیں اور اس کو پسند بھی کرتے ہیں۔ سو اس تناظر میں احمد فراز کو نہ ہمارا ادب فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہماری تاریخ۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۴ء

سید ضمیر جعفری

○
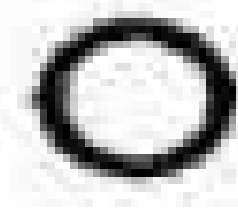
عرضِ غم کبھی اُس کے روبرو بھی ہو جائے
شاعری تو ہوتی ہے، گفتگو بھی ہو جائے

زخمِ ہجر بھرنے سے یاد تو نہیں جاتی
کچھ نشاں تو رہتے ہیں، دل رفو بھی ہو جائے

رند ہیں بھرے بیٹھے اور مے کدہ خالی
کیا بنے جو ایسے میں ایک ''ہو'' بھی ہو جائے

میں اِدھر تنِ تنہا اور ادھر زمانہ ہے
وائے گر زمانے کے ساتھ، تو بھی ہو جائے

پہلی نامرادی کا دکھ کہیں بسرتا ہے
بعد میں اگر کوئی سُرخ رُو بھی ہو جائے

دین و دل تو کھو بیٹھے اب فراز کیا غم ہے
کوئے یار میں غارت آبرو بھی ہو جائے

○
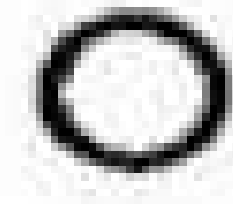
جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھینچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہِ گراں کھینچتا ہے

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اب کے مرا دوست کماں کھینچتا ہے

عہدِ فرصت میں کسی یارِ گزشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگِ جاں کھینچتا ہے

دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازۂ آئینہ گراں کھینچتا ہے

انتہا عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون، کہاں، کھینچتا ہے

کھنچتے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرف قافلۂ عمرِ رواں کھینچتا ہے

ہم تو رہوارِ زبوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی مہمیز کرے خود ہی عناں کھینچتا ہے

رشتۂ تیغ و گلو اب بھی سلامت ہے فرازؔ
اب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھینچتا ہے

○
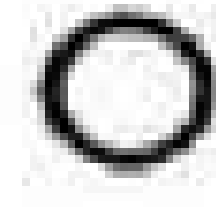
کل ہم نے بزمِ یار میں کیا کیا شراب پی
صحرا کی تشنگی تھی سو دریا شراب پی

اپنوں نے تج دیا ہے تو غیروں میں جا کے بیٹھ
اے خانماں خراب! نہ تنہا شراب پی

تو ہم سفر نہیں ہے تو کیا سیرِ گلستاں
تو ہم سبو نہیں ہے تو پھر کیا شراب پی

اے دل گرفتۂ غمِ جاناں سبو اٹھا
اے کشتۂ جفائے زمانہ شراب پی

دو صورتیں ہیں چارۂ دردِ فراق کی
یا اُس کے غم میں ٹوٹ کے رو یا شراب پی

اک مہرباں بزرگ نے یہ مشورہ دیا
دکھ کا کوئی علاج نہیں، جا شراب پی

بادل گرج رہا تھا ادھر محتسب اِدھر
پھر جب تلک یہ عقدہ نہ سلجھا شراب پی

اے تو کہ تیرے در پہ ہیں رندوں کے جمگھٹے
اک روز اس فقیر کے گھر آ، شراب پی

دو جام ان کے نام بھی اے پیرِ میکدہ
جن رفتگاں کے ساتھ ہمیشہ شراب پی

کل ہم سے اپنا یار خفا ہو گیا فرازؔ
شاید کہ ہم نے حد سے زیادہ شراب پی

○
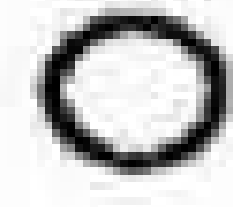
جس کے لئے ہیں جاں بلب، اس کو نہیں ملال بھی
اے دلِ ناصبور اب عادتِ ہجر ڈال بھی

دامنِ یار تک کہاں عشقِ زبوں کی دسترس
حشمتِ حسن دیکھ کر بھول گیا سوال بھی

کب سے ہیں لوگ سر بکف، راہ میں مثلِ آہواں
اب تو مرے شکار خُو، تیر و کماں سنبھال بھی

جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اس کے بغیر کٹ گئے کس طرح ماہ و سال بھی

انجم و مہر و ماہتاب، سرو و صنوبر و گلاب
کس سے تجھے مثال دوں، ہو تو کوئی مثال بھی

اس کے خرامِ ناز سے ایسی قیامتیں اٹھیں
اب کے تو مات کھا گئی چرخِ کہن کی چال بھی

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدوخال بھی

اب کے فراز وہ ہوا جس کا نہ تھا گمان تک
پہلی سی دوستی تو کیا ختم ہے بول چال بھی

○

چلی ہے شہر میں کیسی ہوا اُداسی کی
سبھی نے اوڑھ رکھی ہے رِدا اُداسی کی

لباسِ غم میں تو وہ اور بن گیا قاتل
سجی ہے کیسی، کسی پر قبا اداسی کی

غزل کہوں تو خیالوں کی دھند میں مجھ سے
کرے کلام کوئی اپسرا اداسی کی

خیالِ یار کا بادل اگر کھلا بھی کبھی
تو دھوپ پھیل گئی جا بجا اداسی کی

بہت دنوں سے تری یاد کیوں نہیں آئی
وہ میری دوست مری ہمنوا اداسی کی

فرازؔ نے تجھے دیکھا تو کس قدر خوش تھا
پھر اس کے بعد چلی وہ ہوا اداسی کی

○
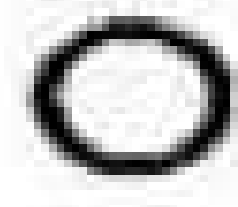
کل نالۂ قمری کی صدا تک نہیں آئی
کیا ماتمِ گل تھا کہ صبا تک نہیں آئی

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی ادا تک نہیں آئی

تجھ ایسے مسیحا کے تغافل کا گلہ کیا
ہم جیسوں کی پُرسش کو قضا تک نہیں آئی

جلتے رہے بے صرفہ چراغوں کی طرح ہم
تو کیا، ترے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

کس جادہ سے گزرا ہے مگر قافلۂ عمر
آوازِ سگاں، بانگِ درا تک نہیں آئی

اس در پہ یہ عالم ہوا دل کا کہ لبوں پر
کیا حرفِ تمنا کہ دعا تک نہیں آئی

دعوائے وفا پر بھی طلب دادِ وفا کی
اے کشتۂ غم تجھ کو حیا تک نہیں آئی

جو کچھ ہو فرازؔ اپنے تئیں یار کے آگے
اس سے تو کوئی بات بنا تک نہیں آئی

○
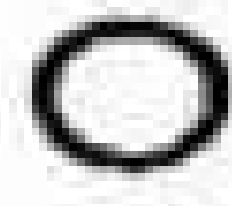
یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آ چکے اب تو شب و روز عذابوں والے

اب تو سب دشنہ و خنجر کی زباں بولتے ہیں
اب کہاں لوگ محبت کے نصابوں والے

جو دلوں پر ہی کبھی نقب زنی کرتے تھے
اب گھروں تک چلے آئے وہ نقابوں والے

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

نہ مرے زخم کھلے ہیں نہ ترا رنگِ حنا
اب کے موسم ہی نہیں آئے گلابوں والے

یوں تو لگتا ہے کہ قسمت کا سکندر ہے فرازؔ
مگر انداز ہیں سب خانہ خرابوں والے

○
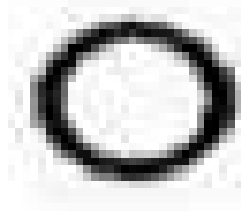
ہم کہ منت کشِ صیاد نہیں ہونے کے
وہ جو چاہے بھی تو آزاد نہیں ہونے کے

دیکھ آ کر کبھی ان کو بھی جو تیرے ہاتھوں
ایسے اجڑے ہیں کہ آباد نہیں ہونے کے

وصفِ مے اور صفتِ یار کے مضموں کے سوا
ناصحا! تیرے سخن یاد نہیں ہونے کے

یارِ بدعہد کا کتنا بڑا احساں ہے کہ ہم
اب کسی کے لئے برباد نہیں ہونے کے

اس جفا جُو کو دعا دو کہ اگر وہ نہ رہا
پھر کسی سے ستم ایجاد نہیں ہونے کے

آج پھر جشن منایا گیا آزادی کا
کل گھروں پر کئی افراد نہیں ہونے کے

اتنے آرام طلب ہو تو محبت میں فراز
میر بن جاؤ گے فرہاد نہیں ہونے کے

○
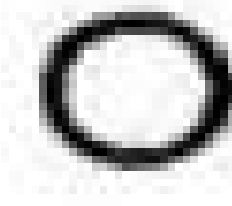
پھر تیرے نہ آنے کی خبر شام میں آئی
زہراب کی تلخی سی مرے جام میں آئی

اے کاش نہ پورا ہو کوئی بھی مرا ارماں
یہ اور تمنا' دلِ ناکام میں آئی

کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کہی ہے
بربادیٔ جاں بھی تو کسی کام میں آئی

کچھ تیرا سراپا مرے اشعار میں اُترا
کچھ شاعری میری' ترے انعام میں آئی

کب تک غمِ دوراں مجھے فتراک میں رکھتا
آخر کو تو دنیا بھی مرے دام میں آئی

کل شام کہ تھا شیخِ حرم، صاحبِ محفل
صہبا کی پری جامۂ احرام میں آئی

ہر چند فرازؔ ایک فقیرِ سرِ رہ ہوں
پر مملکتِ حرف مرے نام میں آئی

○
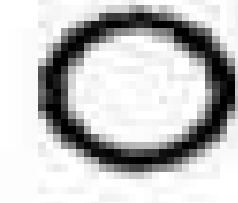
نہ تیرا قرب نہ بادہ ہے کیا کیا جائے
پھر آج دکھ بھی زیادہ ہے کیا کیا جائے

ہمیں بھی عرضِ تمنا کا ڈھب نہیں آتا
مزاجِ یار بھی سادہ ہے کیا کیا جائے

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے کیا کیا جائے

وہ مہرباں ہے مگر دل کی حرص بھی کم ہو
طلب، کرم سے زیادہ ہے کیا کیا جائے

نہ اس سے ترکِ تعلق کی بات کر پائیں
نہ ہمدمی کا ارادہ ہے کیا کیا جائے

سلوکِ یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فرازؔ
مگر یہ محفلِ اعداء ہے کیا کیا جائے

O
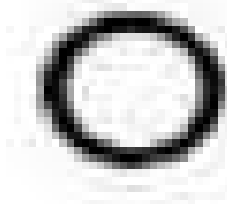
میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری
اسے خبر ہی نہ تھی، خاک کیمیا تھی مری

میں چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ بات ختم ہوئی
پھر اس کے بعد تو آواز جا بجا تھی مری

جو طعنہ زن تھا مری پوششِ دریدہ پر
اسی کے دوش پہ رکھی ہوئی قبا تھی مری

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں، یہی سزا تھی مری

شکست دے گیا اپنا غرور ہی اس کو
وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری

کہیں دماغ کہیں دل کہیں بدن ہی بدن
ہر اک سے دوستی یاری جدا جدا تھی مری

کوئی بھی کوئے محبت سے پھر نہیں گزرا
تو شہرِ عشق میں کیا آخری صدا تھی مری؟

جو اب گھمنڈ سے سر کو اٹھائے پھرتا ہے
اسی طرح کی تو مخلوق خاکِ پا تھی مری

ہر ایک شعر نہ تھا در خورِ قصیدۂ دوست
اور اِس سے طبعِ رواں خوب آشنا تھی مری

میں اُس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فرازؔ
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

○

شہرِ محبت ' ہجر کا موسم ' عہدِ وفا اور میں
تُو تو اس بستی سے خوش خوش چلا گیا' اور میں؟

تُو جو نہ ہو تو جیسے سب کو چپ لگ جاتی ہے
آپس میں کیا باتیں کرتے رات' دیا اور میں

سیرِ چمن عادت تھی پہلے اب مجبوری ہے
تیری تلاش میں چل پڑتے ہیں بادِ صبا اور میں

جس کو دیکھو تیری ہوا میں پاگل پھرتا ہے
ورنہ ہم مشرب تو نہیں تھے خلقِ خدا اور میں

ایک تو وہ ہمراز مرا ہے' پھر تیرا مداح
بس تیرا ہی ذکر کیا کرتے ہیں ضیاء[1] اور میں

ایک زمانے بعد فرازؔ یہ شعر کہے میں نے
اک مدت سے ملے نہیں ہیں یار مرا اور میں

---

[1] ضیاءالدین ضیاء

○
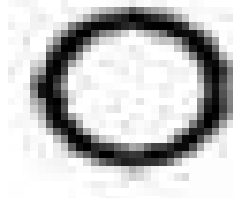
جانے نشّے میں کہ وہ آفتِ جاں خواب میں تھا
جیسے اک فتنۂ بیدار، رواں خواب میں تھا

وہ سرِ شام، سمندر کا کنارا، ترا ساتھ
اب تو لگتا ہے کہ جیسے یہ سماں خواب میں تھا

جیسے یادوں کا دریچہ کوئی وا رہ جائے
اک ستارہ مری جانب نگراں خواب میں تھا

جب کھلی آنکھ تو میں تھا مری تنہائی تھی
وہ جو تھا قافلۂ ہمسفراں خواب میں تھا

ایک شب ایک سرائے میں مکیں تھے دونوں
میں تو سویا ہی نہیں، وہ بھی کہاں خواب میں تھا

ایسے قاتل کو کوئی ہاتھ لگاتا ہے فرازؔ
شکر کر شکر کہ وہ دشمنِ جاں خواب میں تھا

○
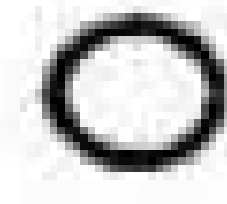
نہیں کہ نامہ بروں کو تلاش کرتے ہیں
ہم اپنے بے خبروں کو تلاش کرتے ہیں

محبتوں کا بھی موسم ہے جب گزر جائے
سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں

سنا ہے کل جنہیں دستارِ افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ عشق کیا ہے کہ اظہارِ آرزو کے لئے
حریف، نوحہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

یہ ہم جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں قتل گاہوں کو
دراصل چارہ گروں کو تلاش کرتے ہیں

رہا ہوئے پہ عجب حال ہے اسیروں کا
کہ اب وہ اپنے پروں کو تلاش کرتے ہیں

فرازؔ داد کے قابل ہے جستجو ان کی
جو ہم سے دربدروں کو تلاش کرتے ہیں

○

وہ جو آ جاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آ جاتے ہیں آرے لے کر

وہ جو آسودۂ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے موج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسمِ ہجراں میں بہار
ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر

شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش
پھرتا رہتا تھا جو گلیوں میں غبارے لے کر

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر

○
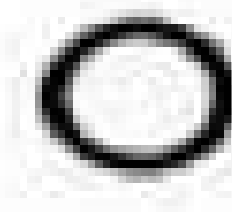
آخر کو ضرورت ہی خریدار کی نکلی
مریم سی وہ لُعبت بھی تو بازار کی نکلی

دیکھو کبھی مقتل کبھی گلزار لگے ہے
تصویر عجب کوچۂ دلدار کی نکلی

آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی تو نہ ہووے
ہم خوش ہیں کوئی شکل تو دیدار کی نکلی

کیوں یار کے انکار سے افسردہ ہے اے دل
نادان! کوئی راہ تو اقرار کی نکلی

وہ گریہ کناں اور دلاسا میں اسے دوں
کیا طرفہ طبیعت مرے غم خوار کی نکلی

وا رہنے دے یارب درِ توبہ کہ ابھی تو
حسرت ہی کہاں تیرے گنہگار کی نکلی

کل ہجر کی شب، روزِ قیامت کی طرح تھی
دن نکلا نہ جاں ہی ترے بیمار کی نکلی

○

کرتے بھی کیا جانا پڑا پھر سے اُسی قاتل کے پاس
ہم بارہا ہو آئے ہیں چارہ گرانِ دل کے پاس

کچھ بے گھر کی سیپیاں کچھ بے مسافر کشتیاں
دریا نے رخ بدلا تو کیا باقی رہا ساحل کے پاس

جن جن کو تھا زعمِ وفا، پندارِ جاں، دعوائے دل
محفل سجی تو جمع تھے سب صاحبِ محفل کے پاس

اس عشق و ترکِ عشق میں ناصح کہاں سے آ گیا
یہ اختیار آنکھوں کا ہے یہ فیصلہ ہے دل کے پاس

سعدی و حافظ بھی سہی مسند نشینانِ غزل
لیکن کلیدِ میکدہ ہے غالب و بیدل کے پاس

کیا خضر اور کیا راہبر حیران ہیں اس بات پر
کیوں خوش نشیں ہے قافلہ اک راندۂ منزل کے پاس

○
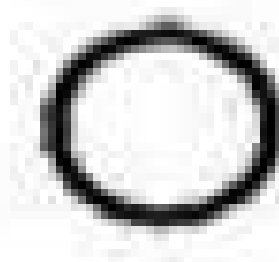
کسی سے دل کی حکایت کبھی کہا نہیں کی
وگرنہ زندگی ہم نے بھی کیا سے کیا نہیں کی

ہر اک سے کون محبت نباہ سکتا ہے
سو ہم نے دوستی یاری تو کی' وفا نہیں کی

شکستگی میں بھی پندارِ دل سلامت ہے
کہ اس کے در پہ تو پہنچے مگر صدا نہیں کی

شکائت اس کی نہیں ہے کہ اُس نے ظلم کیا
گلہ تو یہ ہے کہ ظالم نے انتہا نہیں کی

وہ نادہند اگر تھا تو پھر تقاضا کیا
کہ دل تو لے گیا قیمت مگر ادا نہیں کی

عجیب آگ ہے چاہت کی آگ بھی کہ فرازؔ
کہیں جلا نہیں کی اور کہیں بُجھا نہیں کی

○
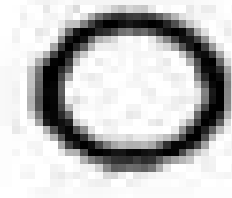
مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں

وطن سے دور بھی آزادیاں نصیب کسے
قدم کہیں بھی ہوں زنجیر گھر کی دیکھتے ہیں

اگرچہ جسم کی دیوار گرنے والی ہے
یہ سادہ لوح کہ تعمیر گھر کی دیکھتے ہیں

کوئی تو زخم اسے بھولنے نہیں دیتا
کوئی تو یاد عناں گیر، گھر کی دیکھتے ہیں

ہم ایسے خانہ بر انداز، کنجِ غربت میں
جو گھر نہیں تو تصاویر گھر کی دیکھتے ہیں

بنائے دل ہے کسی خوابگاہِ زلزلہ پر
سو اپنی آنکھوں سے تقدیر گھر کی دیکھتے ہیں

فرازؔ جب کوئی نامہ وطن سے آتا ہے
تو حرف حرف میں تصویر گھر کی دیکھتے ہیں

○
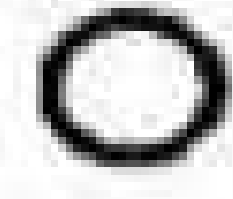
وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

ہم نے اک عمر بسر کی ہے غمِ یار کے ساتھ
میرؔ دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ایک تو خواب لئے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا
ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فرازؔ
سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ

○
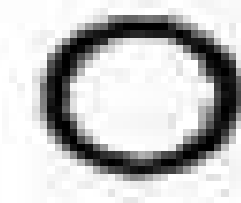
تیرا غم اپنی جگہ دنیا کے غم اپنی جگہ
پھر بھی اپنے عہد پر قائم ہیں ہم اپنی جگہ

کیا کریں یہ دل کسی کی ناصحا سنتا نہیں
آپ نے جو کچھ کہا اے محترمؔ اپنی جگہ

ہم موحّد ہیں بتوں کے پوجنے والے نہیں
پر خدا لگتی کہیں تو وہ صنم اپنی جگہ

یارِ بے پروا! کبھی ہم نے کوئی شکوہ کیا
ہاں مگر ان ناسپاس آنکھوں کا نم اپنی جگہ

محفلِ جاناں ہوؔ مقتل ہو کہ میخانہ فرازؔ
جس جگہ جائیں بنا لیتے ہیں ہم اپنی جگہ

○
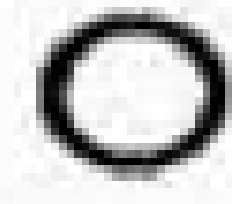
کیوں طبیعت کہیں ٹھہرتی نہیں
دوستی تو اُداس کرتی نہیں

ہم ہمیشہ کے سیر چشم سہی
تجھ کو دیکھیں تو آنکھ بھرتی نہیں

شبِ ہجراں بھی روزِ بد کی طرح
کٹ تو جاتی ہے پر گزرتی نہیں

شعر بھی آیتوں سے کیا کم ہیں
ہم پہ مانا وحی اترتی نہیں

اس کی رحمت کا کیا حساب کریں
بس ہمیں سے حساب کرتی نہیں

یہ محبت ہے، سن! زمانے سُن!
اتنی آسانیوں سے مرتی نہیں

جس طرح تم گزارتے ہو فرازؔ
زندگی اس طرح گزرتی نہیں

○
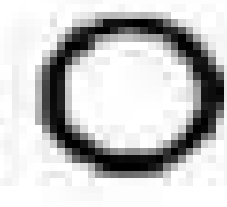
اس کی نوازشوں نے تو حیران کر دیا
میں میزبان تھا مجھے مہمان کر دیا

اک نوبہارِ ناز کے ہلکے سے لمس نے
میرے تو سارے جسم کو گلدان کر دیا

کل اک نگارِ شہرِ سبا نے بہ لطفِ خاص
مجھ سے فقیر کو بھی سلیمان کر دیا

جینے سے اِس قدر بھی لگاؤ نہ تھا مجھے
تُو نے تو زندگی کو، مری جان کر دیا

قُربت کے پل وہ اتنا سخی تھا کہ اس نے تو
پُورا تمام عُمر کا نُقصان کر دیا

نا آشنائے لطفِ تصادم کو کیا خبر
میں نے ہوا کی زد پہ رکھا جان کر دیا

اتنے سکوں کے دن کبھی دیکھے نہ تھے فرازؔ
آسودگی نے مجھ کو پریشان کر دیا

O
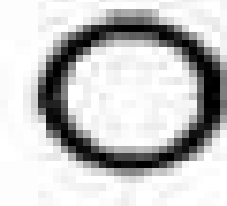
اک شام ہے انتظار جیسی
اک یاد ہے یادِ یار جیسی

اک درد سے نخلِ جاں چراغاں
اک آگ سی ہے چنار جیسی

اک زخم گلاب سا کھلا ہے
اک دکھ کی چبھن ہے خار جیسی

اک نقش ہے وہم کی طرح کا
اک شکل ہے اعتبار جیسی

اک روپ کہ آئینہ ترخ جائے
اک دھوپ رخِ نگار جیسی

اک راہ گزر ہے آسماں تک
اک کاہکشاں غبار جیسی

اک ہجر کا روگ عمر بھر کا
اک عمر کہ ہے ادھار جیسی

اک خواب کہ کچھ سمجھ نہ آئے
اک دھند ہے کوہسار جیسی

اک لعُبتِ سنگ، سر بہ زانو
اک زلف ہے آبشار جیسی

اک ساز لہو اگل رہا ہے
اک طرزِ فغاں ستار جیسی

اک شعلۂ حُسن جل بُجھا ہے
اک آنکھ ہے شرمسار جیسی

اک شاخ پہ چُپ اُداس قُمری
اک نغمہ سرا ہزار جیسی

اک گیت پہاڑیوں کا جھرنا
اک چیخ لہو کی دھار جیسی

اک تیر کہ دل میں ہے ترازو
اک تیغ جگر کے پار جیسی

اک وعدۂ دوست حرفِ عیسیٰ
اک ساعتِ صبر دار جیسی

اک حلقۂ رنگ طوق آسا
اک قوسِ قزح حصار جیسی

ایک ایک شعاع نوکِ نشتر
ایک ایک کرن کٹار جیسی

اک باغِ مُراد اُجڑ رہا ہے
اک دھوم سی ہے بہار جیسی

اک عہد فرازؔ جی کے دیکھا
اک رت بھی نہ آئی پیار جیسی

○
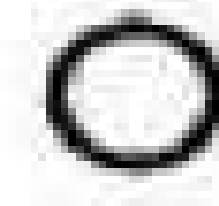
لگتا ہے کہ اب چاہتیں آساں ہیں زیادہ
عُشاق ہیں کم، چاک گریباں ہیں زیادہ

اک آدھ کوئی صاحبِ دل بھی ہے فروکش
اب کوچۂ دلدار میں درباں ہیں زیادہ

مدت سے کوئی جانبِ مقتل نہیں آیا
قاتل بھی توقع سے پشیماں ہیں زیادہ

جس تاج کو دیکھو وہی کشکول نما ہے
اب کے تو فقیروں سے بھی سلطاں ہیں زیادہ

ہر ایک کو دعویٰ ہے یہاں چارہ گری کا
اب دل کے اُجڑ جانے کے امکاں ہیں زیادہ

کیا کیا نہ غزل اس کی جدائی میں کہی ہے
ہم پر شبِ ہجراں ترے احساں ہیں زیادہ

لوگوں نے تو جو زخم دیئے تھے سو دیئے تھے
کچھ تیرے کرم ہم پہ مری جاں ہیں زیادہ

مشاطۂ دنیا سے کہے کون فرازؔ اب
ہم یار کی زلفوں سے پریشاں ہیں زیادہ

○
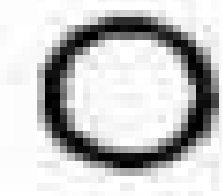
ہم اہلِ دل کو بھی کردار کیا دیئے گئے ہیں
کہ زخم کھاتے گئے ہیں، دعا دیئے گئے ہیں

ہم اپنی آبلہ پائی پہ منفعل تو نہیں
جو تیزرو تھے انہیں راستا دیئے گئے ہیں

کہاں سے حوصلہ لاتے پیمبروں جیسا
سو کیا یہ کم ہے کہ شاعر بنا دیئے گئے ہیں

جہانِ عشق سے کیا دل سا تاجدار گیا؟
جو شہرِ درد کے پرچم جھکا دیئے گئے ہیں

تو کیا کوئی بھی تعلق نہیں رہا باقی
تو کیا وہ جتنے دیے تھے بجھا دیئے گئے ہیں

سو شہرِ علم کا کیا حال اب کہیں کہ وہاں
محبتوں کے صحیفے جلا دیئے گئے ہیں

نئے زمانے میں آتے رہیں گے لوگ نئے
ہمارے نقشِ قدم بھی مٹا دیئے گئے ہیں

○
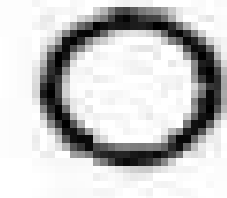
کل پُرسشِ احوال جو کی یار نے میرے
کس رشک سے دیکھا مجھے غم خوار نے میرے

بس ایک ترا نام چھپانے کی غرض سے
کس کس کو پکارا دلِ بیمار نے میرے

یا گرمیٔ بازار تھی یا خوفِ زیاں تھا
پھر بیچ دیا مجھ کو خریدار نے میرے

ویرانی میں بڑھ کر تھے بیاباں سے تو پھر کیوں
شرمندہ کیا ہے در و دیوار نے میرے

جب شاعری پردہ ہے فرازؔ اپنے جنوں کا
پھر کیوں مجھے رسوا کیا اشعار نے میرے

○
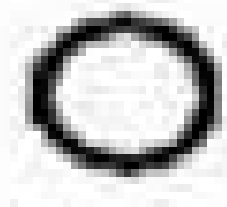
منزلیں ایک سی آوارگیاں ایک سی ہیں
مختلف ہو کے بھی سب زندگیاں ایک سی ہیں

کوئی قاصد ہو کہ ناصح، کوئی عاشق کہ عدو
سب کی اس شوخ سے وابستگیاں ایک سی ہیں

دشتِ مجنوں نہ سہی تیشۂ فرہاد سہی
سفرِ عشق میں واماندگیاں ایک سی ہیں

یہ الگ بات کہ احساس جدا ہوں ورنہ
راحتیں ایک سی، افسردگیاں ایک سی ہیں

صوفی و رند کے مسلک میں سہی لاکھ تضاد
مستیاں ایک سی، وارفتگیاں ایک سی ہیں

وصل ہو، ہجر ہو، قربت ہو کہ دوری ہو فرازؔ
ساری کیفیتیں، سب تشنگیاں ایک سی ہیں

○
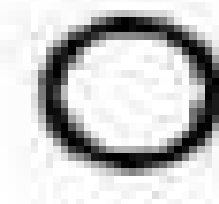
چلو کہ کوچۂ دلدار چل کے دیکھتے ہیں
کسے کسے ہے یہ آزار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ایسا مسیحا کہیں سے آیا ہے
کہ اس کو شہر کے بیمار چل کے دیکھتے ہیں

ہم اپنے بت کو زلیخا لئے ہے یوسف کو
ہے کون رونقِ بازار چل کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دیر و حرم میں تو وہ نہیں ملتا
سواب کے اس کو سرِ دار چل کے دیکھتے ہیں

اس ایک شخص کو دیکھو تو آنکھ بھرتی نہیں
اس ایک شخص کو ہر بار چل کے دیکھتے ہیں

وہ میرے گھر کا کرے قصد جب تو سائے سے
کئی قدم در و دیوار چل کے دیکھتے ہیں

فرازؔ اسیر ہے اس کا کہ وہ فرازؔ کا ہے
ہے کون؟ کس کا گرفتار؟ چل کے دیکھتے ہیں

○
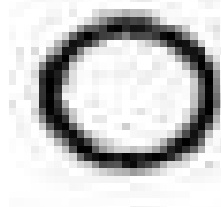
یہ طبیعت ہے تو خود آزار بن جائیں گے ہم
چارہ گر روئیں گے اور غم خوار بن جائیں گے ہم

ہم سرِ چاکِ وفا ہیں اور ترا دستِ ہنر
جو بنا دے گا ہمیں اے یار، بن جائیں گے ہم

کیا خبر تھی اے نگارِ شعر، تیرے عشق میں
دلبرانِ شہر کے دلدار بن جائیں گے ہم

سخت جاں ہیں پر ہماری اُستواری پر نہ جا
ایسے ٹوٹیں گے ترا اقرار بن جائیں گے ہم

اور کچھ دن بیٹھنے دو کوئے جاناں میں ہمیں
رفتہ رفتہ سایۂ دیوار بن جائیں گے ہم

اس قدر آساں نہ ہو گی ہر کسی سے دوستی
آشنائی میں ترا معیار بن جائیں گے ہم

میرؔ و غالبؔ کیا کہ بن پائے نہیں فیضؔ و فراقؔ
زعم یہ تھا رومیؔ و عطارؔ بن جائیں گے ہم

دیکھنے میں شاخِ گُل لگتے ہیں لیکن دیکھنا
دستِ گلچیں کے لئے تلوار بن جائیں گے ہم

ہم چراغوں کو تو تاریکی سے لڑنا ہے فرازؔ
گُل ہوئے پر صبح کے آثار بن جائیں گے ہم

○
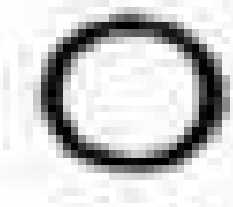
غزل سن کر پریشاں ہو گئے کیا
کسی کے دھیان میں تم کھو گئے کیا

یہ بیگانہ روی پہلے نہیں تھی
کہو تم بھی کسی کے ہو گئے کیا

نہ پُرسش کو نہ سمجھانے کو آئے
ہمارے یار ہم کو رو گئے کیا

ابھی کچھ دیر پہلے تک یہیں تھے
زمانہ ہو گیا تم کو گئے کیا

کسی تازہ رفاقت کی للک ہے
پرانے زخم اچھے ہو گئے کیا

پلٹ کر چارہ گر کیوں آ گئے ہیں
شبِ فرقت کے مارے سو گئے کیا

فرازؔ اتنا نہ اِترا حوصلے پر
اسے بھولے زمانے ہو گئے کیا

○
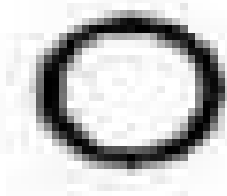
دو گھونٹ کیا پیے کہ بدن میں لگی ہے آگ
ساقی! شراب ہے کہ سبو میں بھری ہے آگ

تقدیر ہنس رہی ہے کہ میں سوختہ نصیب
جنگل میں آ گیا ہوں جو گھر میں لگی ہے آگ

جو ڈھونڈتے تھے آگ اُنہیں پیغمبری ملی
ہم کو پیمبری کی طلب تھی، ملی ہے آگ

اب باغ و باغباں سے کوئی کیا گلہ کرے
اب کے تو رنگِ گُل سے چمن میں لگی ہے آگ

جاناں ہم اہلِ درد کی تر چشمگی نہ دیکھ
داماں کو دور رکھ کہ دلوں میں چھپی ہے آگ

محفل کو کیا خبر جو ہمارے دلوں میں ہے
کب شمع ساں ہمارے سروں پر دھری ہے آگ

آتش بجاں ہیں کب سے محبت میں ہم فرازؔ
اک بار جب لگی ہے تو پھر کب بجھی ہے آگ

○
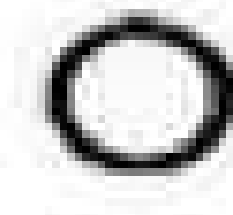
جو بھی قاصد تھا وہ غیروں کے گھروں تک پہنچا
کوئی نامہ نہ ترے در بدروں تک پہنچا

مجھ کو مٹی کیا تو نے تو یہ احسان بھی کر
کہ مری خاک کو اب کوزہ گروں تک پہنچا

اے خدا! ساری مسافت تھی رفاقت کے لئے
مجھ کو منزل کی جگہ ہم سفروں تک پہنچا

تو مہ و مہر لئے ہے مگر اے دستِ کریم
کوئی جگنو بھی نہ تاریک گھروں تک پہنچا

دل بڑی چیز تھا بازارِ محبت میں کبھی
اب یہ سودا بھی مری جان، سروں تک پہنچا

وقت قاروں کو بھی محتاج بنا دیتا ہے
وہ شہِ حُسن بھی دریوزہ گروں تک پہنچا

اتنے ناصح ملے رستے میں کہ توبہ توبہ
بڑی مشکل سے میں شوریدہ سروں تک پہنچا

اہلِ دنیا نے تجھی کو نہیں لوٹا ہے فرازؔ
جو بھی تھا صاحبِ دل؛ مفت بروں تک پہنچا

○

عاشقی بے دلی سے مشکل ہے
پھر محبت اُسی سے مشکل ہے

عشق آغاز ہی سے مشکل ہے
صبر کرنا ابھی سے مشکل ہے

ہم تن آساں ہیں اور ہمارے لئے
دشمنی، دوستی سے مشکل ہے

جس کو سب بے وفا سمجھتے ہوں
بے وفائی اسی سے مشکل ہے

ایک کو دوسرے سے سہل نہ جان
ہر کوئی، ہر کسی سے مشکل ہے

تو بضد ہے تو جا فرازؔ مگر
واپسی اُس گلی سے مشکل ہے

○
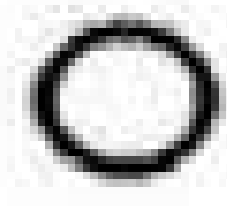
ملول کر ہمیں اتنا ملول کر جاناں
کہ ہم نہ یاد کریں تجھ کو بھول کر جاناں

ہیں مثلِ نامۂ بے نام دستِ قاصد میں
سو ہم سے در بدروں کو وصول کر جاناں

پھر آ گئے ترے کوچے میں خوش نگاہ ترے
غمِ جہاں کی صلیبوں پہ جھول کر جاناں

کبھی تو دستِ حنائی سے سرخیٔ لب سے
ہمارے زخمِ تمنا کو پھول کر جاناں

یہ اہلِ درد تری مملکت میں رہتے ہیں
سو تُو خراج دلوں کے قبول کر جاناں

چلو وہ ترکِ تعلق کا فیصلہ ہی سہی
سو اختیار کوئی تو اصول کر جاناں

فرازؔ تجھ کو خداوند مانتا ہے اسے
دیارِ عشق میں اپنا رسول کر جاناں

○
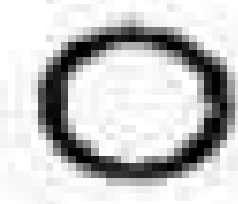
دل ٹھہرنے دے تو آنکھیں بھی جھپکتے جاویں
ہم کہ تصویر بنے بس تجھے تکتے جاویں

چوبِ نم خُوردہ کی مانند سلگتے رہے ہم
نہ تو بُجھ پائیں نہ بھڑکیں نہ دہکتے جاویں

تیری بستی میں ترا نام پتہ کیا پوچھا
لوگ حیران و پریشاں ہمیں تکتے جاویں

کیا کرے چارہ کوئی جب ترے اندوہ نصیب
منہ سے کچھ بھی نہ کہیں اور سسکتے جاویں

کوئی نشّے سے کوئی تشنہ لبی سے ساقی
تری محفل میں سبھی لوگ بہکتے جاویں

مژدۂ وصل سے کچھ ہم ہی زخود رفتہ نہیں
اس کی آنکھوں میں بھی جگنو سے چمکتے جاویں

کبھی اس یارِ سمن بر کے سخن بھی سنیو
ایسا لگتا ہے کہ غنچے سے چٹکتے جاویں

ہم نوا سنجِ محبت ہیں ہر اک رُت میں فرازؔ
وہ قفس ہو کہ گلستاں ہوٗ چہکتے جاویں

○
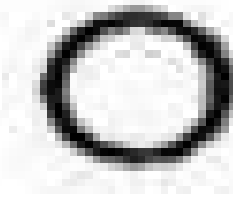
ہیں زخم بہت اور بھی دل پر مرے آگے
کوئی نہ کہے اس کو ستمگر مرے آگے

آفات زمانے کے تعاقب میں مرے ہیں
اور مے ہے نہ مینا ہے نہ ساغر مرے آگے

کیوں بگڑوں فرشتوں کے لکھے پر کہ یہی کھیل
ہوتا رہا دنیا میں بھی اکثر مرے آگے

تو ساتھ چمن میں ہو تو پھر رشک کے مارے
پھرتے ہیں کئی سرو و صنوبر مرے آگے

صیّاد نے پہلے تو رہائی کی خبر دی
پھر ڈال دیئے اس نے مرے پر مرے آگے

گو تیرہ مقدر ہوں مگر کیسی شکایت
ہیں کانچ کے ٹکڑے مہ و اختر مرے آگے

گمراہِ زمانہ ہوں مگر راہِ وفا میں
پوچھے نہ خضر کو بھی سکندر مرے آگے

وہ صاحبِ دل ہوں کہ مری جان کا دشمن
تعظیم سے رکھ دیتا ہے خنجر مرے آگے

وہ مستِ ازل ہوں کہ مرا کاتبِ تقدیر
لکھتا ہے مری لوحِ مقدر مرے آگے

وہ حرفِ صداقت ہوں کہ ہر عہدِ ستم میں
ہے ساغرِ سم قندِ مکرّر مرے آگے

اے داورِ محشر نہ مری فردِ عمل دیکھ
اے ہاتفِ غیبی نہ سخن کر مرے آگے

اک ذرۂ روزن ہے مرے واسطے خورشید
اک ریزۂ مینا ہے سمندر مرے آگے

میں نے بھی کیا قصد سفر کا کہ غزل میں
غالبؔ سا طرحدار ہے رہبر مرے آگے

کس اسم کی برکت ہے کہ ایوانِ سخن میں
کھلتا ہی چلا جاتا ہے ہر در مرے آگے

○
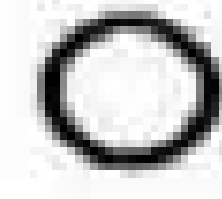
کل شب تھا عجب دید کا منظر مرے آگے
دنیا تھی نہ ہونے کے برابر مرے آگے

جیسے متلاطم ہو سمندر مرے اندر
جیسے ہو کوئی ماہِ منور مرے آگے

اس وقت نہ تھی آنکھ جھپکنے کی بھی فرصت
اک شہرِ طلسمات تھا یکسر مرے آگے

اس وقت نہ تھا دل کو دھڑکنے کا بھی یارا
اک عالمِ حیرت تھا سراسر مرے آگے

خدام بہرگام لئے جام ستادہ
لب بستہ کنیزانِ سمن بر مرے آگے

لائے کوئی مینائے مئے تند لپک کر
رکھ دے کوئی تعظیم سے ساغر مرے آگے

چھپ چھپ کے کوئی چست کرے تنگ قبا کو
ہنس ہنس کے اتارے کوئی زیور مرے آگے

اک مست ادا کاکلِ مشکیں کو بکھیرے
لے آئی دف و چنگ اٹھا کر مرے آگے

جیسے ہو مرے سامنے شدّاد کی جنت
جیسے ہو صنم خانۂ آذر مرے آگے

جیسے کوئی گل چہرہ پری چھم سے اتر آئے
اور رقص کرے ناز سے آ کر مرے آگے

شعلہ سا بدن زلف کی مخمل میں لپیٹے
جیسے ہو کوئی خواب سا پیکر مرے آگے

یوں جیسے کہ جادو سا جگاتا چلا جائے
اک آفتِ جاں فتنۂ محشر مرے آگے

یاقوت سے لب سرو سا قد رات سی آنکھیں
وہ جانِ قیامت تھی مرے گھر مرے آگے

وہ کیفیتِ دل تھی کہ بہزاد کا فن کیا
حافظؔ کی غزل بھی تھی فرو تر مرے آگے

اے گردشِ دوراں ذرا آہستہ قدم رکھ
یہ ساعتِ گزراں ہے گھڑی بھر مرے آگے

اے موسمِ ہجراں ابھی کچھ دیر توقف
آنا ہے تو آ جانا ٹھہر کر مرے آگے

آسودگیٔ قرب کی اعضا شکنی سے
ہے نیند میں غافل مرا دلبر مرے آگے

اے صبحِ جدائی ابھی رک جا کہ ستمگر
ایسے بھی نہ جاگے تھے مقدر مرے آگے

شاید کہ فراز آج کسی روپ نگر سے
آئی ہے قضا بھیس بدل کر مرے آگے

○
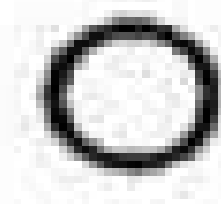
نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے، جانتے ہیں
دامِ دنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک؟
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یارِ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہروانِ رہِ الفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ، پر یہ حقیقت ہے فرازؔ
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

○
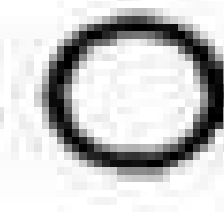
دشتِ افسردہ میں اک پھول کھلا ہے سو کہاں
وہ کسی خوابِ گریزاں میں ملا ہے سو کہاں

ہم نے مدت سے کوئی ہجو نہ واسوخت کہی
وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان سے گلہ ہے سو کہاں

ہم تری بزم سے اٹھے بھی تو خالی دامن
لوگ کہتے ہیں کہ ہر دکھ کا صلہ ہے سو کہاں

آنکھ اسی طور برستی ہے تو دل رستا ہے
یوں تو ہر زخم قرینے سے سلا ہے سو کہاں

بارہا کوچۂ جاناں سے بھی ہو آئے ہیں
ہم نے مانا کہیں جنت بھی دِلا ہے سو کہاں

جلوۂ دوست بھی دھندلا گیا آخر کو فرازؔ
ورنہ کہنے کو تو غم' دل کی جلا ہے سو کہاں

○
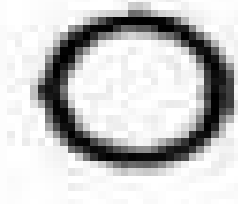
ہم بھی مانگیں مراد ہو کچھ تو
جب رہا تیرے بعد ہو کچھ تو

کیسے پیماں کہاں کے قول و قرار
اُس ستمگر کو یاد ہو کچھ تو

کفر ہے، بے جواز مے پینا
تُو ہو یا ابر و باد، ہو کچھ تو

کیوں ابھی سے گلہ تغافل کا
ملنا جلنا زیاد ہو کچھ تو

آؤ رو لیں فرازؔ دنیا کو
خوش دلِ نامراد ہو کچھ تو

○

کچھ ہمیں اس سے جان کر نہ کھلے
ہم پہ سب بھید تھے وگرنہ کھلے

جی میں کیا کیا تھی حسرتِ پرواز
جب رہائی ملی تو پر نہ کھلے

آگے خواہش تھی خون رونے کی
اب یہ مشکل کہ چشمِ تر نہ کھلے

ہو تو ایسی ہو پردہ داریٔ زخم
حال دل کا بھی آنکھ پر نہ کھلے

سخت تنہا تھے اس کی بزم میں ہم
رنگِ محفل کو دیکھ کر نہ کھلے

کتنے خوش ہو فرازؔ اسیری پر
اور یہ بندِ غم اگر نہ کھلے؟

○
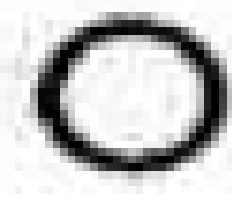
وحشتِ دل، طلبِ آبلہ پائی لے لے
مجھ سے یارب! مرے لفظوں کی کمائی لے لے

عقل ہر بار دکھاتی تھی جلے ہاتھ اپنے
دل نے ہر بار کہا، آگ پرائی لے لے

میں تو اس صبحِ درخشاں کو تونگر جانوں
جو مرے شہر سے کشکولِ گدائی لے لے

تو غنی ہے مگر اتنی ہیں شرائط تیری
وہ محبت جو ہمیں راس نہ آئی لے لے

ایسا نادان خریدار بھی کوئی ہو گا
جو ترے غم کے عوض ساری خدائی لے لے

اپنے دیوان کو گلیوں میں لیے پھرتا ہوں
ہے کوئی جو ہنرِ زخم نمائی لے لے

میری خاطر نہ سہی اپنی انا کی خاطر
اپنے بندوں سے تو پندارِ خدائی لے لے

اور کیا نذر کروں اے غمِ دلدارِ فرازؔ
زندگی جو غمِ دنیا سے بچائی لے لے

○
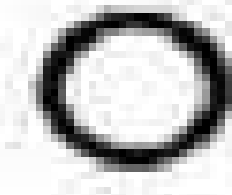
چشمِ گریاں میں وہ سیلاب تھے اے یار کہ بس
گرچہ کہتے رہے مجھ سے مرے غم خوار کہ بس

گھر تو کیا گھر کی شباہت بھی نہیں ہے باقی
ایسے ویران ہوئے ہیں در و دیوار کہ بس

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
ایک اک سانس نے وہ وہ دیئے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

اب وہ پہلے سے بلا نوش و سیہ مست کہاں
اب تو ساقی سے یہ کہتے ہیں قدح خوار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فرازؔ
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

○
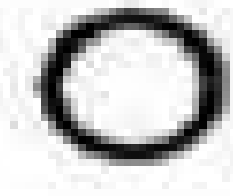
اتنے بھی تو وہ خفا نہیں تھے
جیسے کبھی آشنا نہیں تھے

مانا کہ ہم کہاں تھے ایسے
پر یوں بھی جدا جدا نہیں تھے

تھی جتنی 'بساط' کی پرستش
تم بھی تو کوئی خدا نہیں تھے

حد ہوتی ہے طنز کی بھی آخر
ہم تیرے نہیں تھے، جا نہیں تھے

کس کس سے نباہتے رفاقت
ہم لوگ کہ بے وفا نہیں تھے

رخصت ہوا وہ تو میں نے دیکھا
پھول اتنے بھی خوشنما نہیں تھے

تھے یوں تو ہم اس کی انجمن میں
کوئی ہمیں دیکھتا' نہیں تھے

جب اس کو تھا مان خود پہ کیا کیا
تب ہم بھی فرازؔ کیا نہیں تھے

○
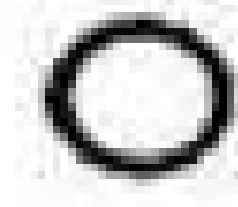
تشنگی آنکھوں میں اور دریا خیالوں میں رہے
ہم نواگر، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

دیکھنا اے رہ نوردِ شوق! کوئے یار تک
کچھ نہ کچھ رنگِ حنا پاؤں کے چھالوں میں رہے

ہم سے کیوں مانگے حسابِ جاں کوئی جب عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

بدظنی ایسی کہ غیروں کی وفا بھی کھوٹ تھی
سوئے ظن ایسا کہ ہم اپنوں کی چالوں میں رہے

ایک دنیا کو مری دیوانگی خوش آ گئی
یار مکتب کی کتابوں کے حوالوں میں رہے

عشق میں دنیا گنوائی ہے نہ جاں دی ہے فرازؔ
پھر بھی ہم اہلِ محبت کی مثالوں میں رہے

○
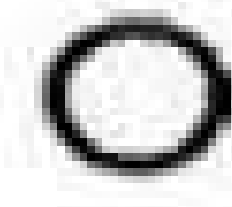
شعار اپنا ہی جس کا بہانہ سازی تھا
وہ میرے جھوٹ سے خوش تھا نہ سچ پہ راضی تھا

تمام عمر اسی کے رہے یہ کیا کم ہے
بلا سے عشق حقیقی نہ تھا مجازی تھا

یہ دو دلوں کی قرابت بڑی گواہی ہے
سو کیا ہوا کوئی شاہد نہ کوئی قاضی تھا

نہ طنز کر کہ کئی بار کہہ چکا تجھ سے
وہ میری پہلی محبت تو میرا ماضی تھا

نہ دوست یار، نہ ناصح، نہ نامہ بر، نہ رقیب
بلا کشانِ محبت سے کون راضی تھا

یہ گُل شدہ سی جو شمعیں دکھائی دیتی ہیں
ہنر ان آنکھوں کا آگے ستارہ سازی تھا

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا
کوئی فرازؔ سا کافر نہیں تھا غازی تھا

○
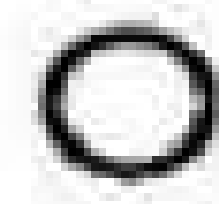
یوں دل سے کسی درد کا پیماں نہیں کرتے
اب جاں پہ بنی بھی ہے تو درماں نہیں کرتے

ہر یاد کو یوں زخم بناتے نہیں دل کا
ہر تیر کو پیوستِ رگِ جاں نہیں کرتے

یہ مسئلہ اب اہلِ محبت کا ہے اپنا
مرتے ہیں تو کچھ آپ پہ احساں نہیں کرتے

خط لائیں نہ لائیں ترا، ہم نامہ بروں کو
بس دیکھتے رہتے ہیں پریشاں نہیں کرتے

ایسا بھی تو رکھتے نہیں خنجر پہ گلو کو
اتنا بھی تو قاتل کو پشیماں نہیں کرتے

کب شمعیں جلاتا ہے شبِ ماہ میں کوئی
تو آئے تو ہم گھر میں چراغاں نہیں کرتے

لوگوں کو گماں تک نہیں ہوتا ہے جنوں کا
ہم دل کی طرح چاک گریباں نہیں کرتے

ہم تج کے چلے آتے ہیں یارو درِ جاناں
غالبؔ کی طرح منتِ درباں نہیں کرتے

○

دل سلگتا ہے مگر سوختہ جانی کم ہے
شعر کیا ہوں کہ طبیعت میں روانی کم ہے

زیست اک آدھ محبت سے بسر ہو کیسے؟
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

تجھ سے کہنا تو نہیں چاہیے پر کہتے ہیں
ہم نے بھی دولتِ جاں اب کے لٹانی کم ہے

دل کو کیا روئیں کہ جب سوکھ گئی ہوں آنکھیں
شہر ویراں ہے کہ دریاؤں میں پانی کم ہے

ہم نے اندوہِ زمانہ سے نہ غم کھایا تھا
شاید اب یوں ہے کہ آشوبِ جوانی کم ہے

جس طرح سانحے گزرے ہیں تری جاں پہ فرازؔ
اس کو دیکھیں تو یہ آشفتہ بیانی کم ہے

○
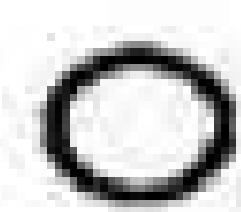
جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
مجھے گماں بھی نہ ہو اور تم بدل جانا

یہ شعلگی ہو بدن کی تو کیا کیا جائے
سو لازمی تھا ترے پیرہن کا جل جانا

تمہیں کرو کوئی درماں، یہ وقت آ پہنچا
کہ اب تو چارہ گروں کو بھی ہاتھ مل جانا

ابھی ابھی تو جدائی کی شام آئی تھی
ہمیں عجیب لگا زندگی کا ڈھل جانا

سجی سجائی ہوئی موت زندگی تو نہیں
مورخوں نے مقابر کو بھی محل جانا

یہ کیا کہ تو بھی اسی ساعتِ زوال میں ہے
کہ جس طرح ہے سبھی سورجوں کو ڈھل جانا

ہر ایک عشق کے بعد اور اس کے عشق کے بعد
فرازؔ اتنا بھی آساں نہ تھا سنبھل جانا

○
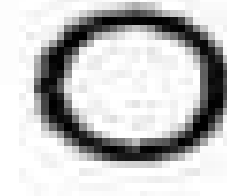
اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا

ڈھلتی نہ تھی کسی بھی جتن سے شبِ فراق
اے مرگِ ناگہاں! ترا آنا بہت ہوا

ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا!
اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا

اب ہم ہیں اور سارے زمانے کی دشمنی
اس سے ذرا سا ربط بڑھانا بہت ہوا

اب کیوں نہ زندگی پہ محبت کو وار دیں
اس عاشقی میں جان سے جانا بہت ہوا

اب تک تو دل کا دل سے تعارف نہ ہو سکا
مانا کہ اس سے ملنا ملانا بہت ہوا

کیا کیا نہ ہم خراب ہوئے ہیں مگر یہ دل
اے یادِ یار تیرا ٹھکانہ بہت ہوا

کہتا تھا ناصحوں سے مرے منہ نہ آئیو
پھر کیا تھا ایک ''ہو'' کا بہانہ بہت ہوا

لو پھر ترے لبوں پہ اسی بے وفا کا ذکر
احمد فرازؔ! تجھ سے کہا نا' بہت ہوا

○
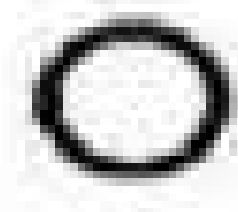
ہم سنائیں تو کہانی اور ہے
یار لوگوں کی زبانی اور ہے

چارہ گر روتے ہیں تازہ زخم کو
دل کی بیماری پرانی اور ہے

جو کہا ہم نے وہ مضموں اور تھا
ترجماں کی ترجمانی اور ہے

ہے بساطِ دل لہو کی ایک بوند
چشمِ پرخوں کی روانی اور ہے

نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستاں اس نے سنانی اور ہے

آبِ زمزم دوست لائے ہیں عبث
ہم جو پیتے ہیں وہ پانی اور ہے

سب قیامت قامتوں کو دیکھ لو
کیا مرے جاناں کا ثانی اور ہے؟

اہلِ دل کی انجمن میں آ کبھی
ان کی دنیا یار جانی اور ہے

شاعری کرتی ہے اک دنیا فرازؔ
پر تری سادہ بیانی اور ہے

O
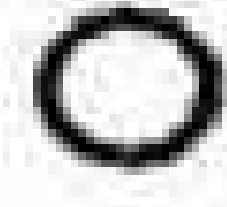
نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھ جب وہ گزرتا ہے بے نیازی سے
تو کس ملال سے ہم نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب ادھر کو دیکھتے ہیں

عجب فسونِ خریدار کا اثر ہے کہ ہم
اُسی کی آنکھ سے اپنے ہنر کو دیکھتے ہیں

کوئی مکاں کوئی زنداں سمجھ کے رہتا ہے
طلسم خانۂ دیوار و در کو دیکھتے ہیں

فرازؔ در خورِ سجدہ ہر آستانہ نہیں
ہم اپنے دل کے حوالے سے در کو دیکھتے ہیں

وہ بے خبر مری آنکھوں کا صبر بھی دیکھیں
جو طنز سے مرے دامانِ تر کو دیکھتے ہیں

یہ جاں کنی کی گھڑی کیا ٹھہر گئی ہے کہ ہم
کبھی قضا کو کبھی چارہ گر کو دیکھتے ہیں

ہماری در بدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

فرازؔ ہم سے سخن دوست' فال کے لئے بھی
کلامِ غالبؔ آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

○

گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن، تم جیسے

یہ مرا حسنِ نظر ہے تو دکھا دے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

اب تو قاصد سے بھی ہر بات جھجک کر کہنا
لے گئے ہو مرا بے ساختہ پن تم جیسے

اب تو نایاب ہوئے دشمنِ دیرینہ تک
اب کہاں اے مرے یارانِ کہن، تم جیسے؟

کبھی ہم پر بھی ہو احساں کہ بنا دیتے ہو
اپنی آمد سے بیاباں کو چمن' تم' جیسے

کبھی ان لالہ قباؤں کو بھی دیکھا ہے فراز
پہنے پھرتے ہیں جو خوابوں کے کفن تم جیسے

○
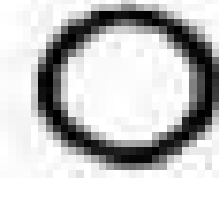
کبھی جو راحتِ جاں تھا اسے بھلا بھی دیا
اگرچہ دل نے ہمیں طعنۂ وفا بھی دیا

نہیں کہ ہم سفروں کے لئے بنے دیوار
جو برق پا تھے انہیں ہم نے راستا بھی دیا

مگر خدا کی سبھی بخشیش انوکھی ہیں
وفا کے ساتھ ہمیں یارِ بے وفا بھی دیا

میں بت بنا اسے دیکھا کیا تو اُس نے کہا
گزر چکی ہے بہت رات اب بجھا بھی' دیا

فرازؔ جس نے دلوں کو اداسیاں بخشیں
اسی نے زخم چھپانے کا حوصلہ بھی دیا

○
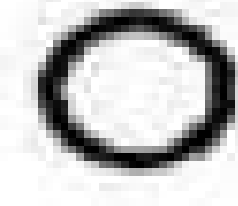
اشک تعبیر اور خواب ہنسی
درد دریا ہے اور سراب ہنسی

کیا کروں عرضِ غم کہ پاس اس کے
میری ہر بات کا جواب ہنسی

خوار کر کے ہمیں محبت میں
زندگی خانماں خراب ، ہنسی

اور کیا ہے یہ قلقلِ مینا
میرے دکھ دیکھ کر شراب ہنسی

تھی نظر متن پر خیال کہیں
مجھ پہ بے ساختہ کتاب ہنسی

اس پہ ظاہر ہوا نہ حال مرا
میں ہنسا ایسی کامیاب ہنسی

عشق میں آنسوؤں کے باب ہیں سب
ہے کہاں شاملِ نصاب ہنسی

ہم تو پاگل تھے ٹوٹ کر روئے
خلق کیوں ہم پہ بے حساب ہنسی

○
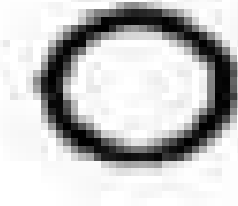
زخمِ ہجراں کا بھر گیا کچھ کچھ
زہرِ غم کام کر گیا کچھ کچھ

عشق کے آخری مراحل میں
سچ کہوں میں بھی ڈر گیا کچھ کچھ

آج دشمن کی موت کا سن کر
یوں لگا میں بھی مر گیا کچھ کچھ

بے سبب محتسب نہیں خاموش
مال اس کے بھی گھر گیا کچھ کچھ

اب ترا دکھ نہیں رہا اتنا
جی محبت سے بھر گیا کچھ کچھ

○
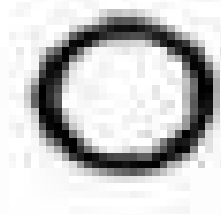
یہ بے دلی ہے تو کشتی سے یار کیا اتریں
ادھر بھی کون ہے؟ دریا کے پار کیا اتریں؟

تمام دولتِ جاں ہار دی محبت میں
جو زندگی سے لئے تھے ادھار کیا اتریں

ہزار جام سے ٹکرا کے جام خالی ہوں
جو آ گئے ہیں دلوں میں غبار کیا اتریں

بسانِ خاک، سرِ کوئے یار بیٹھے ہیں
اب اس مقام سے ہم خاکسار کیا اتریں

نہ عطر و عودؔ نہ جام و سبوؔ نہ ساز و سرود
فقیرِ شہر کے گھر شہریار کیا اتریں

ہمیں مجال نہیں ہے کہ بام تک پہنچیں
انہیں یہ عار سرِ رہ گزار کیا اتریں

جو زخم داغ بنے ہیں وہ بھر گئے تھے فرازؔ
جو داغ زخم بنے ہیں وہ یار کیا اتریں

○
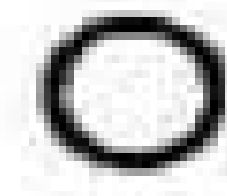
کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا
کہ دل گنوا کے اب آنکھیں نہ کھوؤ ہوا سو ہوا

کوئی اسے نہ سنائے ہمارا حالِ خراب
مبادا اس کو بھی افسوس ہو، ہوا سو ہوا

جدائیوں کے زمانوں کا پوچھتے کیا ہو
گزر گئی جو گزرنی تھی، جو ہوا سو ہوا

محبتوں میں عجب تو نہیں اجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیراں نہ ہو ہوا سو ہوا

ہزار اور بھی دکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو، ہوا سو ہوا

وفا میں ہم بھی کہاں ایسے خوش معاملہ تھے
فقط اسی سے گلہ کیوں کرو ہوا سو ہوا

فرازؔ خوش ہو متاعِ ہُنر سلامت ہے
بلا سے عشق کی بازی میں جو ہوا سو ہوا

○
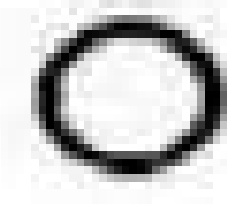
ہنگامۂ محفل ہے کوئی دم کہ چلا میں
ساقی مرے ساغر میں ذرا کم کہ چلا میں

کچھ دیر کی مہمان سرائے ہے یہ دنیا
چلنا ہے تو چل اے مرے ہمدمؔ کہ چلا میں

پھر بات ملاقات کبھی ہو کہ نہیں ہو
پھر یار کہاں فرصتِ باہم کہ چلا میں

یہ سلسلۂ آمدوشد کیا ہے کہ یارب!
اک شور نفس میں ہے دمادم کہ چلا میں

جو عمر گزاری ہے بڑی دھج سے گزاری
اب کوئی خوشی ہے نہ کوئی غم کہ چلا میں

یہ دل کا تپکنا کہ ٹھہرتا ہی نہیں ہے
یارو کوئی نشتر کوئی مرہم کہ چلا میں

اے دوست، فرازؔ ایک دیا ہے ترے در کا
کیا جانئے کہہ دے وہ کسی دم کہ چلا میں

○
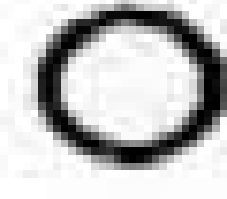
نہ تو دیوانے ہی بن پائے نہ دانا مرے دوست
ہو گئے شہر کے لوگوں میں تماشا مرے دوست

اب جو آنکھیں ہیں بیاباں تو یہی ہونا تھا
جانے کس دشت کو روتے رہے دریا' مرے دوست

تو ہمیشہ سے رہا چشم و چراغِ محفل
میں تو محفل میں بھی محفل میں نہیں تھا مرے دوست

اب بھی دل تجھ کو صدا دیتا ہے گاہے گاہے
مری جاں' میری تمنا' مری دنیا' مرے دوست

تیری معصوم نگاہی پہ بھی حرف آئے گا
صرف مجھ کو ہی گنہگار نہ ٹھہرا مرے دوست

میں محبت کے قرینوں سے نہیں ہوں غافل
تجھ کو جانا ہے تو ہنس ہنس کے چلا جا مرے دوست

اب کے آشوبِ زمانہ تھا قیامت کا فراز
کیسے کیسے مرے دشمن ہوئے کیا کیا مرے دوست

○
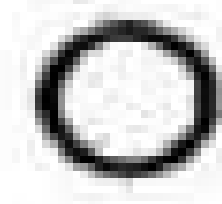
وہ تو پتھر پہ بھی گزرے نہ خدا ہونے تک
جو سفر میں نے نہ ہونے سے کیا، ہونے تک

زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

ایک اک سانس مری رہن تھی دلدار کے پاس
نقدِ جاں بھی نہ رہا قرض ادا ہونے تک

مانگنا اپنے خدا سے بھی ہے دریوزہ گری
ہاتھ شل کیوں نہ ہوئے دستِ دعا ہونے تک

اب کوئی فیصلہ ہو بھی تو مجھے کیا لینا
میں تو کب سے ہوں سرِ دار، سزا ہونے تک

داورا! تیری مشیت بھی تو شامل ہو گی
ایک اچھے بھلے انساں کے برا ہونے تک

دستِ قاتل سے ہوں نادم کہ لہو کو میرے
عمر لگ جائے گی ہم رنگِ حنا ہونے تک

دشت سے قلزمِ خوں تک کی مسافت ہے فراز
قیس سے غالبِ آشفتہ نوا ہونے تک

○
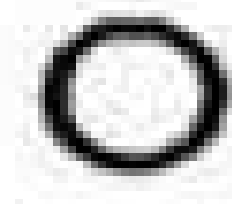
خوش کون رہا پوششِ ہجراں کو پہن کر
سو تو بھی نہ میلا یہ ستارہ سا بدن کر

ہم سبزۂ پامال ہیں کب در خورِ احساں
تو بادِ صبا ہے، گل و لالہ سے سخن کر

آوارہ نہ پھر، شامِ غریبی کے مسافر
آ اور مرے دل کی سرائے کو وطن کر

کس ظلم پہ آخر کو ہوئی تجھ کو بھی حیرت
کیوں دیکھ رہا ہے مجھے تصویر سی بن کر

بے جوششِ خوں، رنگِ محبت نہیں کھلتا
اے دشمنِ جاں، دل کو نہ محرومِ بدن کر

لب تشنۂ خوں کب سے ہے اک اک مژۂ یار
وا اے دہنِ زخمِ جگر، راہِ سخن کر

تیرا تو برا حال ہے پہلے سے زیادہ
لے اور فرازؔ اس سے نہ ملنے کے جتن کر

○
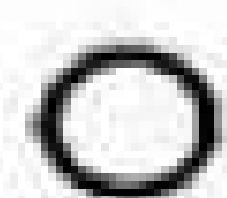
نامہ تو ہم نے بھیجا ہے اس کو صبا کے ہاتھ
اب دیکھئے لگے نہ لگے آشنا کے ہاتھ

پھر یاد آ گئیں مجھے محرومیاں مری
دل بیٹھ سا گیا ہے دعا کو اٹھا کے ہاتھ

جانے کس آستیں سے پکارے مرا لہو
منصف عدالتوں میں ہیں بیٹھے چھپا کے ہاتھ

دنیا بھی تیرے ساتھ ہے دل بھی تری طرف
اب میرا تیرا فیصلہ ٹھہرا خدا کے ہاتھ

اس سرد مہر کی ستم ایجادیاں نہ پوچھ
جو تاپتا ہے' میرے خطوں کو جلا کے' ہاتھ

عمروں کی دوستی کا صلہ یہ ملا کہ وہ
رخصت ہوا تو بس یونہی رسماً ہلا کے ہاتھ

اے شکوہ سنجِ شدتِ اغیار، شکر کر
تجھ کو لگے نہیں ہیں کسی آشنا کے ہاتھ

تجدیدِ دوستی ہے تو اے میرے زُود رنج
تھوڑا سا مسکرا کے، ذرا سا بڑھا کے ہاتھ

چاکِ قبا پہ میری نظر تھی کہ یار نے
جلدی سے رکھ دیئے مری آنکھوں پہ آ کے ہاتھ

ساقی نے کتنے پیار سے دیکھا فرازؔ جب
مانگی شراب میں نے پیالہ بنا کے ہاتھ

○
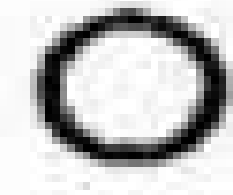
پھرا ہوں سارے زمانے میں در بدر کیسا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا مگر کیسا

وہ جانتا تھا کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں
پکارتا رہا اس کو اِدھر اُدھر کیسا

نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب ترا
فقط تکلفِ دیوار و در ہے، گھر کیسا

میں جس کے ہجر میں رویا ہوں پاگلوں کی طرح
وہ کل ملا تو ہنسا میرے حال پر کیسا

عزیز تر تھی جسے نیند شامِ وصل میں بھی
وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسا

بس ایک شخص کی خاطر بس ایک دل کے لئے
وطن کو تج دیا دیوانگی میں، گھر کیسا

کہاں کی دوستی، کیسا فراق، کون فراز
میں خود کو بھول گیا تجھ کو بھول کر کیسا

○
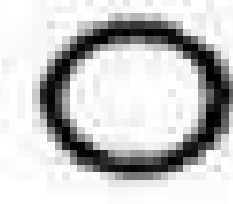
کیوں نہ ہم عہدِ رفاقت کو بھلانے لگ جائیں
شاید اس زخم کو بھرنے میں زمانے لگ جائیں

نہیں ایسا بھی کہ اک عمر کی قُربت کے نشے
ایک دو روز کی رنجش سے ٹھکانے لگ جائیں

یہی ناصح جو ہمیں تجھ سے نہ ملنے کو کہیں
تجھ کو دیکھیں تو تجھے دیکھنے آنے لگ جائیں

ہم کہ ہیں لذتِ آزار کے مارے ہوئے لوگ
چارہ گر آئیں تو زخموں کو چھپانے لگ جائیں

ربط کے سینکڑوں حیلے ہیں، محبت نہ سہی
ہم ترے ساتھ کسی اور بہانے لگ جائیں

ساقیا! مسجد و مکتب تو نہیں میخانہ
دیکھنا، پھر بھی غلط لوگ نہ آنے لگ جائیں

قرب اچھا ہے مگر اتنی بھی شدت سے نہ مل
یہ نہ ہو تجھ کو مرے روگ پرانے لگ جائیں

اب فرازؔ آؤ چلیں اپنے قبیلے کی طرف
شاعری ترک کریں، بوجھ اٹھانے لگ جائیں

○

چاہت کے صبح و شام محبت کے رات دن
"دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

وہ شوقِ بے پناہ میں الفاظ کی تلاش
اظہار کی زبان میں لکنت کے رات دن

وہ ابتدائے عشق وہ آغازِ شاعری
وہ دشتِ جاں میں پہلی مسافت کے رات دن

سودائے آذری میں ہوائے صنم گری
وہ بت پرستیوں میں عبادت کے رات دن

اک سادہ دل، دیارِ کرشمہ گراں میں گم
اک قریۂ طلسم میں حیرت کے رات دن

لب ہائے نارسیدہ کی لرزش سے جاں بلب
صہبائے ناچشیدہ کی لذت کے رات دن

روئے نگار و چشمِ غزالیں کے تذکرے
گیسوئے یار و حرف و حکایت کے رات دن

ناکردہ کاریوں پہ بھی بدنامیوں کا شور
اختر شماریوں پہ بھی تہمت کے رات دن

سوداگرانِ منبر و مکتب سے رو کشی
جاں دادگانِ دانش و حکمت کے رات دن

اہلِ قبا و اہلِ ریا سے گریز پا
وہ واعظانِ شہر سے وحشت کے رات دن

میرؔ و انیسؔ و غالبؔ و اقبالؔ سے الگ
راشدؔ، ندیمؔ، فیضؔ سے رغبت کے رات دن

فردوسیؔ و نظیریؔ و حافظؔ کے ساتھ ساتھ
بیدلؔ، غنیؔ، کلیمؔ سے بیعت کے رات دن

شیلےؔ کا سحر، کیٹسؔ کا دکھ، بائرنؔ کی دھج
ان کافرانِ عشق سے نسبت کے رات دن

تشکیک و ملحدانہ رویے کے باوجود
رومیؔ سے والہانہ عقیدت کے رات دن

جیسے مئے سخن سے صراحی بھری ہوئی
زورِ بیان و حسنِ طبیعت کے رات دن

یاروں سے شاعرانہ حوالے سے چشمکیں
غیروں سے عاشقانہ رقابت کے رات دن

شعری سفر میں بعض بزرگوں سے اختلاف
پیرانِ میکدہ سے بغاوت کے رات دن

رکھ کر کتابِ عقل کو نسیاں کے طاق پر
وہ عاشقی میں دل کی حکومت کے رات دن

ہر روز، روزِ ابر تھا ہر رات چاند رات
آزاد زندگی تھی، فراغت کے رات دن

وہ صبح و شام در بدری، ہم سنوں کے ساتھ
آوارگی و سیر و سیاحت کے رات دن

اک محشرِ خیال کے ہجراں میں کاٹنا
تنہائی کے عذاب، قیامت کے رات دن

اک لُعبتِ جمال کو ہر وقت سوچنا
اور سوچتے ہی رہنے کی عادت کے رات دن

اک رازدارِ خاص کو ہر وقت ڈھونڈنا
بے اعتباریوں میں ضرورت کے رات دن

وہ ہر کسی سے اپنا ہی احوال پوچھنا
اپنے سے بھی تجاہل و غفلت کے رات دن

بے وجہ اپنے آپ کو ہر وقت کوسنا
بے سود ہر کسی سے شکایت کے رات دن

رسوائیوں کی بات تھی رسوائیاں ہوئیں
رسوائیوں کی عمر میں شہرت کے رات دن

اک دشمنِ وفا کو بھلانے کے واسطے
چارہ گروں کے پند و نصیحت کے رات دن

پہلے بھی جاں گُسل تھے مگر اس قدر نہ تھے
اک شہرِ بے اماں میں سکونت کے رات دن

اس دولتِ ہُنر پہ بھی آزارِ مفلسی
اس روشنیٔ طبع پہ ظلمت کے رات دن

پھر یہ ہوا کہ شیوۂ دل ترک کر دیا
اور تج دیئے تھے ہم نے محبت کے رات دن

ہر آرزو نے جامۂ حسرت پہن لیا
پھر ہم تھے اور گوشۂ عزلت کے رات دن

ناداں ہیں وہ کہ جن کو ہے گم نامیوں کا رنج
ہم کو تو راس آئے نہ شہرت کے رات دن

فکرِ معاش ' شہر بدر کر گئی ہمیں
پھر ہم تھے اور قلم کی مشقت کے رات دن

''خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا''
اور مدّعی تھے صنعت و حرفت کے رات دن

کیا کیا ہمیں نہ عشق سے شرمندگی ہوئی
کیا کیا نہ ہم پہ گزرے ندامت کے رات دن

آکاس بیل پی گئی اک سرو کا لہو
آسیب کھا گیا کسی قامت کے رات دن

کاٹی ہے ایک عمر اسی روزگار میں
برسوں پہ تھے محیط، اذّیت کے رات دن

ساماں کہاں کہ یار کو مہماں بلایئے
امکاں کہاں کہ دیکھئے عشرت کے رات دن

پھرتے تھے میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہ تھا
قسمت میں جب تلک تھے قناعت کے رات دن

سو یہ بھی ایک عہدِ زیاں تھا، گزر گیا
کٹ ہی گئے ہیں جبرِ مشیت کے رات دن

نوواردانِ شہرِ تمنا کو کیا خبر
ہم ساکنانِ کوئے ملامت کے رات دن

○
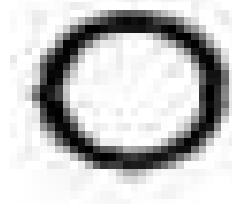
پھرتے ہیں اب بھی دل کو گریباں کیے ہوئے
جن وحشیوں پہ ہیں ترے احساں کیے ہوئے

تجدیدِ عشق کیا ہو کہ برسوں گزر گئے
تجھ سے کوئی سخن بھی مری جاں کیے ہوئے

اب تجھ سے کیا گلہ ہو کہ اک عمر ہو گئی
ہم کو بھی قصدِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے

دل سے ہوئی ہے پھر ترے بارے میں گفتگو
تر آنسوؤں سے دیدہ و داماں کیے ہوئے

جی مانتا نہیں ہے کہ ہم بھی بھلا چکیں
تیری طرح سے وعدہ و پیماں کیے ہوئے

کچھ ضد میں ناصحوں کی تجھے چاہتے رہے
کچھ پاسداریٔ دلِ ناداں کیے ہوئے

ہم وہ کہ تجھ کو شعر میں تصویر کر دیا
صورت گرانِ شہر کو حیراں کئے ہوئے

بازار سرد تھا نہ خریدار کم نظر
ہم خود تھے اپنے آپ کو ارزاں کئے ہوئے

اے عشق ہم سے اور بھی ہوں گے زمانے میں
اچھے بھلے گھروں کو بیاباں کئے ہوئے

کچھ ہم سے نامراد کہ پھرتے ہیں کوبکو
دل کو کسی فقیر کا داماں کئے ہوئے

وعدہ کیا تھا اس نے کسی شام کا کبھی
ہم آج تک ہیں گھر میں چراغاں کئے ہوئے

اب اس کے جور سے بھی گئے ہم کہ جب سے ہیں
اپنے کئے پہ اس کو پشیماں کئے ہوئے

یہ رتجگے قبول کہ آرام سے تو ہیں
رکھتے تھے ورنہ خواب، پریشاں کئے ہوئے

ہم وہ اسیر ہیں کہ زمانے گزر گئے
"بند اپنے آپ پر درِ زنداں کئے ہوئے"

ترکِ وفا کے بعد ہوس اختیار کی
اس کاروبار میں بھی ہیں نقصاں کئے ہوئے

جانِ فرازؔ مرگِ تمنا کے باوجود
بھولے نہیں ہمیں ترے احساں کئے ہوئے

○
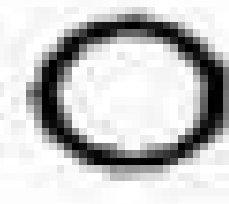
صد رنگِ چمن دیدۂ حیراں میں پھرے تھا
جوں موسمِ گُل یار گلستاں میں پھرے تھا

وحشی کو ترے دشت نوردی نہیں بھولی
زنجیر بہ پا ہو کے بھی زنداں میں پھرے تھا

کرتے بھی تو ہم کیا کوئی تدبیر رفو کی
سوزن کی طرح درد دل و جاں میں پھرے تھا

شاید ہو تجھے یاد کہ اے صاحبِ محفل
اک سوختہ جاں بزمِ چراغاں میں پھرے تھا

کیا حال کہوں قلزمِ ہستی کے سفر کا
تنکے کی طرح نوح کے طوفاں میں پھرے تھا

یہ سچ ہے بدلنے میں زمانے نہیں لگتے
ہاں شیخ بھی کل صورتِ انساں میں پھرے تھا

مشکل سے ملے تم کو فرازؔ ایسا دوانہ
جو شہر میں رہ کر بھی غزالاں میں پھرے تھا

○
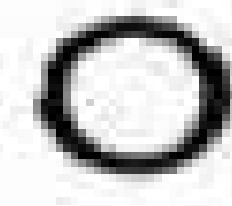
حیرت ہے لوگ اب بھی اگر خوش عقیدہ ہیں
ہم ساکنانِ قریۂ آفت رسیدہ ہیں

اس سنگ زار میں ہُنرِ آذری ہے شرط
کتنے صنم ہیں جو ابھی ناآفریدہ ہیں

ہم حرف گر ہزار کہیں دل کے مرثیے
اُس بارگاہ میں تو سراپا قصیدہ ہیں

اہلِ جہاں ہماری روش سے ہیں بے خبر
ہم پیرہن دریدہ نہیں دل دریدہ ہیں

آتا ہے کب کوئی کسی آتش بجاں کے پاس
اچھا ہوا کہ آپ بھی دامن کشیدہ ہیں

اے زندگی اب اور کوئی تجربہ کہ ہم
تریاقِ عشق و زہرِ زمانہ چشیدہ ہیں

فرصت ملے تو آ مرے خلوت کدے میں سن
دیوان میں کہاں جو سخن چیدہ چیدہ ہیں

ہم اہلِ دل سے اہلِ جہاں کے تعلقات
ہیں تو سہی فرازؔ مگر خط کشیدہ ہیں

○
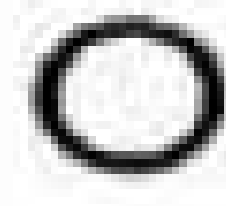
دل بدن کا شریکِ حال کہاں
ہجر پھر ہجر ہے وصال کہاں

عشق ہے نام انتہاؤں کا
اس سمندر میں اعتدال کہاں

ایسا نشہ تو زہر میں بھی نہ تھا
اے غمِ دل تری مثال کہاں

ہم کو بھی اپنی پائمالی کا
ہے مگر اس قدر ملال کہاں

میں نئی دوستی کے موڑ پہ تھا
آ گیا ہے ترا خیال کہاں

دل کہ خوش فہم تھا سو ہے ورنہ
تیرے ملنے کا احتمال کہاں

وصل و ہجراں ہیں اور دنیائیں
ان زمانوں میں ماہ و سال کہاں

تجھ کو دیکھا تو لوگ حیراں ہیں
آ گیا شہر میں غزال کہاں

تجھ پہ لکھی تو سج گئی ہے غزل
آ ملا خواب سے خیال کہاں

اب تو شہہ مات ہو رہی ہے فرازؔ
اب بچاؤ کی کوئی چال کہاں

○
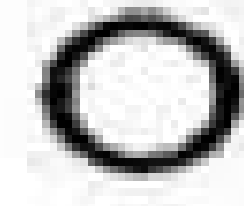
ایک دیوانہ یہ کہتے ہوئے ہنستا جاتا
کاش منزل سے بھی آگے کوئی رستا جاتا

اے مرے ابرِ گریزاں مری آنکھوں کی طرح
گر برسنا ہی تجھے تھا تو برستا جاتا

آج تک یاد ہے اظہارِ محبت کا وہ پل
کہ مری بات کی لکنت پہ وہ ہنستا جاتا

چلو پتھر نہ اُٹھاتے ترے دیوانے پہ لوگ
سرِ راہے کوئی آوازہ ہی کستا جاتا

اتنے محدود کرم سے تو تغافل بہتر
گر ترسنا ہی مجھے تھا تو ترستا جاتا

○

وہ گیا تو ساتھ ہی لے گیا سبھی رنگ اُتار کے شہر کا
کوئی شخص تھا مرے شہر میں، کسی دُور پار کے شہر کا

چلو کوئی دل تو اداس تھا چلو کوئی آنکھ تو نم رہی
چلو کوئی در تو کھلا رہا، شبِ انتظار کے شہر کا

کئی خوشبوئیں درِ دوست تک مرے ساتھ شمع بدست تھیں
مجھے پوچھنا نہ پڑا پتہ، مرے گُل عذار کے شہر کا

یہ جو میں نے تازہ غزل کہی سو ہے نذر اہلِ فراق کی
کہ نہ مل سکا کوئی نامہ بر مجھے میرے یار کے شہر کا

سو متاعِ جاں کو لئے ہوئے پلٹ آئے تیرے گرفتہ دل
کسے بیچتے کہ ملا نہیں کوئی اعتبار کے شہر کا

مری طرزِ نغمہ سرائی سے کوئی باغباں بھی تو خوش نہ تھا
یہ مرا مزاج ہے کیا کروں کہ میں ہوں بہار کے شہر کا

کسی اور دیس کی اور کو سنا ہے فرازؔ چلا گیا
سبھی دکھ سمیٹ کے شہر کے، سبھی قرض اتار کے شہر کا

اے عشقِ جنوں پیشہ

جو ابتدائے سخن ہے جو انتہائے سخن
تمہارے نام ہے ساری مری متاعِ سخن

ترتیب

احمد فراز کی شاعری

(میری ہزاروں آوازیں ہیں)

پروفیسر شمیم حنفی

معروف شخصیتوں اور تخلیقات کے گرد، کبھی کبھی، ایک رمز آمیز دائرہ ایک ہالہ سا بن جاتا ہے۔ ہم کبھی تو اس ہالے کو اس شخصیت یا تخلیق تک رسائی یا اس سے شناسائی کے ایک وسیلے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس شخصیت یا تخلیق تک پہنچنے کے لیے اسے توڑنا/منتشر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ احمد فرازؔ کی شاعری کے گرد سب سے زیادہ دُھند اُن کی بے حساب شہرت اور مقبولیت نے پھیلائی ہے۔ ہمارے زمانے میں اچھی نظم اور اچھی غزل کہنے والے، منیر نیازی سے لے کر احمد مشتاق تک اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن ان کے اوصاف اور ان کی پہچان کے نقش ونشان بہت صاف اور واضح ہیں کہیں کوئی متنازعہ پیچ، کسی طرح کا دھندلکا نہیں ہے۔ لیکن فرازؔ کی عام مقبولیت اور بے حساب شہرت نے ان کی شاعری پر سنجیدہ سوچ بچار کے راستے میں خاصی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال فیضؔ صاحب کے معاملے میں بھی سامنے آئی تھی۔ ان کے ہم عصروں میں ن م راشدؔ سے سردار جعفریؔ تک، ان کی شہرت اور مقبولیت ایک مستقل مسئلہ بنی رہی۔ کسی نے ان کو فکری تساہل کا قصوروار ٹھہرایا، کسی نے خارجی آرائش وزیبائش کو ان کی شاعری کی عام کشش کا سبب بتایا۔ لیکن فیضؔ صاحب اپنے اعتماد خلقی اور استغنا کے ساتھ اپنا سا شعر کہتے رہے۔ انہیں کبھی بھی اس بات سے غرض نہیں رہی کہ ان کے بعض جید معاصرین کی طرف سے ان کی شاعری پر جو اعتراضات وارد ہوئے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔

احمد فراز، فیض صاحب کے بعد ہمارے مقبول ترین شاعر ہیں۔ انہیں جیتے جی ایسی شہرت ملی ہے جو افسانہ بن جاتی ہے۔ فرازؔ کے بعض معاصرین بھی ان کی شاعری پر معترض ہوتے ہیں اور 1960ء کے بعد کی نظم اور غزل کے جائزوں میں اکثر فراز سے زیادہ ذکر ایسوں کا بھی ہوتا ہے جو ان کی شاعرانہ حیثیت کو نہیں پہنچتے۔ لیکن فراز کے تخلیقی انہماک میں اس واقعے سے کبھی فرق نہیں آیا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہی ہے کہ چالیس پینتالیس برس تک مسلسل اتنی شہرت اور مقبولیت کا بوجھ سنبھالے رکھنا، بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فرازؔ کی شاعری کے اوصاف اور محاسن کی بنیادوں تک پہنچنے کی کوئی باضابطہ کوشش ابھی تک تو ہوئی نہیں۔ غیر معمولی شہرت اور بے تحاشا مقبولیت اس شاعری کا حجاب بن کر رہ گئی ہے۔ میرا اپنا تعارف اس شاعری سے تقریباً انہی دنوں ہوا جب فرازؔ کی ابتدائی نظمیں اور غزلیں پہلے پہل شائع ہوئی اور میرے اولین تاثر کی تصدیق اس وقت ہوئی جب فراق کی تازہ تصویر دیکھ کر کہی جانے والی ان کی ایک نظم سامنے آئی۔

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

وغیرہ وغیرہ۔ خود فراقؔ صاحب پر فرازؔ کی اس نظم نے اتنا گہرا تاثر مرتب کیا تھا کہ کئی روز تک وہ اپنے ہر ملاقاتی کو یہ نظم سناتے رہے۔ اصل میں فرازؔ کی ایک خوبی جسے وہ شروع سے اب تک یکساں کامیابی کے ساتھ نبھائے جا رہے ہیں اپنے احساسات کو رنگوں اور شبیہوں کے واسطے سے بیان کرنے کا غیر معمولی ملکہ ہے، کسی بھی کیفیت یا تجربے کے اظہار میں تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کیفیت یا تجربے کا معروضی تلازمہ ہاتھ آجائے۔ فرازؔ کی شاعری کا بنیادی خمیر اس کا تصوراتی (Conceptual) ہونا ہے، گویا کہ اپنے ہر شعر کے ذریعے وہ اپنی کسی ذہنی رو، کسی خیال کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور ان کا ہر شعر اپنی ایک خاص فکری اساس رکھتا ہے، لیکن یہ شاعری محض خیال کی شاعری نہیں ہے۔ خیال محض کی شاعری تو وہ ہوتی ہے جو ایک ویران اور بے برگ و بار باطن کی سطح سے نمودار ہوتی ہے اور پڑھنے والے

کے احساسات کو منور کیے بغیر اس کے شعور کی بس بیرونی پرت کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ فراق صاحب کا یہ تاثر کہ ''...... فراز کے وجدان کی اور جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دلکش خدوخال سے مزین ہے۔'' اسی حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ فراز کے اشعار صرف ان کی سوچ کو بے نقاب نہیں کرتے، ان کے پورے وجود کی تصویر سامنے لاتے ہیں۔ اور فراز کی شاعرانہ شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے چند بنیادی اوصاف کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ شخصیت اپنی تراش خراش، نفاست اور اشعار سے ایک طرح کی تکمیل کا احساس جگانے کے باوجود نہ تو صرف کلاسیکی ہے نہ صرف رومانی کلاسیکی۔ رچاؤ اور رومانیت فراز کی شاعری کے صرف ایک پہلو سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں خوبیاں مل کر ان کی نظموں غزلوں میں اثر انگیزی کی اسی جادوئی کیفیت کا سبب بنتی ہیں جو صرف ذہنی تجربوں پر تکیہ کرنے والی شاعری کا مقسوم نہیں ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ ''فراز نے قدیم و جدید کے نہایت حسین اور دلآویز مرکب پر کامیاب تجربے کیے ہیں۔'' بہ ظاہر یہ رائے رسمی اور صرف ایک تاثر پر مبنی محسوس ہوتی ہے، لیکن واقعہ یہی ہے کہ فراز نے اپنی شاعری کو نہ تو کسی خاص وضع کا پابند ہونے دیا نہ قدیم و جدید کے مابین کوئی حد مقرر کی۔ ہمارے عہد کے عام جدید شاعروں کے برعکس، فراز کی شاعری کا عقبی پردہ مغربی زبانوں کے ادب یا شعری ہیئتوں کے بجائے فارسی اور اُردو کی کلاسیکی شاعری نے مہیا کیا ہے۔ ان کی زبان و بیان میں فارسی غزل اور اُردو کی کلاسیکی غزل کے رنگ صاف جھلکتے ہیں۔ اساتذہ کی زمینوں میں انہوں نے بہت سی غزلیں کہی ہیں اور ان میں بھی ان کی ترجیحات سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ کے قائم کردہ اسالیب کی پابند ہیں۔ فراز کا امتیاز یہ ہے کہ اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے بھی وہ اپنا تشخص محفوظ رکھتے ہیں اور اساتذہ کے شب چراغ کی روشنی سے فیض اٹھانے کے باوجود اپنی تخلیقیت کو بجھنے نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل سے یہ چند اشعار دیکھیے۔

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو ناخوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازؔ
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دل آزار کے بیچ

محبتوں کا بھی موسم ہے جب گذر جائے
سب اپنے اپنے گھروں کو تلاش کرتے ہیں

سنا ہے کل جنہیں دستار افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزت سادات بھی دستار کے ساتھ

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

اتنے سکوں کے دن کبھی دیکھے نہ تھے فرازؔ
آسودگی نے مجھ کو پریشان کر دیا

وصل و ہجراں ہیں اور دنیائیں
ان زمانوں میں ماہ و سال کہاں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

رہ وفا میں حریف خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

مرے حریف کھلے دل سے اب شکست بھی مان
نہ یہ کہ فرطِ ندامت سے منہ پہ چادر کھینچ

یہ رعونت تابکے اے دلِ نگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ان اشعار سے جو موزیک بنتا ہے اس سے ایک رومانی، ایک نوکلاسیکی، ایک جدید، ایک باغی شاعر کی تصویر ایک ساتھ سامنے آتی ہے۔ فرازؔ کی حسیت کے ایک ساتھ کئی نام ہیں اور ایک ساتھ کئی چہرے۔ ان میں سب سے نمایاں صورتیں دو ہیں، ایک تو کسی ازلی اور ابدی عاشق کی، دوسری ایک ریڈیکل، حساس، جذباتی انقلابی کی جو گرد و پیش کی زندگی سے غیر مطمئن اور اپنے ماحول سے برسرِ پیکار دکھائی دیتا ہے۔ فیضؔ کے بعد فرازؔ کا نام اس حیثیت سے نمایاں ترین کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بصیرتوں کا پس منظر ان کی ادبی روایت، ان تک سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی کلاسیکی قدروں کے ساتھ ساتھ ان کے زمانے کی اجتماعی زندگی اور ان کی تاریخ نے ساتھ ساتھ مرتب کیا ہے۔ فرازؔ کی حسیت اسی لیے بیک وقت روایتی بھی ہے اور جدید بھی۔ ایجاب اور انتخاب کا عنصر اس حسیت کی ترکیب میں ہمیں ایک ساتھ شامل نظر آتا ہے۔ پھر ہمارے عہد کی انسانی صورتِ حال کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آج کا ادب اور آج کا ادیب مزاحمت اور احتجاج کے رویے سے دست بردار نہ ہو۔ فرازؔ کی شاعری میں کلاسیکی آداب کی پاسداری کے علاوہ انکار، احتجاج اور مزاحمت کا میلان بھی اپنے تمام معاصرین کے مقابلے میں زیادہ روشن اور تابناک دکھائی دیتا ہے۔ مزاحمت کی روایت جسے معاصر ادب (بالخصوص پاکستان میں تخلیق کیے جانے والے ادب) کی مرکزی روایت کا نام دیا جا سکتا ہے، اپنی سب سے مانوس اور معروف شکلوں میں فیضؔ کے بعد حبیب جالبؔ اور فرازؔ کے یہاں رونما ہوئی۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ جالبؔ نے عوامی مقبولیت کے پھیر میں اپنے مزاحمتی رویے اور احتجاجی لہجے کی تہذیب پر کوئی توجہ نہ دی اور فرازؔ کے یہاں زندگی اور شاعری کے مطالبات کی یکساں ادائیگی کا شعور ہمیشہ مستحکم رہا۔ فرازؔ کے یہاں

کلاسیکی درو بست اور شعر کے فنی محاسن کی فہم نے ان کے حرف احتجاج کو کبھی عریاں نہیں ہونے دیا۔ وہ سخت سے سخت بات بھی سنبھل کر کہنے کا گر جانتے ہیں۔ اپنے عہد کی ہر ایسی واردات پر جو اجتماعی زندگی کے آشوب سے متعلق ہے، اپنا بیان دیتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری صرف بیان کی شاعری بھی نہیں ہے۔ بیان کی شاعری، ان کے یہاں ایک مرتب اور مضبوط، محکم شاعرانہ بیان کے طور پر نمودار ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے ہجوم کی آواز اور اجتماعی طرزِ احساس کو طرح طرح کے رنگوں میں سامنے لانے کے بعد بھی فرآز کا لہجہ ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ وہ مانوس استعاروں، علائم، نشانات کو بھی اپنے صرف میں اس طرح لاتے ہیں کہ ان میں ایک غیر رسمی جہت خود بہ خود پیدا ہو جاتی ہے۔ صلابت اور نرمی کا، احتجاج اور افسردگی کا، شعور کی سنگینی اور گھلاوٹ کا ایسا امتزاج ہمیں اس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ فرآز کی نظموں اور غزلوں میں نالہ اس خاموشی کے ساتھ نغمہ بنتا ہے اور شخصی شعری تجربہ ایسے خود کار انداز میں عوامی اور اجتماعی واردات کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ان کا شعر سننے یا پڑھنے والے کے ادراک پر ان کی کڑی بات کبھی بوجھ نہیں بنتی۔

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں
مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی میں
کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

(یہ میری نظمیں، یہ میری غزلیں)

یہ کون معصوم ہیں
کہ جن کو
سیاہ آندھی
دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کوئی جانتا نہیں ہے
یہ کس قبیلے کے سر بکف جانثار ہیں
جن کو کوئی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحان ہے
نہ کوئی بچہ، نہ کوئی بابا، نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ
بادشاہ چپ ہے
حرم کے سب پاسبان
عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے
سربراہ چپ ہیں

تمام اہل ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے

لا الہ چپ ہیں

(بیروت)

کون اس قتل گہہ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشتہ کو پھلوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسل انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

(سلامتی کونسل)

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کے دامان و آستیں
خون بے گناہوں سے تر بتر ہے
تو نسل آدم
وفور نفرت سے روئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسل آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذب جہاں کی مخلوق

کل ترے روبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہ تیغ کر رہا تھا
تو تو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ براں میں
اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم بھی کیا جواب دیں گے

(ویت نام)

ظاہر ہے کہ یہاں شاعری اور زندگی کی حدیں اس طرح گڈمڈ ہوگئی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن کبھی کبھی شاعر کو اپنے احساسات کی قیمت اس طرح بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسا تخلیقی فریضہ ہے جس کی ادائیگی سے ڈرنا اور بچنا، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ شعری اظہار اور اسلوب کے سیاق میں یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اس وقت میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فراز کے یہاں اس قسم کے مشکل مقامات سے گزرنے کا ایک اور قرینہ ان تراجم کے طور پر سامنے آیا ہے جن میں جنوبی افریقہ کے شاعروں نے انسانی بے بسی، واماندگی اور غم و غصے کی ایک نئی بوطیقا ترتیب دی ہے۔ ''سب آوازیں میری ہیں'' میں حرف سادہ کے عنوان سے فراز نے اس اقدام کا جواز یوں پیش کیا ہے کہ:

......یہ تراجم محض تخلیقی ہتھیاروں کو صیقل رکھنے کی غرض سے ہی نہیں کیے گئے بلکہ کچھ اور محرکات بھی تھے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں خود انہی حالات سے گزر رہا ہوں جن سے بیشتر افریقی جلاوطن شاعر دوچار ہیں۔ دوسرا سبب یہ کہ پاکستان اور جنوبی افریقہ کے تاریخی اور سیاسی کوائف مختلف ہوتے ہوئے بھی کئی طرح کی مماثلت رکھتے ہیں۔

......ساتھ ہی یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ جب خلقِ خدا ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہوا اور لوگ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جانیں تک قربان کر رہے ہوں تو لکھنے والوں پر کیا ذمے داری عاید ہوتی ہے اور اس تناظر میں انکا کیا کردار ہونا چاہیے۔

میں اپنے مختصر پیش لفظ کو افریقی ادیب کے اس جملے پر ختم کرتا ہوں۔

''صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے۔''

(احمد فراز، لندن، سب آوازیں میری ہیں)

انا کے شعور کی تمام شکلوں میں سب سے مضحکہ خیز شکل تخلیقی انا یا اپنی Creative Ego کے شعور کی ہے۔ بہ قول شخصے، گہرے انسانی سروکار ''انا کے اس غبارے'' کو پھوڑنے کا سب سے مؤثر وسیلہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ بات بھی دھیان میں رہنی چاہیے کہ کلاسیکی ادب کے مشاہیر کا اپنی قائم کردہ تخلیقی شرطوں پر جمے رہنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اس کم عیار عہد میں، جہاں بیشتر لکھنے والوں کی بصیرت پرت دو پرت سے زیادہ گہری نہیں ہوتی اور جن کے عام شعور کی قامت بس ماچس کی تیلیوں کے برابر کہی جاسکتی ہے، مستعار نظریوں کی مدد سے تخلیقی تجربے کی حرمت پر ان کا اصرار نا قابل فہم ہے۔ ہمارے زمانے کے شعر و ادب کو سب سے زیادہ نقصان اسی قسم کی غلط گمانیوں نے پہنچایا ہے۔ نظریاتی تعبد پر حد سے بڑھا ہوا اعتماد بھی دراصل اسی ''انا'' کے ابتذال آمیز شعور کی دین ہے۔'' کلچر، کمیونی کیشن اینڈ سوچیلنج'' کے مصنف پی سی جوشی نے اس المیے پر بہت تاسف کا اظہار کیا تھا کہ ہمارے یہاں نئے شعور اور طرزِ احساس کی آمد کے مبالغہ آمیز اعلان کے باوجود تجدد کا کوئی قومی تصور ظہور پذیر نہ ہو سکا۔ اسی لیے ہمارے اکثر انقلابی ادیب تھیوریٹیکل یا نظریاتی کلیشوں کی مدد سے ادب کے سماجی رول کی بابت اونچی اونچی باتیں اور دعوے تو کرتے ہیں، مگر ان کی اپنی تخلیقات میں حرارت اور طاقت بالعموم ناپید ہوتی ہے۔ احمد فراز نے ''سب آوازیں میری ہیں'' میں جن نظموں کے ترجمے کیے ہیں اور اس عمل

کے واسطے سے خود اپنی حسیت کے جس رخ کی نمائندگی کی ہے، اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

میں ایک خاموش طبع اور مرنجاں مرنج انسان ہوں
اپنی غیر مرئی رفتار سے گامزن
اپنے منصوبوں میں مگن
غلامی کی حد تک خوش خلق
لیکن پھر بھی
کبھی کبھی ماتمی نوحے
میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں
میری خاموش آنکھوں کے پیچھے
میرے سر میں
سائرن اور انسانی چیخوں کی آوازیں
گونجنے لگتی ہیں

(جلاوطنی)

(Dennis Brutus: I am the exile)

....

شاعر!
لوگوں کو یقین دلاؤ
کہ خواب بھی حقیقت بن سکتے ہیں
آزادی کی بات کرو
اور دھن وان کو
اس کے معطر خلوت خانے کی دیواروں پر

فن پارے سجانے دو
آزادی کی بات کرو
اور لوگوں کی آنکھوں کو چھو کر
انہیں احساس دلاؤ
کہ ان میں بے شمار ہونے کی قوت موجود ہے
وہ قوت
جو قید خانوں کی سلاخوں کو
گھاس کی بالیوں کی طرح مروڑ دیتی ہے
جو سنگ خارا کی دیواروں کو
کانچ کی طرح ریزہ ریزہ کر دیتی ہے
شاعر
ان لوگوں کو ڈھونڈو
جو قفلوں کے دہانے کھولے دیتے ہیں
اس سے پہلے
کہ آنے والے دس برسوں کو
گزرے ہوئے دس برس کھا جائیں

(آؤ نظمیں لکھیں)

(A.N.C. Kumalo: Red our colour)

....

نہیں
ہمیں اس راستے سے نہیں لوٹنا
کہیں ایسا نہ ہو

کہ پھر

ہم اپنے ہی سایوں کے روبرو ہو جائیں

کہیں ایسا نہ ہو

کہ ہمارے کانوں کے پردے

اپنی ہی اداسی کی گونج سے پھٹ جائیں

نہیں

ہمیں ہتھیار نہیں ڈالنے

چاہے یہ سلسلہ

کیسا ہی لامتناہی کیوں نہ ہو

....

ہمارے اطراف میں

مہکتے ہوئے پھولوں کی

مزید افزائش ہونی چاہیے

درختوں میں لگے پھل

تازہ پتوں میں جذب ہو جائیں

دگرنہ بعد میں

سڑے ہوئے رگ و ریشہ کے سوا

کیا رہ جائے گا

(ناتمام مسافت)

(Mazise Kunvi: Unfinished adventure)

ہمارے عہد کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ صحافت، سیاست اور صارفیت نے انسانی وسیلۂ اظہار کی آسان ترین شکل یعنی زبان کے ساتھ ایسی زیادتی کی ہے اور اتنے تشدد کو راہ دی ہے کہ زبان کا سارا وقار

اوراس کی تاثیر مٹی میں مل گئی ہے۔ ان حالات میں زبان کے تئیں، لکھنے والے کی ذمے داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے، سوائے اس کے کہ اپنے گرد زندگی سے لاتعلقی کا کوئی مصنوعی دائرہ بننے نہ دے اور حتی الامکان انسانی عنصر کے بحالی کا جتن کرتا رہے۔ فیضؔ صاحب کی نظم انتساب اسی سمت میں اٹھائے جانے والے ایک یادگار قدم کی نشاندہی کرتی ہے۔ فرازؔ نے ''سب آوازیں میری ہیں'' کے منظوم ترجموں اور اپنی منتخب نظموں اور غزلوں کے اشعار کی مدد سے یہی فریضہ ادا کرنا چاہا ہے اور تخلیقی زبان کے معاملے میں ایک ذمے دار لکھنے والے کا رول نبھایا ہے۔ اپنی اس جدوجہد میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور کہاں ناکام ٹھہرے ہیں، اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا، لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ فرازؔ کی تخلیقی جستجو کا سلسلہ جاری ہے اور ان کے احساسات میں کسی طرح کے تساہل اور تھکن کے آثار نظر نہیں آتے۔ فیضؔ صاحب کا خیال تھا کہ اپنے کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور لہجے کی غنائیت کے ساتھ ساتھ، فرازؔ نے اپنے جذباتی تموج اور احساسات کی شدت کے ذریعے اپنی ایک علیحدہ شناخت بنالی ہے، اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین میں وہ سب سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ سو ان کا یہ دعویٰ غلط تو نہیں کہ:

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تو ہے
قلم سرخرو ہے

(قلم سرخرو ہے)

اے عشقِ جنوں پیشہ

عمروں کی مسافت سے
تھک ہار گئے آخر

سب عہد اذیت کے
بیکار گئے آخر

اغیار کی باہوں میں
دلدار گئے آخر

رو کر تری قسمت کو
غمخوار گئے آخر

یوں زندگی گزرے گی
تا چند وفا کیشا

وہ وادیِ کلفت تھی
یا کوہِ الم جو تھا

سب مدِّ مقابل تھے
خسرو تھا کہ جم جو تھا

ہر راہ میں ٹپکا ہے
خونابہ بہم جو تھا

رستوں میں لٹایا ہے
وہ بیش کہ کم جو تھا

نے رنجِ شکستِ دل
نے جان کا اندیشہ

کچھ اہلِ ریا بھی تو
ہمراہ ہمارے تھے

رہرو تھے کہ رہزن تھے
جو روپ بھی دھارے تھے

کچھ سہل طلب بھی تھے
وہ بھی ہمیں پیارے تھے

اپنے تھے کہ بیگانے
ہم خوش تھے کہ سارے تھے

سو زخم تھے نس نس میں
گھائل تھے رگ و ریشہ

جو جسم کا ایندھن تھا
گلنار کیا ہم نے

وہ زہر کہ امرت تھا
جی بھر کے پیا ہم نے

سو زخم ابھر آئے
جب دل کو سیا ہم نے

کیا کیا نہ محبت کی
کیا کیا نہ جیا ہم نے

لو کوچ کیا گھر سے
لو جوگ لیا ہم نے

جو کچھ تھا دیا ہم نے
اور دل سے کہا ہم نے

رکنا نہیں درویشا

یوں ہے کہ سفر اپنا
تھا خواب نہ افسانہ

آنکھوں میں ابھی تک ہے
فردا کا پریخانہ

صد شکر سلامت ہے
پندارِ فقیرانہ

اس شہر خموشی میں
پھر نعرۂ مستانہ

اے ہمّتِ مردانہ
صد خارہ و یک تیشہ

اے عشقِ جنوں پیشہ
اے عشقِ جنوں پیشہ

○

قتلِ عشاق میں اب عذر ہے کیا بسم اللہ
سب گنہگار ہیں راضی بہ رضا بسم اللہ

میکدے کے ادب آداب سبھی جانتے ہیں
جام ٹکرائے تو واعظ نے کہا بسم اللہ

ہم نے کی رنجشِ بے جا کی شکایت تم سے
اب تمہیں بھی ہے اگر کوئی گِلا بسم اللہ

بتِ کافر ہو تو ایسا کہ سرِ راہگذار
پاؤں رکھے تو کہے خلقِ خدا بسم اللہ

ہم کو گُلچیں سے گلہ ہے گل و گلشن سے نہیں
تجھ کو آنا ہے تو اے بادِ صبا بسم اللہ

گرتے گرتے جو سنبھالا لیا قاتل نے فرازؔ
دل سے آئی کسی بسمل کی صدا، بسم اللہ

○
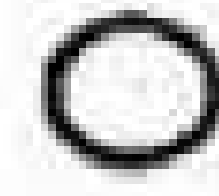
اُس کا اپنا ہی کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے
یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے

جیسے کوئی درِ دل پر ہو ستادہ کب سے
ایک سایہ نہ دروں ہے نہ بروں ہے یوں ہے

تم نے دیکھی ہی نہیں دشتِ وفا کی تصویر
نوکِ ہر خار پہ اک قطرۂ خوں ہے یوں ہے

تم محبت میں کہاں سود و زیاں لے آئے
عشق کا نام خرد ہے نہ جنوں ہے یوں ہے

اب تم آئے ہو مری جان تماشا کرنے
اب تو دریا میں تلاطم نہ سکوں ہے یوں ہے

ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یوں ہے یوں ہے

شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فرازؔ
یہ بھی اک سلسلۂ کُن فیکوں ہے یوں ہے

○
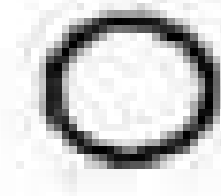
بھید پائیں تو رہِ یار میں گم ہو جائیں
ورنہ کس واسطے بیکار میں گم ہو جائیں

کیا کریں عرضِ تمنا کہ تجھے دیکھتے ہی
لفظ پیرایۂ اظہار میں گم ہو جائیں

یہ نہ ہو تم بھی کسی بھیڑ میں کھو جاؤ کہیں
یہ نہ ہو ہم کسی بازار میں گم ہو جائیں

کس طرح تجھ سے کہیں کتنا بھلا لگتا ہے
تجھ کو دیکھیں ترے دیدار میں گم ہو جائیں

ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
جیسے بچے کسی تہوار میں گم ہو جائیں

پیچ اتنے بھی نہ دو کرمکِ ریشم کی طرح
دیکھنا سر ہی نہ دستار میں گم ہو جائیں

ایسا آشوبِ زمانہ ہے کہ ڈر لگتا ہے
دل کے مضموں ہی نہ اشعار میں گم ہو جائیں

شہریاروں کے بلاوے بہت آتے ہیں فرازؔ
یہ نہ ہو آپ بھی دربار میں گم ہو جائیں

○
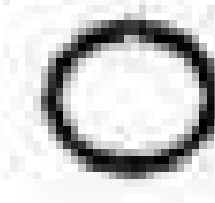
ذکرِ جاناں سے جو شہرِ سخن آراستہ ہے
جس طرف جایئے اک انجمن آراستہ ہے

یوں پھریں باغ میں بالا قد و قامت والے
تو کہے سرو و سمن سے چمن آراستہ ہے

خوش ہو اے دل کہ ترے ذوقِ اسیری کے لئے
کاکلِ یار شکن در شکن آراستہ ہے

کون آج آیا ہے مقتل میں مسیحا کی طرح
تختۂ دار سجا ہے رسن آراستہ ہے

شہرِ دل میں تو سدا بھیڑ لگی رہتی ہے
پر ترے واسطے اے جان من آ، راستہ ہے

ہاں مگر جاں سے گزر کر کوئی دیکھے تو سہی
عشق کی بند گلی میں بھی بنا راستہ ہے

اہلِ دل کے بھی مقدر میں کہاں منزلِ دوست
عام لوگوں پہ تو ویسے ہی منع[1] راستہ ہے

خوش لباسی ترے عشاق کی قائم ہے ہنوز
دیکھ کیا موجۂ خوں سے کفن آراستہ ہے

ایک پردہ ہے اسیروں کی زبوں حالی پر
یہ جو دیوارِ قفس ظاہراً آراستہ ہے

حوصلہ چاہیے طوفانِ محبت میں فرازؔ
اِس سمندر میں تو بس موجِ فنا راستہ ہے

---

1. قافیہ غلط سہی پر اچھا لگا۔

○
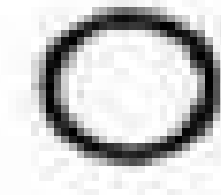
یہ دِل کسی بھی طرح شامِ غم گزار تو دے
پھر اس کے بعد وہ عمروں کا انتظار تو دے

ہوائے موسمِ گُل جانفزا ہے اپنی جگہ
مگر کوئی خبرِ یارِ خوش دیار تو دے

ہمیں بھی ضد ہے کہاں عمر بھر نبھانے کی
مگر وہ ترکِ تعلق کا اختیار تو دے

بجا کہ دردِ سری ہے یہ زندگی کرنا
مگر یہ بارِ امانت کوئی اُتار تو دے

ترا ہی ذکر کریں بس تجھی کو یاد کریں
یہ فرصتیں بھی کبھی فکرِ روزگار تو دے

ترے کرم بھی مجھے یاد ہیں مگر مرا دل
جو قرض اہلِ زمانہ کے ہیں اُتار تو دے

فلک سے ہم بھی کریں ظلمِ ناروا کے گِلے
پہ سانس لینے کی مہلت ستم شعار تو دے

فرازؔ جاں سے گزرنا تو کوئی بات نہیں
مگر اب اس کی اجازت بھی چشمِ یار تو دے

○
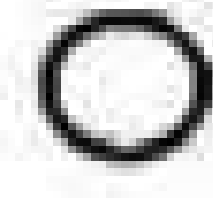
بجھا ہے دل تو غمِ یار اب کہاں تُو بھی
بسانِ نقش بہ دیوار اب کہاں تُو بھی

بجا کے چشمِ طلب بھی ہوئی تہی کیسہ
مگر ہے رونقِ بازار اب کہاں تُو بھی

ہمیں بھی کارِ جہاں لے گیا ہے دُور بہت
رہا ہے درپئے آزار اب کہاں تُو بھی

ہزار صورتیں آنکھوں میں پھرتی رہتی ہیں
مری نگاہ میں ہر بار اب کہاں تُو بھی

اُسی کو وعدہ فراموش کیوں کہیں اے دل!
رہا ہے صاحبِ کردار اب کہاں تُو بھی

مری غزل میں کوئی اور کیسے در آئے
ستم تو یہ ہے کہ اے یار! اب کہاں تُو بھی

جو تجھ کو پیار کرے تیری لغزشوں کے سبب
فرازؔ ایسا گنہگار اب کہاں تُو بھی

○
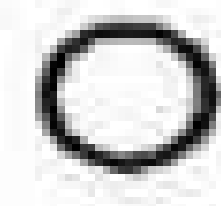
اک ذرا سُن تو مہکتے ہوئے گیسو والی
راہ میں کون دکاں پڑتی ہے خوشبو والی

پھر یہ کیوں ہے کہ مجھے دیکھ کے رم خوردہ ہے
تیری آنکھوں میں تو وحشت نہیں آہو والی

دیکھنے میں تو ہیں سادہ سے خدوخال مگر
لوگ کہتے ہیں کوئی بات ہے جادو والی

گفتگو ایسی کہ بس دل میں اُترتی جائے
نہ تو پُرپیچ نہ تہہ دار نہ پہلو والی

ایک منظر کی طرح دل پہ منقش ہے ابھی
اک ملاقات سرِ شامِ لبِ جُو والی

درد ایسا ہے کہ بجھتا ہے چمک جاتا ہے
دل میں اک آگ سی ہے آگ بھی جگنو والی

جیسے اک خواب سرائے سے گزر ہو تیرا
کوئی پازیب چھنک جاتی ہے گھنگھرو والی

زعم چاہت کا تھا دونوں کو مگر آخرِ کار
آ گئی بیچ میں دیوار من و تو والی

ایسا لگتا ہے کہ اب کے جو غزل میں نے کہی
آخری چیخ ہے دم توڑتے آہو والی

اک نگاہِ غلط انداز ہی اے جانِ فرازؔ
شوق مانگے ہے خلش تیر ترازو والی

○
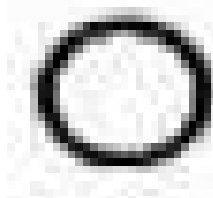
مثالِ دستِ زلیخا تپاک چاہتا ہے
یہ دل بھی دامنِ یوسف ہے چاک چاہتا ہے

دعائیں دو مرے قاتل کو تم کہ شہر کا شہر
اُسی کے ہاتھ سے ہونا ہلاک چاہتا ہے

فسانہ گو بھی کرے کیا کہ ہر کوئی سرِ بزم
مآلِ قصۂ دل دردناک چاہتا ہے

اِدھر اُدھر سے کئی آ رہی ہیں آوازیں
اور اُس کا دھیان بہت انہماک چاہتا ہے

ذرا سی گردِ ہوس دل پہ لازمی ہے فرازؔ
وہ عشق کیا ہے جو دامن کو پاک چاہتا ہے

○

جنتِ گوش بنی مجھ سے گنہگار کی بات
آ گئی تھی مرے لب پر میرے دلدار کی بات

وہ نہیں ہے تو یونہی دل کو دُکھانے کے لئے
چھیڑ دی ہم نے کسی یارِ دل آزار کی بات

اُس ستمگر کو سبھی لوگ بُرا کہتے ہیں
کوئی سنتا ہی نہیں ہے مرے غم خوار کی بات

خود کو بیچیں تو کہاں ہم کہ دل و جاں کی جگہ
ہر خریدار کرے درہم و دینار کی بات

صوفیِ شہر بھی پردے میں تصّوف کے سہی
چھیڑ دیتا ہے اُسی یارِ طرحدار کی بات

کل ہوئی حضرتِ ناصح سے ملاقات فرازؔ
پھر وہی پندو نصیحت وہی بیکار کی بات

○

روگ ایسے بھی غمِ یار سے لگ جاتے ہیں
در سے اُٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں

عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں

پہلے پہلے ہوس اک آدھ دکاں کھولتی ہے
پھر تو بازار کے بازار سے لگ جاتے ہیں

بے بسی بھی کبھی قربت کا سبب بنتی ہے
رو نہ پائیں تو گلے یار سے[1] لگ جاتے ہیں

کترنیں غم کی جو گلیوں میں اُڑی پھرتی ہیں
گھر میں لے آؤ تو انبار سے لگ جاتے ہیں

داغ دامن کے ہوں، دل کے ہوں کہ چہرے کے فرازؔ
کچھ نشاں عمر کی رفتار سے لگ جاتے ہیں

---

1 ضرورت اظہار

○
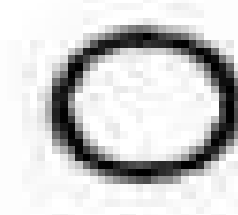
پیشِ جاناں سخن آشفتہ سری ہے، خاموش
تو جو گویا ہے تری بے خبری ہے خاموش

دل کو ایک فیصلہ کرنا ہے ترے بارے میں
اِس گھڑی جان ہتھیلی پہ دھری ہے، خاموش

اب کے شب گزری تو اک تیری مری بات نہیں
شہر کا شہر چراغِ سحری ہے خاموش

نالۂ نے، شررِ سنگ، سکوتِ صحرا
اپنی اپنی روشِ نوحہ گری ہے، خاموش

وہ قفس ہو کہ چمن، نالہ و نغمہ بے سود
جب تلک عالمِ بے بال و پری ہے خاموش

○
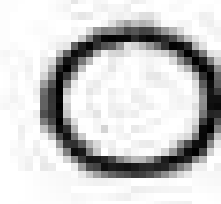
گفتگو اچھی لگی ذوقِ نظر اچھا لگا
مدتوں کے بعد کوئی ہمسفر اچھا لگا

دل کا دکھ جانا تو دل کا مسئلہ ہے پر ہمیں
اُس کا ہنس دینا ہمارے حال پر اچھا لگا

ہر طرح کی بے سرو سامانیوں کے باوجود
آج وہ آیا تو مجھ کو اپنا گھر اچھا لگا

باغباں گلچیں کو چاہے جو کہے ہم کو تو پھول
شاخ سے بڑھ کر کفِ دلدار پر اچھا لگا

کون مقتل میں نہ پہنچا کون ظالم تھا جسے
تیغِ قاتل سے زیادہ اپنا سر اچھا لگا

ہم بھی قائل ہیں وفا میں اُستواری کے مگر
کوئی پوچھے کون کس کو عمر بھر اچھا لگا

اپنی اپنی چاہتیں ہیں لوگ اب جو بھی کہیں
اک پری پیکر کو اک آشفتہ سر اچھا لگا

میرؔ کے مانند اکثر زیست کرتا تھا فرازؔ
تھا تو وہ دیوانہ سا شاعر مگر اچھا لگا

○
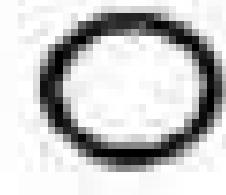
چل نکلتی ہیں غمِ یار سے باتیں کیا کیا
ہم نے بھی کیں در و دیوار سے باتیں کیا کیا

بات بن آئی ہے پھر سے کہ مرے بارے میں
اُس نے پوچھیں مرے غم خوار سے باتیں کیا کیا

لوگ لب بستہ اگر ہوں تو نکل آتی ہیں
چپ کے پیرایۂ اظہار سے باتیں کیا کیا

کسی سودائی کا قصہ کسی ہرجائی کی بات
لوگ لے آتے ہیں بازار سے باتیں کیا کیا

ہم نے بھی دست شناسی کے بہانے کی ہیں
ہاتھ میں ہاتھ لئے یار سے باتیں کیا کیا

کس کو بِکنا تھا مگر خوش ہیں کہ اِس حیلے سے
ہو گئیں اپنے خریدار سے باتیں کیا کیا

ہم ہیں خاموش کہ مجبورِ محبت تھے فرازؔ
ورنہ منسوب ہیں سرکار سے باتیں کیا کیا

رقص میں

کل شب ہوئی کسی سے ملاقات رقص میں
وہ کب تھی زندگی تھی مرے ساتھ رقص میں

اک دوسرے کو تھامے ہوئے بے سبب نہ تھے
محسوس کی ہے گردشِ حالات رقص میں

اُس کے بدن کی آنچ مرے دل تک آ گئی
آوارہ ہو رہے تھے مرے ہاتھ رقص میں

وہ ایڑیوں پہ مثلِ زمیں گھومتی رہی
سات آسماں تھے رقص کناں ساتھ رقص میں

کوئی نہیں تھا گوش بر آواز پھر بھی وہ
سرگوشیوں میں کرتی رہی بات رقص میں

یہ دل کہ اپنا سود و زیاں جانتا نہیں
آئے طرح طرح کے خیالات رقص میں

لمحوں کا التفات کہیں عارضی نہ ہو
میں کر رہا تھا خود سے سوالات رقص میں

موسیقیوں کی لے سے لہو موج موج تھا
وہ اس کے باوجود تھی محتاط رقص میں

پھر آ گئے کچھ اہلِ عبا بھی سبو بہ دست
کیا کیا دِکھا رہے تھے کرامات رقص میں

کچھ دیر بعد جیسے بہم ہو گئے تھے سب
اہلِ قبا و اہلِ خرابات رقص میں

آخر کو رقص گاہ میں ایسی پڑی دھمال
اک دوسرے سے چھوٹ گئے ہاتھ رقص میں

وہ کون تھی کہاں سے تھی آئی کدھر گئی
اتنا ہے یاد بیت گئی رات رقص میں

○
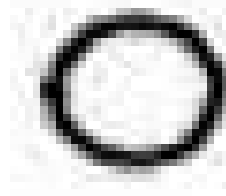
زباں پہ حرف سے پہلے ہی زخم آ جاتا
یہ حالِ دل تھا تو کیا حالِ دل کہا جاتا

میں حیرتی ہوں کہ سارا جہاں ہے سحرِ زدہ
جو دیکھتا تھا اسے دیکھتا چلا جاتا

وفا کا نام ہے ناکامئ محبت سے
وگرنہ کوئے ہوس تک یہ سلسلہ جاتا

اگر یہ زخم نہ بھرتا تو دل نہیں دکھتا
اگر یہ درد نہ تھمتا تو چین آ جاتا

کسی کے ہجر کو جی سے لگا لیا ہے عبث
یہ چند روز کا آزار تھا چلا جاتا

کیا ہے جس سے بھی اُس کی ستمگری کا گلہ
وہ اپنی درد بھری داستاں سنا جاتا

عجب ادا سے وہ گل پیرہن ہے محوِ خرام
فرازؔ دیکھ بہاروں کا قافلہ جاتا

○
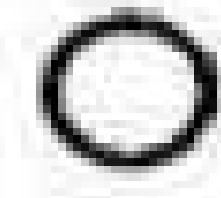
تجھ کو بھولے ہیں تو کچھ دوش زمانے کا نہ تھا
اب کے لگتا ہے کہ یہ دکھ ہی ٹھکانے کا نہ تھا

یہ جو مقتل سے بچا لائے سروں کو اپنے
ان میں اک شخص بھی کیا میرے گھرانے کا نہ تھا

ہر برس تازہ کِیا عہدِ محبت کو عبث
اب کُھلا کہ ہے یہ تہوار منانے کا نہ تھا

اب کے بے فصل بھی صحرا گل و گلزار سا ہے
ورنہ یہ ہجر کا موسم ترے آنے کا نہ تھا

دوش پر بارِ زمانہ بھی لئے پھرتے ہیں
مسئلہ صرف ترے ناز اٹھانے کا نہ تھا

یار! کیا کیا تری باتوں نے رُلایا ہے ہمیں
یہ تماشا سرِ محفل تو دِکھانے کا نہ تھا

کوئی کس منہ سے کرے تجھ سے شکایت جاناں
جس کو تُو بھول گیا یاد ہی آنے کا نہ تھا

آئے دن اک نئی آفت چلی آتی ہے فرازؔ
اب پشیماں ہیں کہ یہ شہر بسانے کا نہ تھا

○
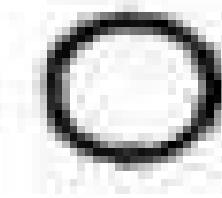
وہ قرب و ہجر کے سب روز و شب گذارے ہوئے
ہمارے شعر بنے یا سُخن تمہارے ہوئے

قمار خانۂ شہرِ وفا میں حوصلہ رکھ
یہاں تو جشن مناتے ہیں لوگ ہارے ہوئے

حرم تو خیر مگر بتکدے ہیں کیوں ویراں
تو کیا خدا کو صنم آشنا بھی پیارے ہوئے

جو اشک جذب ہوئے میری تیری آنکھوں میں
یہاں تو زخم بنے ہیں وہاں ستارے ہوئے

جو یادِ یار سے اب منہ چھپائے پھرتے ہیں
ہمی تو ہیں وہ غمِ زندگی کے مارے ہوئے

نگاہِ یار کو اب کس لئے تقاضا ہے
کہ ایک عمر ہوئی قرضِ جاں اُتارے ہوئے

فرازؔ خلوتِ جاں میں سکوت ہے کہ جو تھا
زمانے ہو گئے جیسے اُسے پکارے ہوئے

○
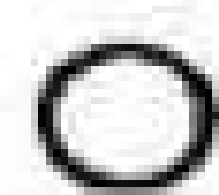
ہم تو خوش تھے کہ چلو دل کا جنوں کچھ کم ہے
اب جو آرام بہت ہے تو سکوں کچھ کم ہے

رنگِ گریہ نے دکھائی نہیں اگلی سی بہار
اب کے لگتا ہے کہ آمیزشِ خوں کچھ کم ہے

اب ترا ہجر مسلسل ہے تو یہ بھید کھُلا
غمِ دل سے غمِ دنیا کا فسوں کچھ کم ہے

اُس نے دکھ سارے زمانے کا مجھے بخش دیا
پھر بھی لالچ کا تقاضا ہے کہوں، کچھ کم ہے

راہِ دنیا سے نہیں، دل کی گزرگاہ سے آ
فاصلہ گرچہ زیادہ ہے پہ یوں کچھ کم ہے

تُو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو بھلے وقتوں میں
یہ خرابی کہ میں جس حال میں ہوں کچھ کم ہے

آگ ہی آگ مرے قریۂ تن میں ہے فرازؔ
پھر بھی لگتا ہے ابھی سوزِ دروں کچھ کم ہے

○
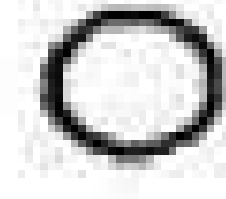
عمر بھر کا مان ٹُوٹا اور کیا
موڑ آیا ساتھ چُھوٹا اور کیا

کون سچ کہتا ہے سچ سنتا ہے کون
میں بھی جھوٹا تُو بھی جُھوٹا اور کیا

جان سے جانا ضروری تو نہیں
عاشقی میں سر تو پُھوٹا اور کیا

ہوتے ہوتے لعل پتھر ہو گئے
رفتہ رفتہ رنگ چُھوٹا اور کیا

رہ گیا تھا یاد کا رشتہ فقط
آخرش یہ پُل بھی ٹُوٹا اور کیا

اُس کی آنکھیں بھی کبھی سچ بولتیں
دل تو تھا جھوٹوں سا جھوٹا اور کیا

غیر تو تھے غیر، اپنے آپ کو
سب سے بڑھ کر ہم نے لُوٹا اور کیا

اس قدر کافی تھی یادِ کربلا
روئے دھوئے سینہ کوٹا اور کیا

آؤ دیکھو تو ذرا باغِ وفا
اب کوئی گل ہے نہ بوٹا اور کیا

فتنہ سامانی میں یکساں ہیں فراؔز
اپنا دل ہو یا کھوٹا اور کیا

○
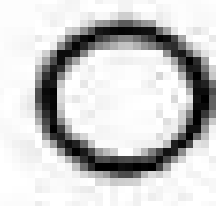
میری تنہائی میں مجھ سے گفتگو کرتا ہے کون
تُو نہیں ہوتا تو میری جستجو کرتا ہے کون

کس کا خنجر ہے جو کر دیتا ہے سینے کو دو نیم
پھر پشیمانی میں زخمِ دل رفو کرتا ہے کون

اِس خرابے میں بگولہ سی پھرے ہے کس کی یاد
اِس دیارِ رفتگاں میں ہاؤ ہو کرتا ہے کون

خوف کس کا ہے کہ اپنے آپ سے چھپتا پھروں
ناگہاں پھر مجھ کو میرے روبرو کرتا ہے کون

کونسا موسم چُرا لیتا ہے غنچوں کی چٹک
نغمہ پیراؤں کو سُرمہ در گُلو کرتا ہے کون

کون پی جاتا ہے آخر مرے حصے کی شراب
میں نہیں ہوتا تو پھر خالی سبو کرتا ہے کون

○
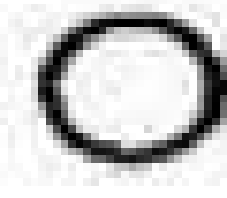
جل جانے کی حسرت بھی ہو پانی میں بھی رہنا
کچھ سہل نہیں عہدِ جوانی میں بھی رہنا

یہ کیا کہ رہے تازہ رفاقت کی للک بھی
اور محو کسی یاد پرانی میں بھی رہنا

کردار ہی ایسا تھا کہ اے صاحبِ تمثیل
اچھا نہ لگا ہم کو کہانی میں بھی رہنا

اے دل ترے قاتل بھی ہمی اور ہمی کو
ہر وقت تری مرثیہ خوانی میں بھی رہنا

دیکھو تو کوئی اُس کو کہ جوں موج میں دریا
ہر اک سے لگاوٹ بھی روانی میں بھی رہنا

کچھ مرحمتِ عشق ہے کچھ تربیتِ فن
الفاظ کی سج دھج کا معانی میں بھی رہنا

بیکار الجھتے ہو فرازؔ اہلِ جہاں سے
شکوہ بھی نہنگوں سے ہے، پانی میں بھی رہنا

○
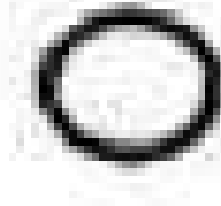
جس طرف جائیں زمانہ روبرو آ جائے ہے
اے خیالِ یار اگر ایسے میں تو آ جائے ہے

پھر کوئی چارہ گروں کے ناز اٹھائے کس لئے
وحشیوں کو بھی اگر کارِ رفو آ جائے ہے

پھر کہاں دنیا جہاں کے تذکرے اک بار اگر
ذکر تیرا درمیانِ گفتگو آ جائے ہے

ہم تہی دستوں کی پھر دریا دلی بھی دیکھیو
دستِ مستاں میں اگر دستِ سبو آ جائے ہے

مدتوں کی تشنگی کے بعد اک صہبا کا گھونٹ
جس طرح صحرا میں کوئی آبجو آ جائے ہے

اے مصور، حسنِ جاناں نقشِ جاناں میں کہاں
کب تری تصویر میں وہ ہو بہو آ جائے ہے

کثرتِ گریہ نے آخر رنگ دکھلانا تو تھا
اب بجائے اشک آنکھوں میں لہو آ جائے ہے

تری بیتیں، تیری باتیں، کیا کہیں کیا ہیں فرازؔ
بزم سج جاتی ہے جس محفل میں تُو آ جائے ہے

○
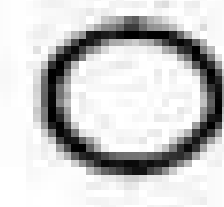
کسی کا در نہ کوئی آستانہ آگے تھا
اُس آشنا کا تو دل میں ٹھکانہ آگے تھا

میں خوش نشیں تھا کہ دو گام ہی تو جانا ہے
میں دیکھتا ہوں تو کوسوں زمانہ آگے تھا

کہانیاں بھی انہیں سانحوں سے بنتی ہیں
جو رنج جھیل رہا ہوں، فسانہ آگے تھا

سنا ہے اہلِ ہوس اب وفا کے گاہک ہیں
یہ کاروبار نہ ہم سے ہُوا نہ آگے تھا

مری غزل نے وہ شہرت ترے جمال کو دی
تری تلاش میں مجھ سے زمانہ آگے تھا

لہو کی لہر سے اب کوئی لے نہیں اٹھتی
یہ ہجر سازِ سُخن کا بہانہ آگے تھا

زمانوں بعد اُسے دیکھا تو آج سوچتے ہیں
مزاج اپنا ہی کچھ عاشقانہ آگے تھا

بزرگ کہتے ہیں اب جس جگہ یہ مسجد ہے
اِسی نواح میں ایک بادہ خانہ آگے تھا

بھٹک گیا کہ کہیں پا شکستہ بیٹھا ہے
جو زعمِ تیز روی میں روانہ آگے تھا

فرازؔ اب کہاں ملتے ہیں ہوش والے بھی
وگرنہ شہر میں کیا کیا دِوانہ آگے تھا

○
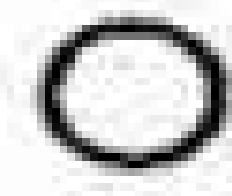
نہ شوقِ وصل نہ رنجِ فراق رکھتے ہیں
مگر یہ لوگ ترا اشتیاق رکھتے ہیں

یہ ہم جو تجھ پہ ہیں نازاں تو اِس سبب سے کہ ہم
زمانے والوں سے بہتر مذاق رکھتے ہیں

ہم اہلِ دل سے کوئی کیوں ملے کہ ہم سے فقیر
نہ عطر و عود نہ ساز و یراق رکھتے ہیں

جمالِ یار فقط چشم و لب کی بات نہیں
سو ہم خیالِ سیاق و سباق رکھتے ہیں

مثالِ شیشۂ خالی کتابِ عقل کو بھی
ہم اہلِ میکدہ بالائے طاق رکھتے ہیں

شیوخِ شہر سے کیا بحث جو گِرہ میں فقط
دو حرفِ عقد و سہ حرفِ طلاق رکھتے ہیں

فرازؔ خوش ہو کہ تجھ سے خفا ہیں فتوہ فروش
بھلے سے یہ بھی کہیں اتفاق رکھتے ہیں

○
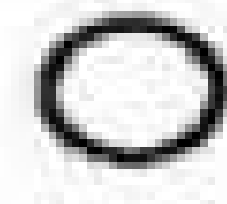
یہ فرمائش[1] غزل کی ہے کہ فن کی آزمائش ہے
چلو جو بھی ہے اک جانِ سخن کی آزمائش ہے

مبارک ہو بلاوا آ گیا مستوں کو مقتل سے
چل اے دل اب ترے دیوانہ پن کی آزمائش ہے

بہت سے ہاتھ ہیں دامانِ دل کو کھینچنے والے
جمالِ یار! تیرے بانکپن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ قصۂ یوسف زلیخا میں بجز اِس کے
کسی کے دل، کسی کے پیرہن کی آزمائش ہے

چلو دل امتحانِ عاشقی میں سرخرو ٹھہرا
مگر یہ عشق تو پورے بدن کی آزمائش ہے

1. ایک دوست کی فرمائش پر

جو ہیں منقار زیرِ پر کہاں محفوظ ہیں وہ بھی
ابھی تو خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

یہ سن کر میکدے میں آج سارا شہر اُمڈ آیا
کہ مے نوشی میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نہ وہ خسرو، نہ جوئے شیر شرطِ وصل شیریں ہے
تو کیوں کوہاٹ کے اک کوہکن کی آزمائش ہے

فرازؔ آیا نہیں لایا گیا اس کی قلمرو میں
کہاں غالبؔ کہاں اک بے وطن کی آزمائش ہے

○
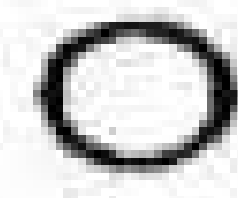
ترا قرب تھا کہ فراق تھا وہی تیری جلوہ گری رہی
کہ جو روشنی ترے جسم کی تھی مرے بدن میں بھری رہی

ترے شہر سے میں چلا تھا جب تو کوئی بھی ساتھ نہ تھا مرے
تو میں کس سے محوِ کلام تھا؟ تو یہ کس کی ہمسفری رہی؟

مجھے اپنے آپ پہ مان تھا کہ نہ جب تلک ترا دھیان تھا
تو مثال تھی مری آگہی تو کمال بے خبری رہی

مرے آشنا بھی عجیب تھے نہ رفیق تھے نہ رقیب تھے
مجھے جاں سے درد عزیز تھا انہیں فکرِ چارہ گری رہی

میں یہ جانتا تھا مرا ہنر ہے شکست و ریخت سے معتبر
جہاں لوگ سنگ بدست تھے وہیں میری شیشہ گری رہی

جہاں ناصحوں کا ہجوم تھا وہیں عاشقوں کی بھی دھوم تھی
جہاں بخیہ گر تھے گلی گلی وہیں رسمِ جامہ دری رہی

ترے پاس آ کے بھی جانے کیوں مری تشنگی میں ہراس تھا
بہ مثالِ چشمِ غزال جو لبِ آبجو بھی ڈری رہی

جو ہوس فروش تھے شہر کے سبھی مال بیچ کے جا چکے
مگر ایک جنسِ وفا مری سرِ رَہ دھری کی دھری رہی

مرے ناقدوں نے فراؔز جب مرا حرف حرف پرکھ لیا
تو کہا کہ عہدِ ریا میں بھی جو کھری تھی بات کھری رہی

○

پروانہ وار شہر میں کیا کیا پھری ہَوا
آخر چراغِ کشتہ پہ میرے گری ہَوا

اب سر بکف ہجوم جو دل دادگاں کا ہے
مقتل میں باندھ رکھی تھی ہم نے تری ہَوا

جیسے کوئی حباب رواں موجِ آب پر
پندارِ زندگی کا بھرم ہے نری ہَوا

روشن نہیں رہی کوئی شمعِ خیال تک
پھر کس کو ڈھونڈتی ہے یہاں سر پھری ہَوا

حیران تھی کہ کتنے چراغوں کا خوں پیے
آخر کو روشنی کے بھنور میں گھری ہَوا

صبحِ خزاں کی آخری یلغار ہے فرازؔ
اک دل گرفتہ پھول ہے اور دوسری ہَوا

○

بیٹھے تھے لوگ پہلو بہ پہلو پیے ہوئے
اک ہم تھے تیری بزم میں آنسو پیے ہوئے

دیکھا جسے بھی اُس کی محبت میں مست تھا
جیسے تمام شہر ہو دارو پیے ہوئے

تکرار بے سبب تو نہ تھی رند و شیخ میں
کرتے بھی کیا شراب تھے ہر دو پیے ہوئے

پھر کیا عجب کہ لوگ بنا لیں کہانیاں
کچھ میں نشے میں چُور تھا کچھ تُو پیے ہوئے

یوں اُن لبوں کے مَس سے معطر ہوں جس طرح
وہ نوبہارِ ناز تھا خوشبو پیے ہوئے

یوں ہو اگر فرازؔ تو تصویر کیا بنے
اک شام، اُس کے ساتھ، لب جُو، پیے ہوئے

○
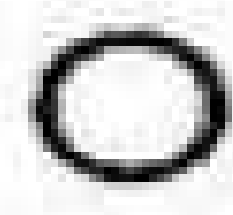
کون اب قصۂ چشم و لب و ابرو میں پڑے
بارے آرام سے ہیں اپنے ہی پہلو میں پڑے

عشق نے حسن کے معیار بدل ڈالے ہیں
یار ابھی تک ہیں اُسی قامت و گیسو میں پڑے

دیکھ اے صاحبِ انصاف، عدالت اپنی
ہم بھی قاتل کے مقابل ہیں ترازو میں پڑے

خود کو لے آئے تھے ہنگامۂ دنیا سے الگ
اب پریشاں ہیں کسی گوشۂ یکسو میں پڑے

ہم بھی اک شعلہ شمائل کو لئے ساتھ چلیں
اب کے گر برف کہستانِ سکردو میں پڑے

ہر طرف ایک صنم خانۂ حیرت ہے فرازؔ
تم ابھی تک ہو اُسی شخص کے جادو میں پڑے

نامعلوم مسافت

نہ یہ کہ میں تری یادوں سے ہو گیا غافل
نہیں کہ میرا تساہل یہ شاعرانہ ہے

مری طویل خموشی پہ تُو قیاس نہ کر
کہ تجھ سے ترکِ تعلق کا شاخسانہ ہے

نہ راستے ہیں نہ منزل نہ قافلے نہ جرس
کہ جس طرح سے ہر اک خواب میں روانہ ہے

عجب دیارِ خموشاں ہے جس طرف دیکھو
نہ حرفِ دل ہے نہ سازِ سخن بہانہ ہے

نہ فرش و بام نہ دیوار و در نہ طاق و چراغ
یہ بود و باش بھی گویا مسافرانہ ہے

میں کس طرح سے رکھوں تجھ سے رابطہ کہ یہاں
نہ کوئی گھر ہے، نہ ہوٹل، نہ ڈاکخانہ ہے

○
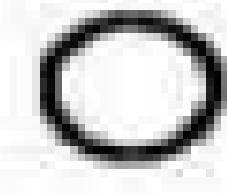
بے رُخی تُو نے بھی کی، عذرِ زمانہ کر کے
ہم بھی محفل سے اٹھ آئے ہیں بہانہ کر کے

کتنی باتیں کہ نہ کہنا تھیں وہ کہہ بھیجی ہیں
اب پشیمان ہیں قاصد کو روانہ کر کے

جانتے ہیں وہ تنک خو ہے، سو اپنا احوال
ہم سنا دیتے ہیں اوروں کا فسانہ کر کے

کیا کہیں کیا ہے اُن آنکھوں میں کہ رکھ دیتی ہیں
ایک اچھے بھلے انساں کو دِوانہ کر کے

کوئی ویرانۂ ہستی کی خبر کیا لاتا
خود بھی ہم بھول گئے دفن خزانہ کر کے

آنکھ مصروفِ نظارہ تھی تو ہم خوش تھے فرازؔ
اُس نے کیا ظلم کِیا دل میں ٹھکانہ کر کے

○
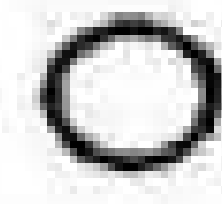
یوں تو میخانے میں مے کم ہے نہ پانی کم ہے
پھر بھی کچھ کشتیِ صہبا میں روانی کم ہے

سچ تو یہ ہے کہ زمانہ جو کہے پھرتا ہے
اس میں کچھ رنگ زیادہ ہے کہانی کم ہے

آؤ ہم خود ہی درِ یار سے ہو آتے ہیں
یہ جو پیغام ہے قاصد کی زبانی کم ہے

تم بضد ہو تو چلو ترکِ ملاقات سہی
ویسے اِس دل نے مری بات تو مانی کم ہے

یاد رکھنے کو تو اے دوست بہت حیلے تھے
اک ترا زخمِ جدائی تو نشانی کم ہے

دفترِ شوق مرتب ہو تو کیسے ہو فرازؔ
دل نے ہر بار کہا، ایک کہانی کم ہے

○
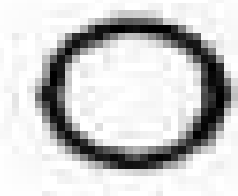
ذکرِ جاناں سے ہی میری غزل آراستہ ہے
ورنہ میں کون مرا شعر سے کیا واسطہ ہے

کیا بساط اپنی کہ اُس عربدہ خو کے آگے
آسماں سا بھی ستمگر سپر انداختہ ہے

اس کے ہاتھوں میں ہے میزانِ عدالت لرزاں
جیسے خود صاحبِ انصاف سزا یافتہ ہے

رہروِ دشتِ طلب کو تو ہے چلتے جانا
اِس سفر میں کوئی منزل نہ کوئی راستہ ہے

ایسا نیرنگِ زمانہ بھی ہمیں دیکھنا تھا
قاتلِ خلق کے پرچم پہ بنی فاختہ ہے

کیا سکھائیں گے ہمیں جامعِ ازہر کے خطیب
اپنا دل نجدِ محبت کا سند یافتہ ہے

کون لایا ہے تجھے کوئے ملامت میں فرازؔ
تُو تو پہلے ہی تہی کیسہ و دل باختہ ہے

○
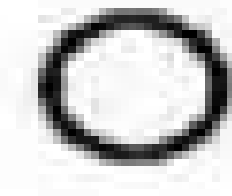
لب کشا لوگ ہیں، سرکار کو کیا بولنا ہے
اب لہو بولے گا تلوار کو کیا بولنا ہے

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو
ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

لو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے
مجھ کو معلوم ہے کس یار کو کیا بولنا ہے

اور کچھ دیر رہے گوش بر آواز ہوا
پھر چراغِ سرِ دیوار کو کیا بولنا ہے

مجھ سے کیا پوچھتے ہو آخری خواہش میری
اک گنہگارِ سرِ دار کو کیا بولنا ہے

خلقتِ شہر ہے چُپ، شاہ کے فرمان کے بعد
اب کسی واقفِ اسرار کو کیا بولنا ہے

وہی جانے پسِ پردہ جو تماشا گر ہے
کب، کہاں، کون سے کردار کو کیا بولنا ہے

جہاں دربار ہوں شاہوں کے مصاحب ہوں فرازؔ
وہاں غالبؔ کے طرفدار کو کیا بولنا ہے

○
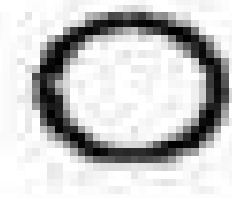
وہ یار کسی شام، خرابات میں آئے
یوں ہو تو مزہ میل ملاقات میں آئے

مت پوچھ کہ ہم کون ہیں یہ دیکھ کہ اے دوست
آئے ہیں تو کس طرح کے حالات میں آئے

کچھ اور مِلا میرا لہو اپنی حنا میں
تا اور بھی اعجاز ترے ہاتھ میں آئے

اب ذکرِ زمانہ ہے تو ناراض نہ ہونا
گر نام تمہارا بھی کسی بات میں آئے

اچھا ہے تنوّع ترے اندازِ ستم میں
کچھ رنگِ مروّت بھی اگر ساتھ میں آئے

اک عمر سے جیسے نہ جُنوں ہے نہ سکوں ہے
یارب کوئی گردش مرے حالات میں آئے

یہ سال بھی اچھا تھا کہ یاروں کی طرف سے
کچھ اب کے نئے زخم بھی سوغات میں آئے

ہم ایسے فقیروں سے محبت سے ملا کر
تا اور بلندی ترے درجات میں آئے

ساتھ اُس کے فرازؔ ایسے بھی دن رات گزارے
اب جن کا مزہ صرف حکایات میں آئے

○
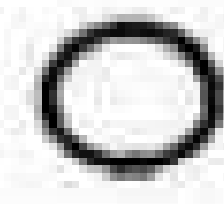
یہ تیری قلمرو ہے بتا پیرِ خرابات
غالب سا بھی دیکھا ہے کوئی میرِ خرابات

وہ رندِ بلا نوش و تہی دست و سدا مست
آزاد مگر بستۂ زنجیرِ خرابات

اشعار کہ جیسے ہو صنم خانۂ آذر
الفاظ کہ جیسے ہوں تصاویرِ خرابات

وہ نغمہ سرا ہو تو کریں وجد ملائک
یہ قلقلِ مینا ہے کہ تکبیرِ خرابات

اے شیخ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو نہیں ہے
تعمیرِ خرابات ہے تعمیرِ خرابات

ہم رند رہے مجلسِ واعظ کی بھی رونق
جوں حجلۂ صوفی میں تصاویرِ خرابات

کس شوخ نے لکھا ہے یہ دیوارِ حرم پر
زمزم میں کہاں نشۂ تاثیرِ خرابات

میخانہ کسی شاہ کا دربار نہیں ہے
ساقی کے تصرف میں ہے زنجیرِ خرابات

سعدیؔ ہو کہ حافظؔ ہو کہ خیامؔ کہ ہم ہوں
یہ لوگ تو ہیں جانِ اساطیرِ خرابات

ہیں ساغر و مینا کی طرح دل بھی شکستہ
ملاّ ہو جہاں کاتبِ تقدیرِ خرابات

انسان کہ انساں کا لہو پینے لگا ہے
اے چارہ گرو پھر کوئی تدبیرِ خرابات

میخانہ پنہ گاہ تھی ہم دل زدگاں کی
پر اب کہاں جائے کوئی دلگیرِ خرابات

کب سے حرم و دیر ہیں بے نور، خدارا
لے آؤ کہیں سے کوئی تنویرِ خرابات

سرشار تو ہو جاتے ہیں سرکش نہیں ہوتے
ساقی کی نگاہیں ہیں عناں گیرِ خرابات

گر حور و مے و نغمہ سے جنّت ہے عبارت
دنیا میں یہی خواب ہے تعبیرِ خرابات

اے مفتیِ بد کیش نہ کر فتویٰ فروشی
کیا تُو بھی نہیں لائقِ تعزیرِ خرابات

میخوار کہ واعظ یہاں گردن زدنی ہے؟
کچھ تُو ہی بتا صاحبِ تفسیرِ خرابات

"ویراں شود آں شہر کہ میخانہ نہ دارد"
اب جائیں کہاں ڈھونڈھنے اکسیرِ خرابات

○
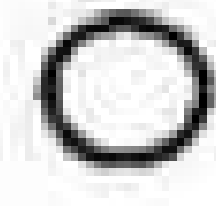
اُس کے ہمراہ چلے ہم تو فضا اور لگی
راستے اور لگے لغزشِ پا اور لگی

سَرو پر پیرہنِ گُل بھی سجے خوب مگر
یار کے قامتِ زیبا پہ قبا اور لگی

کم تو پہلے بھی نہیں تھا وہ دل آزاری میں
اُس پہ ظالم کو زمانے کی ہَوا اور لگی

پوچھتے پھرتے ہیں اب ترکِ تعلق کا علاج
خوش ہو اے دل کہ تجھے ایک بلا اور لگی

مہرباں یوں تو سدا کے تھے زمانے والے
لیکن اب کے روشِ خلقِ خدا اور لگی

کوچ کر جاتا ہے اک دوست ہر آوازے پر
گوشِ شنوا ہے تو سُن ایک صدا اور لگی

ہر نیا عشق نیا ذائقہ رکھتا ہے فراز
آج کل پھر تری غزلوں کی ادا اور لگی

○
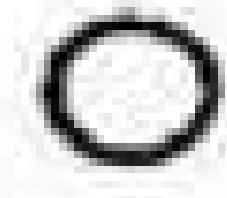
کون سرگرداں ہو صحراؤں کے بیچ
قیس خوش بیٹھا ہے لیلاؤں کے بیچ

دے رہا ہے کون تلواروں کو آب
خوں نظر آتا ہے دریاؤں کے بیچ

آ بسے ہیں شہر میں خانہ بدوش
ہے اداسی خیمہ زن گاؤں کے بیچ

دیکھ اپنے دل فگاروں کو کبھی
سر میں سودا بیڑیاں پاؤں کے بیچ

تیری قربت بھی نہیں دکھ سے تہی
دھوپ کے پیوند ہیں چھاؤں کے بیچ

حرفِ عیسیٰ بھی گیا عیسیٰ کے ساتھ
بس صلیبیں ہیں کلیساؤں کے بیچ

ایک ہیں سب قیسؔ و فرہادؔ و فرازؔ
کیا رکھا ہے عشق میں ناؤں کے بیچ

نذرِ قرۃ العین طاہرہ

تجھ پہ اگر نظر پڑے تُو جو کبھی ہو رُو برو
دل کے معاملے کروں تجھ سے بیان دو بدو

ہے تیرے غم میں جانِ جاں آنکھوں سے خونِ دل رواں
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جُو بہ جُو

بس مجھے جستجو تری مثلِ صبا لئے پھری
شہر بہ شہر در بدر قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو

قوسِ لب و خمِ دَہن، رُخ پہ دو زلفِ پُر شکن
غنچہ بہ غنچہ گُل بہ گُل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

دامِ خیالِ یار کے ایسے اسیر ہم ہوئے
طبع بہ طبع دل بہ دل مہر بہ مہر خو بہ خو

ہم نے لباس درد کا قالبِ جاں پہ سی لیا
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو

نقش کتابِ دل پہ تھا ثبت اُسی کا طاہرہ
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

شیشۂ ریختہ میں دیکھ لعبتِ فارسی فراز
خال بہ خال خد بہ خد نکتہ بہ نکتہ ہو بہ ہو

○

دیوانگی خرابِ بسیار ہی سہی
کوئی تو خندہ زن ہے چلو یار ہی سہی

وہ دیکھنے تو آئے بہانہ کوئی بھی ہو
عذرِ مزاج پرسیِ بیمار ہی سہی

رشتہ کوئی تو اُس سے تعلق کا چاہیے
جلوہ نہیں تو حسرتِ دیدار ہی سہی

اہلِ وفا کے باب میں اتنی ہوس نہ رکھ
اِس قحط زارِ عشق میں دو چار ہی سہی

خوش ہوں کہ ذکرِ یار میں گزرا تمام وقت
ناصح سے بحث ہی سہی تکرار ہی سہی

شامِ اسیری و شبِ غربت تو ہو چکی
اک جاں کی بات ہے تو لبِ دار ہی سہی

ہوتی ہے اب بھی گاہے بگاہے کوئی غزل
ہم زندگی سے برسرِ پیکار ہی سہی

اک چارہ گر ہے اور ٹھکانے کا ہے فراز
دنیا ہمارے درپئے آزار ہی سہی

○
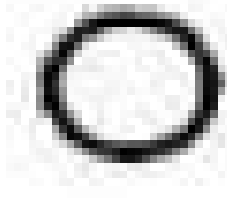
اگرچہ زور ہواؤں نے ڈال رکھا ہے
مگر چراغ نے لَو کو سنبھال رکھا ہے

محبتوں میں تو ملنا ہے یا اُجڑ جانا
مزاجِ عشق میں کب اعتدال رکھا ہے

ہَوا میں نشہ ہی نشہ فضا میں رنگ ہی رنگ
یہ کس نے پیرہن اپنا اچھال رکھا ہے

بھلے دنوں کا بھروسا ہی کیا رہیں نہ رہیں
سو میں نے رشتۂ غم کو بحال رکھا ہے

ہم ایسے سادہ دِلوں کو وہ دوست ہو کہ خدا
سبھی نے وعدۂ فردا پہ ٹال رکھا ہے

حسابِ لطفِ حریفاں کیا ہے جب تو کُھلا
کہ دوستوں نے زیادہ خیال رکھا ہے

بھری بہار میں اک شاخ پر کھلا ہے گلاب
کہ جیسے تو نے ہتھیلی پہ گال رکھا ہے

فرازؔ عشق کی دنیا تو خوبصورت تھی
یہ کس نے فتنۂ ہجر و وصال رکھا ہے

○

منزلِ دوست ہے کیا کون و مکاں سے آگے؟
جس سے پوچھو وہی کہتا ہے، یہاں سے آگے

اہلِ دل کرتے رہے اہلِ ہوس سے بحثیں
بات بڑھتی ہی نہیں سود و زیاں سے آگے

اب جو دیکھا تو کئی آبلہ پا بیٹھے ہیں
ہم کہ پیچھے تھے بہت ہمسفراں سے آگے

ہم نے اُس حد سے کِیا اپنے سفر کا آغاز
پر فرشتوں کے بھی جلتے ہیں جہاں سے آگے

کیسے بتلائیں کہ نیرنگِ زمانہ کیا ہے
کس کو دنیا نظر آتی ہے یہاں سے آگے

نہیں ایسا بھی کہ جب چاہا غزل کہہ ڈالی
شعر کی بات ہے کچھ طبعِ رواں سے آگے

اپنے حصّے کی پلا دیتے ہیں اوروں کو فرازؔ
کب یہ دستور تھا ہم تشنہ لباں سے آگے

○
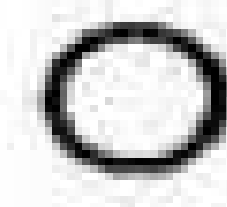
کہانیاں نہ سنو آس پاس لوگوں کی
کہ میرا شہر ہے بستی اداس لوگوں کی

نہ کوئی سمت نہ منزل سو قافلہ کیسا
رواں ہے بھیڑ فقط بے قیاس لوگوں کی

کسی سے پوچھ ہی لیتے وفا کے باب میں ہم
کمی نہیں تھی زمانہ شناس لوگوں کی

محبتوں کا سفر ختم تو نہیں ہوتا
بجا کہ دوستی آئی نہ راس لوگوں کی

ہمیں بھی اپنے کئی دوست یاد آتے ہیں
کبھی جو بات چلے ناسپاس لوگوں کی

کرو نہ اپنی بلا نوشیوں کے یوں چرچے
کہ اِس سے اور بھڑکتی ہے پیاس لوگوں کی

میں آنے والے زمانوں سے ڈر رہا ہوں فرازؔ
کہ میں نے دیکھی ہیں آنکھیں اداس لوگوں کی

○
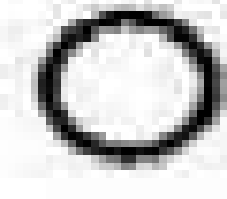
ایسا ہے کہ سب خواب مسلسل نہیں ہوتے
جو آج تو ہوتے ہیں مگر کل نہیں ہوتے

اندر کی فضاؤں کے کرشمے بھی عجب ہیں
مینہ ٹوٹ کے برسے بھی تو بادل نہیں ہوتے

کچھ مشکلیں ایسی ہیں کہ آساں نہیں ہوتیں
کچھ ایسے معمے ہیں کبھی حل نہیں ہوتے

شائستگیِ غم کے سبب آنکھوں کے صحرا
نمناک تو ہو جاتے ہیں جل تھل نہیں ہوتے

کیسے ہی تلاطم ہوں مگر قلزمِ جاں میں
کچھ یاد جزیرے ہیں کہ اوجھل نہیں ہوتے

عشاق کے مانند کئی اہلِ ہوس بھی
پاگل تو نظر آتے ہیں پاگل نہیں ہوتے

سب خواہشیں پوری ہوں فرازؔ ایسا نہیں ہے
جیسے کئی اشعار مکمل نہیں ہوتے

○

آخر اس عشق کا آزار تو کم ہونا تھا
شام تک سایۂ دیوار تو کم ہونا تھا

دوستو غم نہ کرو میرا کہ جس مقتل سے
تم گزر آئے ہو اک یار تو کم ہونا تھا

سر کشیدوں کا کوئی تذکرہ ہو گا ورنہ
ذکر اپنا سرِ دربار تو کم ہونا تھا

محفلِ غیر نہ ہوتی تو روش سے تیری
دِل بھی دُکھتا مگر آزار تو کم ہونا تھا

ہم نے کب چاہا کہ آئینۂ دل ہو صیقل
پر تری دید سے زنگار تو کم ہونا تھا

دل کی سازش تھی کہ بے دید ہوئی ہیں آنکھیں
اک نہ اک میرا طرفدار تو کم ہونا تھا

○
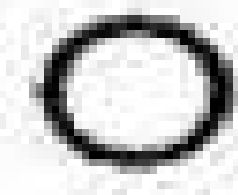
آب و دانہ قفس میں رکھا ہے
یوں مجھے پیش و پس میں رکھا ہے

اک شرارہ سا، دل کہیں جس کو
جسم کے خار و خس میں رکھا ہے

عشق بھی چاہتا ہے وصلِ حبیب
کچھ نہ کچھ تو ہوس میں رکھا ہے

کون کرتا ہے کوچ بستی سے؟
دل کسی کا جرس میں رکھا ہے

صید و صیاد کب یہ جانتے ہیں
کس نے کس کو قفس میں رکھا ہے

○
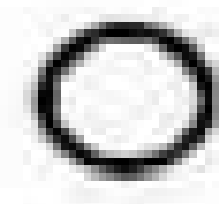
نبھاتا کون ہے قول و قسم تم جانتے تھے
یہ قُربت عارضی ہے کم سے کم تم جانتے تھے

رہا ہے کون کس کے ساتھ انجامِ سفر تک
یہ آغازِ مسافت ہی سے ہم تم جانتے تھے

مزاجوں میں اتر جاتی ہے تبدیلی مری جاں
سو رہ سکتے تھے کیسے ہم بہم تم جانتے تھے

سو اب کیوں ہر کس و ناکس سے یہ شکوہ شکایت
یہ سب سود و زیاں یہ بیش و کم تم جانتے تھے

فرازؔ اس گمرہی پر کیا کسی کو دوش دینا
کہ راہِ عاشقی کے پیچ و خم تم جانتے تھے

○

یوں تجھے ڈھونڈنے نکلے کہ نہ آئے خود بھی
وہ مسافر کہ جو منزل تھے بجائے خود بھی

کتنے غم تھے کہ زمانے سے چھپا رکھے تھے
اس طرح سے کہ ہمیں یاد نہ آئے خود بھی

ایسا ظالم ہے کہ گر ذکر میں اُس کے کوئی ظلم
ہم سے رہ جائے تو وہ یاد دلائے خود بھی

لطف تو جب ہے تعلق کا کہ وہ سحر جمال
کبھی کھینچے کبھی کھنچتا چلا آئے خود بھی

ایسا ساقی ہو تو پھر دیکھئے رنگِ محفل
سب کو مدہوش کرے ہوش سے جائے خود بھی

یار سے ہم کو تغافل کا گلہ کیوں ہو کہ ہم
بارہا محفلِ جاناں سے اٹھ آئے خود بھی

○
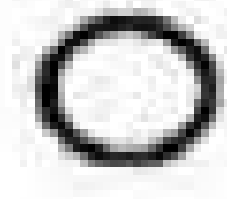
وہاں تو ہار قیامت بھی مان جاتی ہے
جہاں تلک ترے قد کی اُٹھان جاتی ہے

یہ عہدِ سنگ زنی ہے سو چپ ہیں آئنہ گر
کہ لب کشا ہوں تو سمجھو دکان جاتی ہے

یہ مہربان مشیّت بھی ایک ماں کی طرح
میں ضد کروں تو مری بات مان جاتی ہے

سو کیا کریں یہاں بسمل کہ بات قاتل کی
کوئی نہ مانے عدالت تو مان جاتی ہے

میں کس طرح سے گزاروں گا عمر بھر کا فراق
وہ دو گھڑی بھی جُدا ہو تو جان جاتی ہے

یہ نامراد محبت بھی قاتلوں کی طرح
ضرور چھوڑ کے کوئی نشان جاتی ہے

فرازؔ اجڑنے لگا ہے چمن محبت کا
جو رُت ہمیشہ رہی مہربان، جاتی ہے

○
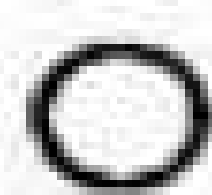
چھیڑ دیتا ہے یہ دل پھر سے پرانی کوئی بات
کوئی دکھ کوئی گلہ کوئی کہانی کوئی بات

ایک چُپ تھی کہ جو خوشبو کی طرح پھیلی تھی
صبحدم کہہ نہ سکی رات کی رانی کوئی بات

اہلِ گلشن کا تو شیوہ ہے کہ بدنام کریں
گل بھی سنتا کبھی بلبل کی زبانی کوئی بات

وہ ترا عہدِ وفا تھا کہ وفائے وعدہ
میں کہ پھر بھول گیا یاد دلانی کوئی بات

جانے کیوں اب کے پریشاں ہیں ترے خانہ بدوش
ورنہ ایسی بھی نہ تھی نقلِ مکانی کوئی بات

جس طرح ساری غزل میں کوئی عمدہ مصرع
جس طرح یاد میں رہ جائے نشانی کوئی بات

اہلِ دستار و قبا تُرش جبیں کیوں ہیں فرازؔ
کہہ گئی کیا مری آشفتہ بیانی کوئی بات؟

○

خبر تھی گھر سے وہ نکلا ہے مینہ برستے میں
تمام شہر لئے چھتریاں تھا رستے میں

بہار آئی تو اک شخص یاد آیا بہت
کہ جس کے ہونٹوں سے جھڑتے تھے پھول ہنستے میں

کہاں کے مکتب و مُلّا کہاں کے درس و نصاب
بس اک کتابِ محبت رہی ہے بستے میں

مِلا تھا ایک ہی گاہک تو ہم بھی کیا کرتے
سو خود کو بیچ دیا بے حساب سستے میں

یہ عمر بھر کی مسافت ہے، دل بڑا رکھنا
کہ لوگ ملتے بچھڑتے رہیں گے رستے میں

ہر ایک در خورِ رنگ و نمو نہیں ورنہ
گل و گیاہ سبھی تھے صبا کے رستے میں

ہے زہرِ عشق، خمارِ شراب ہے آگے
نشہ بڑھاتا گیا ہے یہ سانپ ڈستے میں

جو سب سے پہلے ہی رزمِ وفا میں کام آئے
فرازؔ ہم تھے انہیں عاشقوں کے دستے میں

○
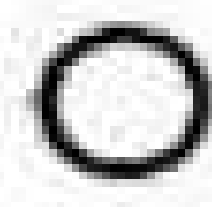
سب قرینے اُسی دلدار کے رکھ دیتے ہیں
ہم غزل میں بھی ہنر یار کے رکھ دیتے ہیں

شاید آ جائیں کبھی چشمِ خریدار میں ہم
جان و دل بیچ میں بازار کے رکھ دیتے ہیں

تاکہ طعنہ نہ ملے ہم کو تنک ظرفی کا
ہم قدح سامنے اغیار کے رکھ دیتے ہیں

اب کسے رنجِ اسیری کہ قفس میں صیاد
سارے منظر گُل و گلزار کے رکھ دیتے ہیں

ذکرِ جاناں میں یہ دنیا کو کہاں لے آئے
لوگ کیوں مسئلے بیکار کے رکھ دیتے ہیں

وقت وہ رنگ دکھاتا ہے کہ اہلِ دل بھی
طاقِ نسیاں پہ سخن یار کے رکھ دیتے ہیں

زندگی تیری امانت ہے مگر کیا کیجیے
لوگ یہ بوجھ بھی تھک ہار کے رکھ دیتے ہیں

ہم تو چاہت میں بھی غالبؔ کے مقلّد ہیں فرازؔ
جس پہ مرتے ہیں اُسے مار کے رکھ دیتے ہیں

○
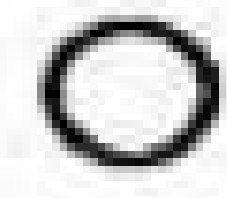
ایسے ویسے گمان کیسے پڑے
دل میں یہ وہم آن کیسے پڑے

آدمی کی زمیں سے دوستی تھی
بیچ میں آسمان کیسے پڑے

کیا کہیں درمیان دونوں کے
کون سے مہربان کیسے پڑے

تیری ہمسائیگی کے ارماں میں
رفتہ رفتہ مکان کیسے پڑے

بلبلیں قید تھیں تو پھولوں کے
دامنوں پر نشان کیسے پڑے

حشر برپا ہے شورِ خلقت سے
تیری آواز کان کیسے پڑے

لوگ حیراں ہیں شہر کے پیچھے
شہر کے پاسبان کیسے پڑے

خونِ دل خرچ ہو گیا ہے فرازؔ
بول شعروں میں جان کیسے پڑے

○
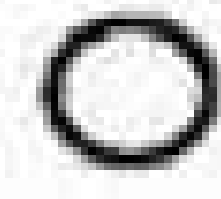
جورِ حبیب و پرسشِ اغیار ایک سے
گو زخم الگ الگ ہیں مگر وار ایک سے

ہر گھر میں اپنے اپنے بہار و خزاں کے رنگ
یوں دیکھنے میں ہیں در و دیوار ایک سے

بے اعتمادیوں کی فضا کارواں میں ہے
رہنا ہے دوسرے کو خبردار ایک سے

ہر بار زندگی نے نئے تجربے دیے
ہر چند اور لوگ تھے ہر بار ایک سے

اک ربطِ خاص ہم کو رقیبوں سے ہے کہ ہیں
دلدادگانِ عشق کو آزار ایک سے

اب بیش و کم کی بات نہ کر دوستوں کے بیچ
ہم کو سبھی نے زخم دیے یار ایک سے

جب دشمنی کی فصل ہو تب دوست بھی عدو
جب دوستی کے دن ہوں تو سب یار ایک سے

وہ میکشانِ شہر ہوں یا واعظانِ دیں
کردار الگ الگ ہیں اداکار ایک سے

ہیں خوش کہ روزِ حشر کچھ انصاف تو ملا
اچھا ہوا کہ سب ہیں گنہگار ایک سے

دلدارئ حبیب کہ آشوبِ دہر ہو
سب مرحلے فرازؔ ہیں دشوار ایک سے

○
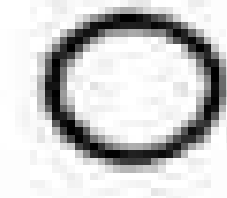
جب سجے محفلِ مے شام میں آ جائے کوئی
پینے بیٹھیں تو نظر جام میں آ جائے کوئی

یہ مقدر کے کرشمے ہیں کہ اکثر اوقات
ہو نگاہوں میں کوئی، دام میں آ جائے کوئی

مجھ سے ملنے نہیں دیتے مجھے دنیا والے
صبح رخصت ہو کوئی، شام میں آ جائے کوئی

اُس کا دھیان آئے تو گھر ایسے مہک جاتا ہے
جیسے دیوار و در و بام میں آ جائے کوئی

ہم تو اُس کو بھی سر آنکھوں پہ بٹھا لیتے ہیں
سوئے میخانہ جو احرام میں آ جائے کوئی

گرچہ امکاں تو بہت کم ہے مگر کیا معلوم
پھر کسی روز کسی شام میں آ جائے کوئی

جانے کب سے ہوں کسی خواب جزیرے میں فراز
کاش اِس قریۂ گمنام میں آ جائے کوئی

○
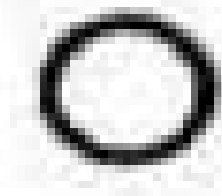
کوئی منزل تھی کہاں ترکِ طلب سے آگے
پھر بھی ہم ہیں کہ چلے جاتے ہیں سب سے آگے

اب کہاں جاں کے عوض جنسِ وفا ملتی ہے
یہ مگر شہر کا دستور تھا اب سے آگے

کون کہتا ہے نہیں چارۂ بیماریِ دل
ایک میخانہ بھی پڑتا ہے مطب سے آگے

"نہ بہ زورے نہ بہ زاری نہ بہ زر می آید"
بات بڑھتی ہی نہیں ہے کسی ڈھب سے آگے

تجھ کو اب کیسے بتائیں وہ ترا ہجر نہ تھا
ہم پریشاں تھے کسی اور سبب سے آگے

جب سے یہ سلسلۂ تیغ و گلو جاری ہے
اہلِ دل اہلِ زمانہ سے ہیں تب سے آگے

ہم کہ شائستۂ تہذیبِ محبت ہیں فرازؔ
ہم نے رکھا نہ قدم حدِ ادب سے آگے

○
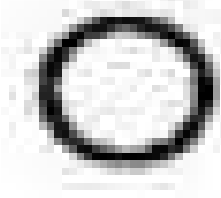
کوئی سخن برائے قوافی نہیں کہا
اک شعر بھی غزل میں اضافی نہیں کہا

ہم اہلِ صدق جرم پہ نادم نہیں رہے
مر مِٹ گئے پہ حرفِ معافی نہیں کہا

آشوبِ زندگی تھا کہ اندوہِ عاشقی
اک غم کو دوسرے کی تلافی نہیں کہا

ہم نے خیالِ یار میں کیا کیا غزل کہی
پھر بھی گماں یہی ہے کہ کافی نہیں کہا

بس یہ کہا تھا دل کی دوا ہے مغاں کے پاس
ہم نے شراب کو کبھی شافی نہیں کہا

پہلے تو دل کی بات نہ لائے زبان پر
پھر کوئی حرف دل کے منافی نہیں کہا

اُس بے وفا سے ہم نے شکایت نہ کی فرازؔ
عادت کو اُس کی وعدہ خلافی نہیں کہا

○
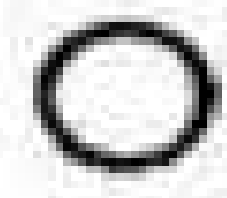
یونہی مل بیٹھنے کا کوئی بہانہ نکلے
بات سے بات فسانے سے فسانہ نکلے

پھر چلے ذکر کسی زخم کے چھل جانے کا
پھر کوئی درد کوئی خواب پرانا نکلے

پھر کوئی یاد کوئی ساز اُٹھا لے آئے
پھر کسی ساز کے پردے سے ترانہ نکلے

یہ بھی ممکن ہے کہ صحراؤں میں گم ہو جائیں
یہ بھی ممکن ہے خرابوں سے خزانہ نکلے

آؤ ڈھونڈھیں تو سہی اہلِ وفا کی بستی
کیا خبر پھر کوئی گم گشتہ ٹھکانہ نکلے

یار ایسی بھی نہ کر بات کہ دونوں رو دیں
یہ تعلق بھی فقط رسمِ زمانہ نکلے

یہ بھی ہے اب نہ اٹھے نغمۂ زنجیر فرازؔ
یہ بھی ہے ہم سا کوئی اور دِوانہ نکلے

○
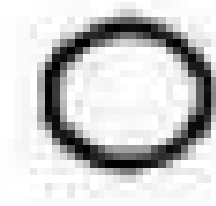
کفن بدوش کہیں سر بکف لئے پھری ہے
یہ زندگی مجھے کس کس طرف لئے پھری ہے

مری طلب اُسے جنگاہ میں بھی لے جاتی
مری تلاش اُسے صف بہ صف لئے پھری ہے

میں رزم گاہ میں ہوتا تو پاگلوں کی طرح
وہ خیمہ گاہ میں راتوں کو دف لئے پھری ہے

یہ سر زمین مرے خوں سے سرخرو نہ ہوئی
یہ خاک میرے لہو کا شرف لئے پھری ہے

سو بے نیاز رہے دوستوں سے ہم کہ یہ جاں
خود اپنا تیر خود اپنا ہدف لئے پھری ہے

فرازؔ درخورِ قاتل نہ تھے ہمی ورنہ
ہمیں بھی جوششِ خوں سر بکف لئے پھری ہے

○
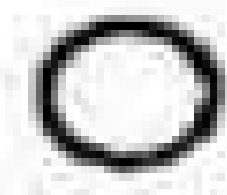
اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

یونہی بیکار میں کب تک کوئی بیٹھا رہتا
اس کو فرصت جو نہ تھی ہم نے بھی رخصت چاہی

شکوہ ناقدریِ دنیا کا کریں کیا کہ ہمیں
کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی

رات جب جمع تھے دکھ دل میں زمانے بھر کے
آنکھ جھپکا کے غمِ یار نے خلوت چاہی

ہم جو پامالِ زمانہ ہیں تو حیرت کیوں ہے
ہم نے آبا کے حوالے سے فضیلت چاہی

میں تو لے آیا وہی پیرہنِ چاک اپنا
اُس نے جب خلعت و دستار کی قیمت چاہی

حُسن کا اپنا ہی شیوہ تھا تعلق میں فرازؔ
عشق نے اپنے ہی انداز کی چاہت چاہی

○
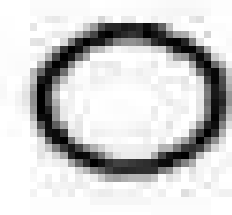
تُو کہ شمعِ شامِ فراق ہے دلِ نامراد سنبھل کے رو
یہ کسی کی بزمِ نشاط ہے یہاں قطرہ قطرہ پگھل کے رو

کوئی آشنا ہو کہ غیر ہو نہ کسی سے حال بیان کر
یہ کٹھور لوگوں کا شہر ہے کہیں دُور پار نکل کے رو

کِسے کیا پڑی سرِ انجمن کہ سُنے وہ تیری کہانیاں
جہاں کوئی تجھ سے بچھڑ گیا اُسی رہگزار پہ چل کے رو

یہاں اور بھی ہیں گرفتہ دل کبھی اپنے جیسوں سے جا کے مِل
ترے دکھ سے کم نہیں جن کے دکھ کبھی اُن کی آگ میں جل کے رو

ترے دوستوں کو خبر ہے سب تری بے کلی کا جو ہے سبب
تُو بھلے سے اُس کا نہ ذکر کر تُو ہزار نام بدل کے رو

غمِ ہجر لاکھ کڑا سہی پہ فرازؔ کچھ تو خیال رکھ
مری جاں یہ محفلِ شعر ہے تو نہ ساتھ ساتھ غزل کے رو

○
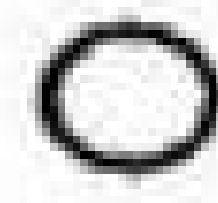
مہر و مہتاب بنا ہوں نہ ستارا ہُوا ہوں
میں زمیں پر ہوں کہ افلاک کا مارا ہُوا ہوں

قعرِ دریا میں ہیں موجوں سے جو پسپا نہ ہوئے
میں کنارے پہ جو بیٹھا ہوں تو ہارا ہُوا ہوں

میں تو ذرّہ تھا مگر اے مرے خورشید خرام
تُو مجھے روند گیا ہے تو ستارا ہُوا ہوں

تم نے ہر وار پہ مجھ سے ہی شکایت کی ہے
میں کہ ہر زخم پہ ممنون تمہارا ہُوا ہوں

عشق میں حسن کے انداز سما جاتے ہیں
میں بھی تیری طرح خودبین و خودآرا ہُوا ہوں

سفرِ ذات میں ایسا کبھی لگتا ہے فرازؔ
میں پیمبر کی طرح خود پہ اتارا ہُوا ہوں

○
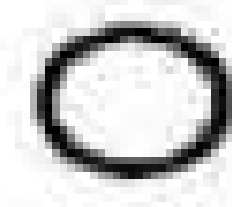
عاشقی میں میرؔ جیسے خواب مت دیکھا کرو
باؤلے ہو جاؤ گے مہتاب مت دیکھا کرو

جستہ جستہ پڑھ لیا کرنا مضامینِ وفا
پر کتابِ عشق کا ہر باب مت دیکھا کرو

اِس تماشے میں اُلٹ جاتی ہیں اکثر کشتیاں
ڈوبنے والوں کو زیرِ آب مت دیکھا کرو

میکدے میں کیا تکلف، میکشی میں کیا حجاب
بزمِ ساقی میں ادب آداب مت دیکھا کرو

ہم سے درویشوں کے گھر آؤ تو یاروں کی طرح
ہر جگہ خس خانہ و برفاب مت دیکھا کرو

مانگے تانگے کی قبائیں دیر تک رہتی نہیں
یار لوگوں کے لقب القاب مت دیکھا کرو

تشنگی میں لب بھگو لینا بھی کافی ہے فراز
جام میں صہبا ہے یا زہراب مت دیکھا کرو

○
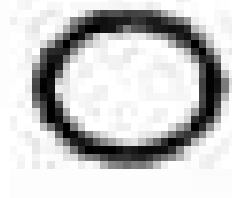
یہی بہت ہے کہ محفل میں ہم نشیں کوئی ہے
کہ شب ڈھلے تو سحر تک کوئی نہیں، کوئی ہے

نہ کوئی چاپ نہ سایہ کوئی نہ سرگوشی
مگر یہ دل کہ بضد ہے، نہیں نہیں کوئی ہے

ہر اک زبان پہ اپنے لہو کے ذائقے ہیں
نہ کوئی زہرِ ہلاہل نہ انگبیں کوئی ہے

بھلا لگا ہے ہمیں عاشقوں کا پہناوا
نہ کوئی جیب سلامت نہ آستیں کوئی ہے

دیارِ دل کا مسافر کہاں سے آیا ہے
خبر نہیں مگر اک شخص بہتریں کوئی ہے

یہ ہست و بود یہ بود و نبود وہم ہے سب
جہاں جہاں بھی کوئی تھا وہیں وہیں کوئی ہے

فرازؔ اتنی بھی ویراں نہیں مری دنیا
خزاں میں بھی گلِ خنداں کہیں کہیں کوئی ہے

○
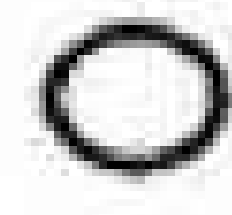
دوست بھی ملتے ہیں محفل بھی جمی رہتی ہے
تو نہیں ہوتا تو ہر شے میں کمی رہتی ہے

اب کے جانے کا نہیں موسمِ گریہ شائد
مسکرائیں بھی تو آنکھوں میں نمی رہتی ہے

عشق عمروں کی مسافت ہے کسے کیا معلوم
کب تلک ہم سفری ہم قدمی رہتی ہے

کچھ دِلوں میں کبھی کھلتے نہیں چاہت کے گلاب
کچھ جزیروں پہ سدا دھند جمی رہتی ہے

تم بھی پاگل ہو کہ اُس شخص پہ مرتے ہو فرازؔ
ایک دنیا کی نظر جس پہ جمی رہتی ہے

○
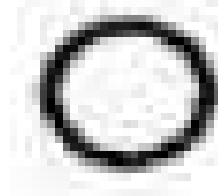
قیمت ہے ہر کسی کی دکاں پر لگی ہوئی
بِکنے کو ایک بھیڑ ہے باہر لگی ہوئی

غافل نہ جان اُسے کہ تغافل کے باوجود
اُس کی نظر ہے سب پہ برابر لگی ہوئی

خوش ہو نہ سر نوشتۂ مقتل کو دیکھ کر
فہرست ایک اور ہے اندر لگی ہوئی

ق

کس کا گماشتہ ہے امیرِ سپاہِ شہر
کن معرکوں میں ہے صفِ لشکر لگی ہوئی

برباد کر کے بصرہ و بغداد کا جمال
اب چشمِ بد ہے جانبِ خیبر لگی ہوئی

غیروں سے کیا گلہ ہو کہ اپنوں کے ہاتھ سے
ہے دوسروں کی آگ مرے گھر لگی ہوئی

لازم ہے مرغِ باد نما بھی اذان دے
کلغی تو آپ کے بھی ہے سر پر لگی ہوئی

میرے ہی قتل نامے پہ میرے ہی دستخط
میری ہی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

کس کے لبوں پہ نعرۂ منصور تھا فرازؔ
ہے چار سُو صدائے مکرّر لگی ہوئی

○
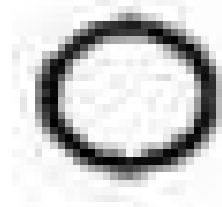
اجل سے خوف زدہ زیست سے ڈرے ہوئے لوگ
سو جی رہے ہیں مرے شہر میں مرے ہوئے لوگ

یہ بے دلی کسی آفت کا پیش خیمہ نہ ہو
کہ چشم بستہ ہیں زانو پہ سر دھرے ہوئے لوگ

نہ کوئی یاد نہ آنسو نہ پھول ہیں نہ چراغ
تو کیا دیارِ خموشاں سے بھی پرے ہوئے لوگ

ہوائے حرص سبھی کو اُڑائے پھرتی ہے
یہ گرد بادِ زمانہ یہ بھُس بھرے ہوئے لوگ

یہ دل سنبھلتا نہیں ہے وداعِ یار کے بعد
کہ جیسے سو نہ سکیں خواب میں ڈرے ہوئے لوگ

کچھ ایسا ظلم کا موسم ٹھہر گیا ہے فرازؔ
کسی بھی آب و ہوا میں نہ پھر ہرے ہوئے لوگ

○
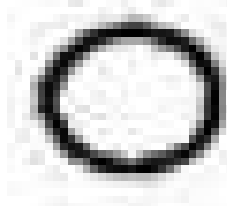
جب ہر اک شہر بلاؤں کا ٹھکانہ بن جائے
کیا خبر کون کہاں کس کا نشانہ بن جائے

عشق خود اپنے رقیبوں کو بہم کرتا ہے
ہم جسے پیار کریں جانِ زمانہ بن جائے

اتنی شدت سے نہ مِل تُو کہ جدائی چاہیں
اور یہ قربت تری دوری کا بہانہ بن جائے

جو غزل آج ترے ہجر میں لکھی ہے وہ کل
کیا خبر اہلِ محبت کا ترانہ بن جائے

کرتا رہتا ہوں فراہم میں زرِ زخم کہ یوں
شائد آئندہ زمانوں کا خزانہ بن جائے

اِس سے بڑھ کر کوئی انعامِ ہنر کیا ہے فرازؔ
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ بن جائے

○
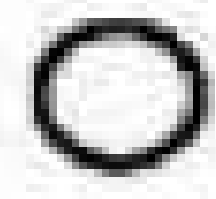
یونہی مرمر کے جئیں وقت گذارے جائیں
زندگی ہم ترے ہاتھوں سے نہ مارے جائیں

اب زمیں پر کوئی گوتم نہ محمدؐ نہ مسیح
آسمانوں سے نئے لوگ اُتارے جائیں

وہ جو موجود نہیں اُس کی مدد چاہتے ہیں
وہ جو سنتا ہی نہیں اُس کو پکارے جائیں

باپ لرزاں ہے کہ پہنچی نہیں بارات اب تک
اور ہم جولیاں دلہن کو سنوارے جائیں

ہم کہ نادان جواری ہیں سبھی جانتے ہیں
دل کی بازی ہو تو جی جان سے ہارے جائیں

تج دیا تم نے درِ یار بھی اُکتا کے فرازؔ
اب کہاں ڈھونڈنے غمخوار تمہارے جائیں

○

باغباں ڈال رہا ہے گل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے اشعار پہ خاک

کیسے بے آبلہ پا بادیہ پیما ہیں کہ ہے
قطرۂ خوں کے بجائے سر ہر خار پہ خاک

سرِ دربار ستادہ ہیں پئے منصب و جاہ
تُف بر اہلِ سخن و خلعت و دستار پہ خاک

آ کے دیکھو تو سہی شہر مرا کیسا ہے
سبزہ و گل کی جگہ ہے در و دیوار پہ خاک

تا کسی پر نہ کھُلے اپنے جگر کا احوال
مَل کے آ جاتے ہیں ہم دیدۂ خونبار پہ خاک

بسکہ اک نانِ جویں رزقِ مشقت تھا فرازؔ
آ گیا ڈال کے میں درہم و دینار پہ خاک

○
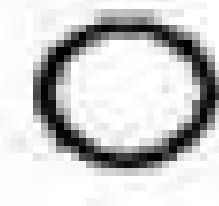
نامہ بروں کو کب تک ہم کوئے یار بھیجیں
وہ نامراد آئیں ہم بار بار بھیجیں

ہم کب سے منتظر ہیں اس موسمِ جنوں کے
جب زخم تہنیت کے یاروں کو یار بھیجیں

کیوں چشمِ شہریاراں ہے سوئے جاں فگاراں
کیا جامۂ دریدہ اُن کو اُتار بھیجیں؟

آؤ اور آ کے گن لو زخم اپنے دل زدوں کے
ہم کیا حساب رکھیں ہم کیا شمار بھیجیں

یارانِ مہرباں کو گر فکر ہے ہماری
یا پندگر نہ بھیجیں یا غمگسار بھیجیں

جب یار کا سندیسہ آئے تو بات بھی ہو
یوں تو ہزار نامے خوباں ہزار بھیجیں

سُن اے غزالِ رعنا اب دل یہ چاہتا ہے
ہر روز اک غزل ہم در مدحِ یار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے ہجراں کے موسموں میں
کچھ قربتوں کی یادیں ہم دُور پار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے اُن پھول سے لبوں کو
دستِ صبا پہ رکھ کر شبنم کے ہار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے اُس جانِ شاعری کو
کچھ شعر اپنے چُن کر اک شاہکار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے سب بھید چاہتوں کے
ہر مصلحت بُھلا کر بے اختیار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے پردے میں ہم سُخن کے
دیوانگی کی باتیں دیوانہ وار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے جب بے اثر ہو سب کچھ
تجھ کو بنا کے قاصد اے یادِ یار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے یا چُپ کا زہر پی لیں
یا دامن و گریباں ہم تار تار بھیجیں

دل جو بھی چاہتا ہو لیکن فرازؔ سوچو
ہم طوقِ آشنائی کیسے اُتار بھیجیں

○

ابرو باراں ہی نہ تھے بحر کی یورش میں شریک
دکھ تو یہ ہے کہ ہے ملاح بھی سازش میں شریک

تا ہمیں ترکِ تعلق کا بہت رنج نہ ہو
آؤ تم کو بھی کریں ہم اِسی کوشش میں شریک

اک تو وہ جسم طلسمات کا گھر لگتا ہے
اس پہ ہے نیّتِ خیاط بھی پوشش میں شریک

ساری خلقت چلی آتی ہے اُسے دیکھنے کو
کیا کرے دل بھی کہ دنیا ہے سفارش میں شریک

اتنا شرمندہ نہ کر اپنے گنہگاروں کو
اے خدا تو بھی رہا ہے مری خواہش میں شریک

لفظ کو پھول بنانا تو کرشمہ ہے فرازؔ
ہو نہ ہو کوئی تو ہے تیری نگارش میں شریک

○
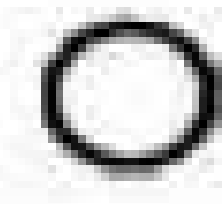
نشستہ مسندِ ساقی پہ اب ہیں آب فروش
ہوئے ہیں شہر بدر، شہر کے شراب فروش

کوئی بھی دیکھنا چاہے نہ اپنے چہرے کو
سو جتنے آئنہ گر تھے ہوئے نقاب فروش

کسی کے پاس نہ ظرفِ خرد نہ حرفِ جنوں
ہوئے ہیں عارف و سالک سبھی نصاب فروش

یہ کہہ کے اُڑ گئے باغوں سے عندلیب تمام
جو باغباں تھے کبھی اب ہوئے گلاب فروش

نہ کشتیاں ہیں نہ ملاح ہیں نہ دریا ہے
تمام ریگِ رواں اور سبھی سراب فروش

جو حرفِ دل کبھی خونِ جگر سے لکھتے تھے
وہ اہلِ درد بھی اب ہو گئے کتاب فروش

کوئی نہیں جو خبر لائے قعرِ دریا کی
یہ تاجرِ کفِ سیلاب وہ حباب فروش

جو کور چشم، کہن سال و شعبدہ گر تھے
وہی تو لوگ ہیں اب سرمہ و خضاب فروش

نہیں فرازؔ تو لوگوں کو یاد آتا ہے
وہ نغمہ سنج وہ خوش گفتگو وہ خواب فروش

○
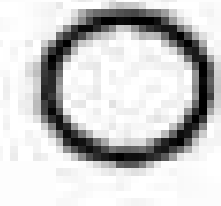
مسافت دل کی تھی سو جادۂ مشکل پسند آیا
ہمیں بھی مثلِ غالبؔ گفتۂ بیدلؔ پسند آیا

سمرقند و بخارا کیا ہیں خالِ یار کے آگے
سو ہم کو مصرعۂ حافظؔ بجان و دل پسند آیا

طبیعت کی کشاکش نے ہمیں آخر ڈبونا تھا
کبھی دریا لگا اچھا کبھی ساحل پسند آیا

متاعِ سوختہ دل سے لگائے پھرتا رہتا ہوں
کہ شہرِ آرزو جیسا بھی تھا حاصل پسند آیا

عجب رنگ آ گیا ہے دل کے خوں ہونے سے آنکھوں میں
ہمیں بھی اب کے گریہ میں لہو شامل پسند آیا

نہ تھا یوں بھی کہ جس کو دیکھتے ہم اُس کے ہو جاتے
کہ تُو بھی تو ہمیں جاناں بصد مشکل پسند آیا

فرازؔ اپنی ادا کا ایک دیوانہ ہے کیا کیجئے
اُسے سارے مسیحاؤں میں اک قاتل پسند آیا

○
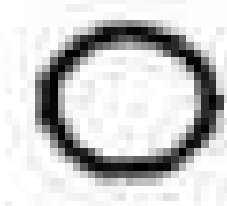
سبھی کہیں مرے غمخوار کے علاوہ بھی
کوئی تو بات کروں یار کے علاوہ بھی

بہت سے ایسے ستمگر تھے اب جو یاد نہیں
کسی حبیبِ دل آزار کے علاوہ بھی

یہ کیا کہ تم بھی سرِ راہ حال پوچھتے ہو
کبھی ملو ہمیں بازار کے علاوہ بھی

اجاڑ گھر میں یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے
کوئی تو ہے در و دیوار کے علاوہ بھی

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقین آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

کبھی فرازؔ سے آ کر ملو جو وقت ملے
یہ شخص خوب ہے اشعار کے علاوہ بھی

○
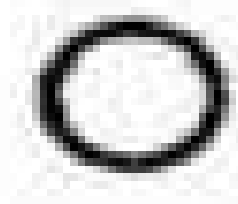
سنو ہواؤں کا نوحہ زبانِ صحرا
کہ گرگ زاد کریں اب شبانِ صحرا

سنو کہ پیاس ہر اک کی جدا جدا ٹھہری
سو بحر خاک کرے ترجمانِ صحرا

سنو کہ سب کا مقدر کہاں غمِ لیلیٰ
کسی کسی پہ رہی مہربانِ صحرا

سنو کہ دل کا اثاثہ بس ایک داغ تو ہے
کہ جیسے خانۂ مجنوں نشانِ صحرا

سنو کہ اب کوئی بانگِ جرس نہ نالۂ نے
عیاں تو سب پہ ہے سوزِ نہانِ صحرا

سنو کہ آبلہ پا اب کہاں سے آئیں گے
ہمارے ساتھ گئی گُل فشانیِ صحرا

سنو کہ جب کوئی آئینِ گلستاں ہی نہیں
تو کوئی کیسے کرے باغبانیِ صحرا

○
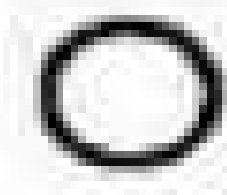
کہا تھا کس نے کہ وحشت میں چھانیے صحرا
کڑی ہے دھوپ تو اب سر پہ تانیے صحرا

بس اک ذرا سے اُجڑنے پہ زعم کتنا ہے
یہ دل بضد ہے کہ اب اس کو مانیے صحرا

کسی کی آبلہ پائی عنایتِ رہِ دوست
کسی کی چاک قبائی نشانیِ صحرا

یہ زندگی کہ خیاباں بھی ہے خرابہ بھی
اب اس کو خلد سمجھیے کہ جانیے صحرا

ہوس کے واسطے سو در کُھلے ہیں شہروں میں
اگر جنونِ وفا ہے تو چھانیے صحرا

ستم تو یہ ہے کہ اب خانہ زادگانِ چمن
ہمیں بتانے لگے ہیں معانیِ صحرا

ہمیں ملی نہ کہیں خیمہ زن نگارِ بہار
لئے پھری ہے عبث بیکرانیِ صحرا

فرآز و قیس ہیں دونوں ہی کشتگانِ وفا
یہ جانِ شہرِ ملامت وہ جانیِ صحرا

○
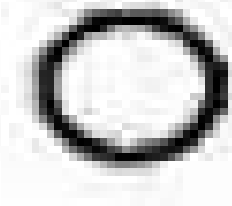
میں خوش ہوں راندۂ افلاک ہو کر
مرا قد بڑھ گیا ہے خاک ہو کر

مرا دل دُکھ گیا، لیکن وہ آنکھیں
بہت اچھی لگیں نمناک ہو کر

تکلف بر طرف اے جانِ خوباں
کبھی ہم سے بھی مل بیباک ہو کر

اٹھا لے جا یہ اپنا دام و دانہ
مجھے مت صید کر چالاک ہو کر

سجی ہے کس قدر اے سرو قامت
ردائے گل تری پوشاک ہو کر

اگر اتنی پرانی دوستی تھی
تو پھر کر وار بھی سفاک ہو کر

فرازؔ احساں ہے یاروں کا کہ یہ دل
گریباں بن گیا ہے چاک ہو کر

○

تجھے ہے مشقِ ستم کا ملال ویسے ہی
ہماری جان تھی جاں پر وبال ویسے ہی

چلا تھا ذکر زمانے کی بے وفائی کا
سو آ گیا ہے تمہارا خیال ویسے ہی

ہم آ گئے ہیں تہہِ دام تو نصیب اپنا
وگرنہ اُس نے تو پھینکا تھا جال ویسے ہی

میں روکنا ہی نہیں چاہتا تھا وار اُس کا
گری نہیں مرے ہاتھوں سے ڈھال ویسے ہی

زمانہ ہم سے بھلا دشمنی تو کیا رکھتا
سو کر گیا ہے ہمیں پائمال ویسے ہی

مجھے بھی شوق نہ تھا داستاں سنانے کا
فرازؔ اُس نے بھی پوچھا تھا حال ویسے بھی

○
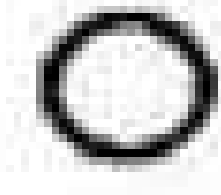
کسی کو بھی محبت میں مِلا کیا
تو پھر اُس دشمنِ جان سے گلہ کیا

نہ عشق آساں نہ ترکِ عشق آساں
سو ہم سے بزدلوں کا حوصلہ کیا

کوئی بستی یہاں بسنے نہ پائے
یہ دل ہے خوابگاہِ زلزلہ کیا

وصال و ہجر بس کیفیتیں ہیں
وگرنہ قرب کیسا فاصلہ کیا

فرازؔ اب بھی وہی دیوانگی ہے
تو قائم ہے پرانا سلسلہ کیا

○
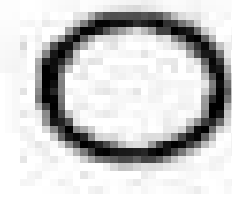
احساں کیے تھے اُس نے جور و عتاب کر کے
ہم کس قدر ہیں نادم اُس سے حساب کر کے

اُس سے کِیا تقاضا ہم نے عبث وفا کا
اچھی بھلی محبت رکھ دی عذاب کر کے

کس درجہ بدمزہ تھا واعظ کا وعظ یوں تو
کچھ چاشنی سی آئی ذکرِ شراب کر کے

رندوں نے صدقِ دل سے زاہد کو بھی پلا دی
اب سخت ہیں پشیماں کارِ ثواب کر کے

یوں دلکش و مرصّع جیسے کوئی صحیفہ
ہم کو تو اُس کا چہرہ پڑھنا کتاب کر کے

احوال اہلِ غم کا سننا نہ تھا کہ تُو نے
ہم کو ڈبو دیا ہے آنکھیں پُر آب کر کے

غالبؔ کی پیروی میں یہ دن تو دیکھنے تھے
ہم بھی ہوئے ہیں رسوا شعر انتخاب کر کے

احمد فرازؔ ہو یا وہ میرؔ و میرزاؔ ہوں
اے عشق تو نے چھوڑا سب کو خراب کر کے

○
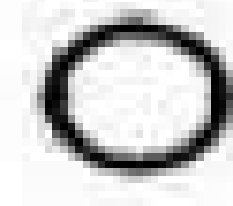
خواب ہی خواب ہر اک شام میں لے آتی ہیں
اپسرائیں جو ہمیں دام میں لے آتی ہیں

پہلے پہلے تو کریں عہدِ وفا کی باتیں
پھر کسی کوچۂ بدنام میں لے آتی ہیں

یہ جو آ جاتی ہیں افسانہ سنانے والی
اور قصے بھی ترے نام میں لے آتی ہیں

تیری آنکھیں کہ بُھلا دیتی ہیں ساری دنیا
آخرش گردشِ ایّام میں لے آتی ہیں

چاہتیں کتنی بھی آغاز میں پیاری ہوں فرازؔ
پھر وہی تلخیاں انجام میں لے آتی ہیں

○
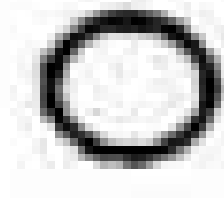
وادیِ عشق سے کوئی نہیں آیا جا کر
آؤ آوازہ لگائیں سرِ صحرا جا کر

بزمِ جاناں میں تو سب اہلِ طلب جاتے ہیں
کبھی مقتل میں بھی دِکھلائیں تماشا جا کر

کن زمینوں پہ مری خاک لہو روئے گی
کس سمندر میں گریں گے مرے دریا جا کر

ایک موہوم سی اُمید ہے تجھ سے ورنہ
آج تک آیا نہیں کوئی مسیحا جا کر

دیکھ یہ حوصلہ میرا مرے بُزدل دشمن
تجھ کو لشکر میں پکارا تنِ تنہا جا کر

اُس شہِ حُسن کے در پر ہے فقیروں کا ہجوم
یار ہم بھی نہ کریں عرضِ تمنا جا کر

ہم تجھے منع تو کرتے نہیں جانے سے فرازؔ
جا اُسی در پہ مگر ہاتھ نہ پھیلا جا کر

○
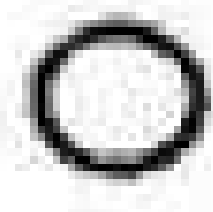
گماں یہی ہے کہ دل خود اُدھر کو جاتا ہے
سو شک کا فائدہ اُس کی نظر کو جاتا ہے

حدیں وفا کی بھی آخر ہوس سے ملتی ہیں
یہ راستہ بھی اِدھر سے اُدھر کو جاتا ہے

یہ دل کا درد تو عمروں کا روگ ہے پیارے
سو جائے بھی تو پہر دو پہر کو جاتا ہے

یہ حال ہے کہ کئی راستے ہیں پیشِ نظر
مگر خیال تری رہگذر کو جاتا ہے

تو انوریؔ ہے نہ غالبؔ تو پھر یہ کیوں ہے فرازؔ
ہر ایک سیلِ بلا تیرے گھر کو جاتا ہے

○

جو بھی پیرایۂ اظہار نظر آتا ہے
سامنے تُو ہو تو بیکار نظر آتا ہے

کس قدر خوگرِ آزار ہیں ہم بھی کہ ہمیں
جو ستمگر ہو وہ غم خوار نظر آتا ہے

دیکھ بے مہریِ دنیا کا یہ عالم ہے ہے
تُو بھی بے یار و مددگار نظر آتا ہے

شاید آ جائے کوئی میرؔ سا آرام طلب
ابھی کچھ سایۂ دیوار نظر آتا ہے

کیا کہیں جب سے مسیحا کوئی آیا ہے ادھر
شہر کا شہر ہی بیمار نظر آتا ہے

اب بھی ناپید نہیں مسلکِ منصور فرازؔ
کوئی کوئی تو سرِ دار نظر آتا ہے

○
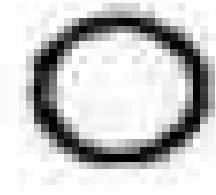
ضبطِ گریہ سے تو کچھ اور بھی بیکل ہوئے ہم
پھر جو تنہائی میں روئے ہیں تو جل تھل ہوئے ہم

یہی تہذیبِ دل و جاں ہے، محبت کیا ہے
تم نے دیوانہ کہا ہم کو تو پاگل ہوئے ہم

زندگی تھی ترا پیمانِ محبت تو نہ تھا
پھر تو یوں ٹوٹ کے بکھرے ہیں کہ پَل پَل ہوئے ہم

یار اغیار سبھی اہلِ تماشا نکلے
کتنے تنہا تھے کہ جب داخلِ مقتل ہوئے ہم

یہ کہانی کسی اک موڑ پہ رُک جاتی تھی
تُو ہُوا شاملِ قصہ تو مکمل ہوئے ہم

دم بھی لینے نہ دیا ضربتِ دنیا نے فرازؔ
پھر جو مسمار ہوئے ہیں تو مسلسل ہوئے ہم

○
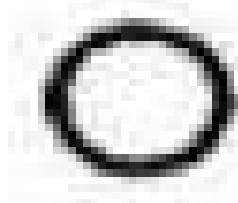
کہاں سے لائیں مئے ناب بیچنے والا
تمام شہر ہے زہراب بیچنے والا

یہ ہم کہ جان ہتھیلی پہ رکھ کے پھرتے ہیں
کوئی ہے بس ادب آداب بیچنے والا

عجب نہیں کہ اگر سرد مہر ہے گاہک
یہ دیکھ کر کہ ہے بیتاب بیچنے والا

سنا ہے آج وہ تیر و کماں کا تاجر ہے
جو کل تھا بربط و مضراب بیچنے والا

پھرے ہے راتوں کو سرگشتہ و چراغ بکف
وہی فرازؔ وہی خواب بیچنے والا

○
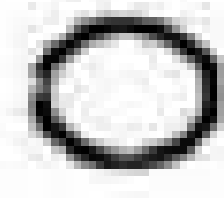
کوئی ہزار اکیلا ہو پر نہیں تنہا
سو کیوں کہیں کہ ترے ساتھ تھے ہمیں تنہا

یہ زندگی ہے شب و روز کٹ ہی جاتے ہیں
کبھی کبھی کوئی محفل کہیں کہیں تنہا

ہر اک نے اپنی ہی دنیا بسائی ہوتی ہے
سو خلوتوں میں بھی رہتا کوئی نہیں تنہا

دل و جگر کا بھی احوال پوچھ لینا تھا
تری نگاہ میں ہیں جیب و آستیں تنہا

کدھر گیا ترے کوچے سے پھر خدا جانے
فراز گھوم رہا تھا یہیں کہیں تنہا

○
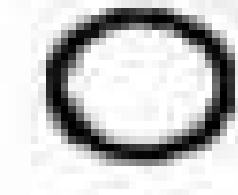
اب تو اتنا بھی ہو نہیں پائے
رونا چاہا تو رو نہیں پائے

ہم سے تعبیرِ خواب پوچھتے ہو
زندگی بھر جو سو نہیں پائے

مدتوں غم کی پرورش کی ہے
یہ صلے آج تو نہیں پائے

جستجو رائیگاں نہیں تھی مگر
جن کو چاہا تھا وہ نہیں پائے

کیوں گلہ ہم سے ہو کسی کو فرازؔ
ہم تو اپنے بھی ہو نہیں پائے

○
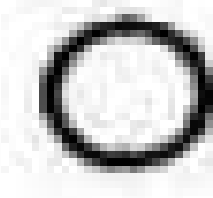
جو سادہ دل ہوں بڑی مشکلوں میں ہوتے ہیں
کہ دوستوں میں کبھی دشمنوں میں ہوتے ہیں

ہَوا کے رُخ پہ کبھی بادباں نہیں رکھتے
بلا کے حوصلے دریا دِلوں میں ہوتے ہیں

پلٹ کے دیکھ ذرا اپنے رہ نوردوں کو
جو منزلوں پہ نہ ہوں راستوں میں ہوتے ہیں

پیمبروں کا نسب شاعروں سے ملتا ہے
فرازؔ ہم بھی انہیں سِلسِلوں میں ہوتے ہیں

○
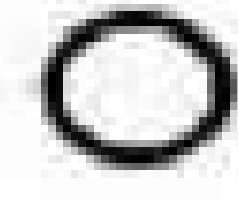
سامنے اُس کے کبھی اُس کی ستائش نہیں کی
دل نے چاہا بھی اگر ہونٹوں نے جنبش نہیں کی

اہلِ محفل پہ کب احوال کُھلا ہے اپنا
میں بھی خاموش رہا اُس نے بھی پُرسش نہیں کی

جس قدر اُس سے تعلق تھا چلے جاتا ہے
اس کا کیا رنج ہو جس کی کبھی خواہش نہیں کی

یہ بھی کیا کم ہے کہ دونوں کا بھرم قائم ہے
اُس نے بخشش نہیں کی ہم نے گزارش نہیں کی

اک تو ہم کو ادب آداب نے پیاسا رکھا
اس پہ محفل میں صراحی نے بھی گردش نہیں کی

ہم کہ دکھ اوڑھ کے خلوت میں پڑے رہتے ہیں
ہم نے بازار میں زخموں کی نمائش نہیں کی

اے میرے ابرِ کرم دیکھ یہ ویرانۂ جاں
کیا کسی دشت پہ تُو نے کبھی بارش نہیں کی

کٹ مرے اپنے قبیلے کی حفاظت کے لئے
مقتلِ شہر میں ٹھہرے رہے جُنبش نہیں کی

وہ ہمیں بھول گیا ہو تو عجب کیا ہے فرازؔ
ہم نے بھی میل ملاقات کی کوشش نہیں کی

○
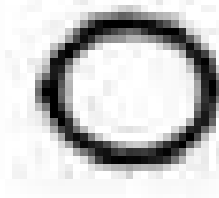
جن کو دوست سمجھتے تھے وہ دوست نما کہلاتے تھے
ہم میں کچھ اہلِ دل بھی اہلِ دنیا کہلاتے تھے

لوگو ایک زمانہ تھا جب ہم کیا کیا کہلاتے تھے
دردِ آشوب سے پہلے ہم تنہا تنہا کہلاتے تھے

جتنے بھی محبوب تھے ان کو عہد شکن یاروں نے کہا
جتنے بھی عشاق تھے سارے اہلِ وفا کہلاتے تھے

ہم تو دیارِ جاناں کو کہتے ہیں دیارِ جاناں بس
پہلے دلداروں کے قریے شہرِ سبا کہلاتے تھے

تیرے لئے اب کیوں نہ کوئی تازہ تشبیہ تلاش کریں
چاند فسانہ تھا تو دلبر ماہ لقا کہلاتے تھے

تیرے خرام کو نسبت دیتے کبکِ دری کی چال سے لوگ
گل جب چاک گریباں ہوتے تیری قبا کہلاتے تھے

آؤ خاک سے رشتہ جوڑیں، وہم فلک افلاک ہوئے
ہاتھ قلم ہونے سے پہلے دستِ دعا کہلاتے تھے

اپنی ویراں آنکھوں کا اب کس سے حال احوال کہیں
اب جو صحرا دیکھتے ہو آگے دریا کہلاتے تھے

جو نایافت تھی اُس خوشبو کی کھوج میں ہم صحرا صحرا
لہو لہان پھرا کرتے تھے آبلہ پا کہلاتے تھے

دل پاگل تھا یونہی پکارے جاتا تھا جاناں جاناں
پر جو بیت بھی ہم کہتے تھے ہوشربا کہلاتے تھے

بے آواز گلی کوچوں میں عشق دہائی دیتا تھا
بستی بستی اہلِ نوا زنجیر بپا کہلاتے تھے

گلیوں گلیوں لیے پھرے نابینا شہر میں آئینہ
شاعر تھے پر شعر اپنے حرفِ عیسا کہلاتے تھے

پس انداز سبھی موسم تھے اہلِ چمن کے توشے میں
عہدِ خزاں کے جھونکے بھی جب بادِ صبا کہلاتے تھے

اب بھی خوابِ گل ہے پریشاں اب بھی اسیر عنادل ہیں
کل بھی باغ میں گلچیں اور صیاد خدا کہلاتے تھے

غزل بہانہ کرتے کرتے لفظ ہی بے توقیر ہوئے
سازِ سخن کو بھول چکے جو نغمہ سرا کہلاتے تھے

جب سے فرازؔ تخلص رکھا ملکوں ملکوں رسوا ہیں
ورنہ ہم بھی اوّل اوّل احمد شا کہلاتے تھے

○
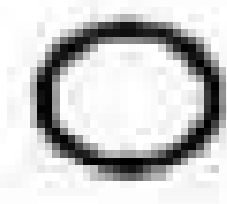
چشمِ گریاں میں وہ سیلاب تھے اے یار کہ بس
گرچہ کہتے رہے مجھ سے مرے غم خوار کہ بس

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
ایک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اِس بار کہ بس

اب وہ پہلے سے بلا نوش و سیہ مست کہاں
اب تو ساقی سے یہ کہتے ہیں قدح خوار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فرازؔ
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

○
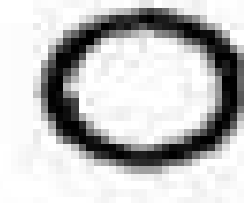
فرازؔ تم نے عبث شوق سے سجائے سخن
کہاں وہ قامتِ جاناں کہاں قبائے سخن

بیان اُس گلِ رعنا کا بے قیاس نہ کر
کہ عندلیب کا دل چاہیے برائے سخن

کہ ذکرِ یار تو جان و جگر کا سودا ہے
کہ خونِ دل تو نہیں ہے فقط بہائے سخن

اُسی کے دھیان سے روشن ہیں دل میں قندیلیں
اُسی کی یاد سے منسوب ہر شعاعِ سخن

اُسی کے دم سے ہیں سرسبز زخم عمروں کے
اُسی کے دم سے صبا آشنا، فضائے سخن

اُسی کے ہجر میں لکھے ہیں مرثیے دل کے
اُسی کے وصل میں دیکھے ہیں عشوہ ہائے سخن

اُسی کے قرب سے گویا سکوتِ لالہ و گل
اُسی کے لطف سے لب بستگی، بجائے سخن

تم اپنے عجز کو سمجھے ہوئے ہو اوجِ ہنر
سو اِس تضاد پہ غالبؔ کا یاد آئے سخن

"نہ شعلے میں وہ کرشمہ نہ برق میں وہ ادا"
تو کیا بیان سراپا ہو کیا بنائے سخن

"ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم"
نظر تو چیز ہی کیا ہے نہ تاب لائے سخن

وہ یاد آئے تو الہام بن کے شعر اترے
وہ بھول جائے تو پھر کس کو یاد آئے سخن

کبھی کبھی ہی دل و جاں سے آنچ اُٹھتی ہے
فرازؔ ہم نہیں کہتے سخن برائے سخن